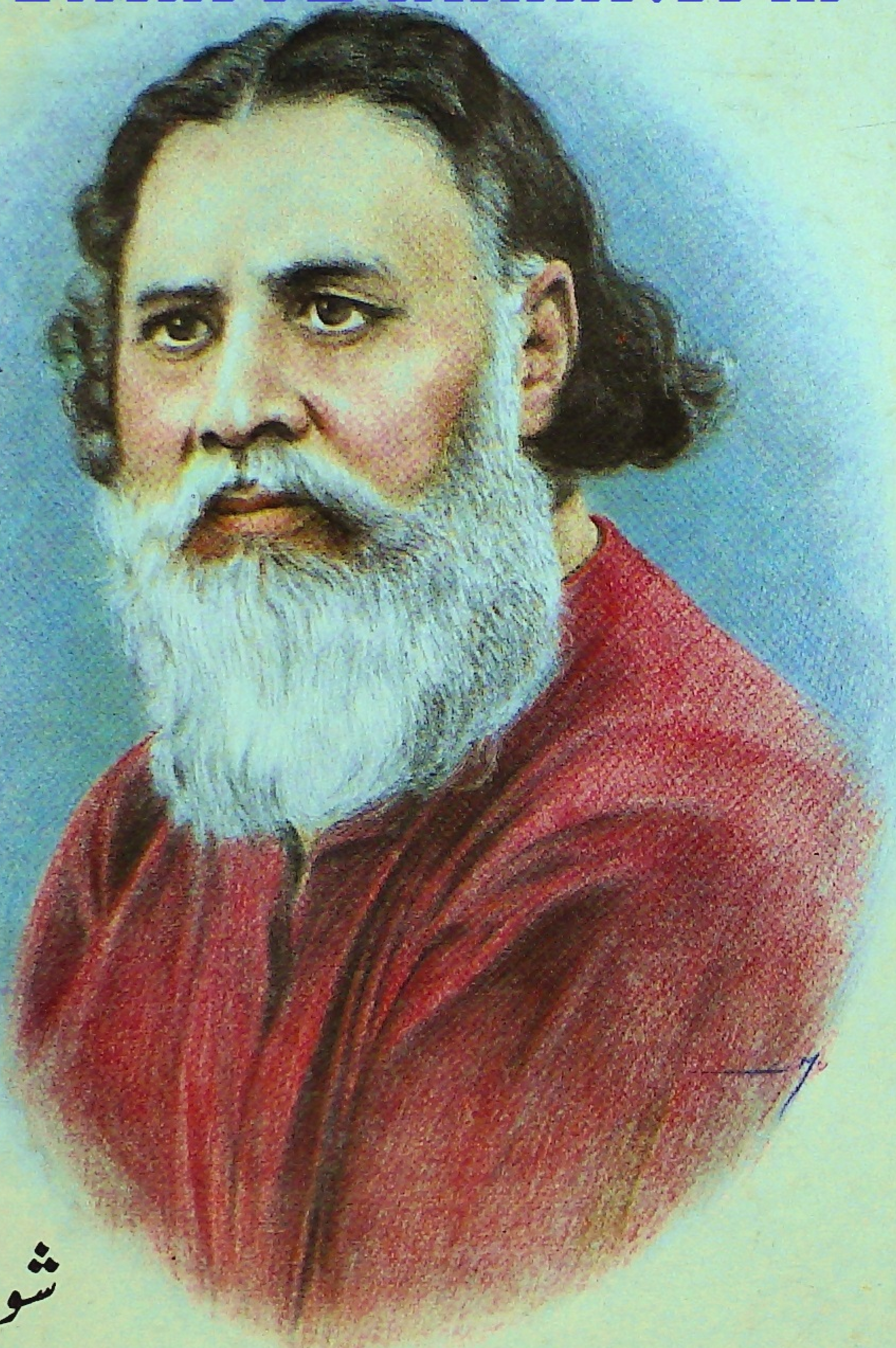
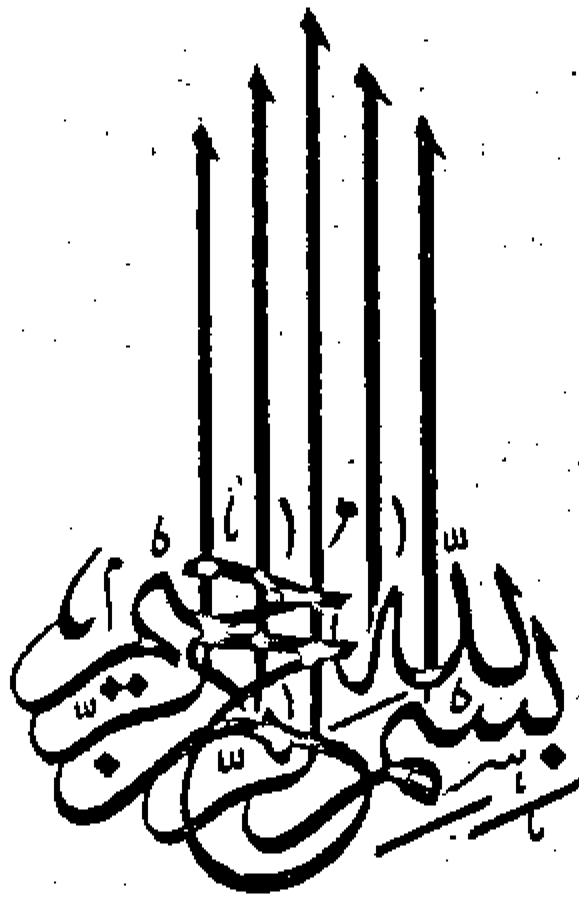
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سوانح و افکار



شورش کاشمیری



سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رح

سوانح وافکار

شورش کاشمیری

مطبوعاتِ چٹان
۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور

واحد تقسیم کنندگان:
الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

297.55 Shorash Kashmiri
Sayed Ata-Ullah Shah Bukhari/ Shorash Kashmiri.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2012.
p.

1. Hajj-o-Umrah I. Title.

ISBN 969-503-564-7

جولائی 2012ء

کتاب	:	سیّدعطاءاللہ شاہ بخاریؒ
مصنف	:	شورش کاشمیری
مطبع	:	آر۔آر پرنٹرز، لاہور
ناشر	:	مطبوعات چٹان، لاہور
اشاعت	:	ہفتم
قیمت	:	-/300روپے

واحد تقسیم کنندگان:

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore, Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

انتساب

۱۳۔ اپریل ۱۹۵۶ء جمعتہ المبارک' پہلا روزہ اور سحری کا وقت تھا۔ میں نے سحری کھا کے اس کتاب کا آغاز کیا۔ پہلا فقرہ ہی لکھ پایا تھا کہ بیوی نے مجھ سے کہا: پھوپھا (میرے والد) کی طبیعت خراب ہوگئی ہے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ میں دوڑ کر اُن کے کمرے میں گیا تو اُنھیں مضطرب الحال پایا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر گنگارام ہسپتال میں داخل کرا دیئے گئے۔

افسوس' اُن کا پیمانہ عُمر لبریز ہو چکا تھا' ٹھیک افطار کے وقت اُنھوں نے باسٹھ برس کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ہمیشہ کے لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

o موت سے کسی کو رُستگاری نہ' ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ لیکن بعض سانحے ایسے ہوتے ہیں جن کا صدمہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ باپ کی موت نے دل و دماغ کی بہت سی خوشیوں کو آزُردہ کر دیا۔ اِسی آزُردگی میں یہ کتاب مکمل ہوئی ہے۔ اس میں کسی پہلو سے کوئی خوبی ہو تو قارئین سے التماس ہے کہ وہ میرے والدِ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

اس آرزو کے ساتھ اِن اوراقِ پریشان کو میں والدِ مرحوم میاں نظام الدین احمد (علیہ الرحمتہ) سے منسوب کرتا ہوں۔

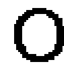
اب اُن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

شورش کاشمیری



یہاں اُمرا، دوزخ کے کُتّے اور سیاست دان کھٹّی تے
ہیں۔اُن کے ساتھ نٹ اور اُن کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں۔
اُن کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر برائی کی زبان میں
جُھوٹ بول لیتے ہیں۔

زرتُشت ....



فہرست



حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

○ مَیں نے قبر سے زیادہ واعظ، کتاب سے زیادہ مُخلص دوست اور تنہائی سے زیادہ بے ضرر ساتھی کوئی نہیں دیکھا.........

عبداللہ بن عبدالعزیز

شروع کی بات

اس کتاب کے لکھنے کا خیال فسادات پنجاب کی انکوائری کمیٹی کے مختلف اجلاسوں (ازکیم جولائی ۱۹۵۳ء تا فروری ۱۹۵۴ء) کی کارروائی سے پیدا ہوا جب رپورٹ چھپی تو یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔

اولاً: ان لوگوں کا طرز عمل جو بزعم خود علما کے استخفاف پر قہقہے اُڑا رہے تھے۔

ثانیاً: پولیس افسروں کی یادداشتوں کا وہ حصہ جس میں شاہ جی کی ذات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔

میں نے ''چٹان'' میں علما کی اہانت کے خلاف اسی وقت احتجاج کیا تھا۔ باوجودے کہ میں نے اپنی سیاسی زندگی کے بہت سے لیل ونہار داعیان شریعت کی ہم راہی میں بسر کیے ہیں لیکن نہ تو میرا نقطۂ نگاہ ان سے موافق رہا نہ میں نے حیاتِ مستعار کے پیراہن میں منبر ومحراب کا کوئی پیوند قبول کیا اور نہ شرعی ''برہمنوں'' کو مافوق البشر سمجھا...... مجھے شکایت یہ تھی کہ بغیر امتیاز علما کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کی غایت اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو ظاہراً بیان کی جاتی ہے۔ کس گروہ میں کالی بھیڑیں نہیں؟ کیا ارباب سیاست کی جماعت اس سے خالی ہے؟ لیکن گالی دینے کے لیے ہمیشہ علما ہی کو نشانے پر رکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سیاسی سازش کے تحت بعض مقدس الفاظ بھی ذلیل کیے گئے ہیں۔ مثلاً یارِ غار، خلیفہ، مُلا، زید، بکر، عمر۔

اس سازش سے جس بدگوئی کا سُراغ ملتا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کا استعمال روزمرّہ ہو گیا ہے۔

مُلاّ کے خلاف طعن و تشنیع کی گرم بازاری بے شبہ سیاسی وجوہ سے ہے۔ بعض شب کور نقادوں نے اپنی نفسی کوتاہیوں کا جواز پیدا کرنے کے لیے نہ صرف ملا کو ہدف تنقید بنایا بلکہ اس کی آڑ میں اُن صلحائے اُمت کو بھی رگیدا، جن کا تنہا قصور یہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور اس کی بیورو کریسی کے خلاف لڑتے رہے، جن علما نے تکفیرالمسلمین میں ظالمانہ حصہ لیا ان کے خلاف سیاست دانوں میں کبھی مزاحمت یا مدافعت کی کوئی آواز نہیں اٹھی مگر جن علما نے قربانی و ایثار کی زندگی بسر کی یا یورپی دانش وروں کی اس کھیپ کو اس کے اعمال و افعال پر ٹوکا ان کے خلاف سب وشتم کے بازار میں ہمیشہ ہی رونق رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے عام انتخاب میں یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

شاہ جی کے خلاف سرکاری یادداشتوں کی حیثیت محض تعفّن کا ڈھیر ہے۔ اس کی سڑاند کا تقاضا تھا کہ اصل حقیقت بے نقاب ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ اہلِ قلم جنھوں نے شاہ جی کی رفاقت میں عمر کا بڑا حصہ بسر کیا اس فرض سے عہدہ برآ ہوں گے لیکن چاروں طرف طویل سناٹا چھایا رہا۔ جن لوگوں نے میری اس کتاب کے عرصہ بعد شاہ جی کے سوانح پر قلم اٹھایا انھیں نزدیکانِ بے بصر کہنا انسب ہوگا۔

میں اپنے سوانح اسیری بہ عنوان ''پسِ دیوار زنداں'' لکھنے میں مشغول تھا۔ بعض دوستوں نے مجبور کیا کہ جوابی تصریحات لکھوں، لیکن اولاً رپورٹ کا محاسبہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ثانیاً تحریک کے پس منظر میں جو گل کھلے تھے ان کے پیشِ نظر کچھ عرصہ توقف و انتظار زیادہ مناسب تھا۔ بہرحال میں نے شاہ جی کی سوانح عمری لکھنے کا قصد کیا۔ اب جو حالات فراہم کرنا شروع کیے تو سب سے بڑی روک خود شاہ جی تھے یا بعض ایسے دوست جن سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا لیکن وہ تعاون کے لیے آمادہ نہ تھے۔ اسی اثنا میں بعض ناشدنی باتیں مجھ تک پہنچیں۔ میں

نے ارادہ توڑ ڈالا اور قلم کی ادارتی صحبتوں میں واپس چلا گیا۔

ایکا ایکی یہ تمام تقاضے پھر سامنے آ گئے اور دوستوں کی رضا کے آگے جھکنا پڑا۔ میں اس ساری کتاب کو محض ''نفسیاتی مطالعہ'' تک محدود رکھنا چاہتا تھا مگر جس شخصیت کے یہ سوانح ہیں اس کا گردوپیش اسے قبول نہ کرتا بہرکیف جس طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فی الجملہ یہ کوئی مکمل سوانح عمری نہیں، کچھ خاکے اور کچھ عکس ہیں۔ مگر مکمل، جامع اور مبسوط۔ بحمداللہ اب کوئی خلا نہیں رہا، حتی الامکان سب خلا پورے ہو گئے ہیں، شاہ جی کی دُختر فرخندہ اختر نے اپنے ایک نامہ گرامی سے خاندانی حالات کی تصحیح فرما دی۔ ان کا خط میری اہلیہ کے نام تھا، اب یہ محض خاکے یا عکس نہیں رہے، سوانح عمری ہے۔ میں چاہتا تھا شاہ جی کم از کم خاندانی حالات کے حصہ ہی کو سن کر تصحیح فرما دیتے لیکن اُنھوں نے گوارا نہ کیا اور میں نے بھی اصرار مناسب نہ سمجھا، وہ فقر و استغنا کے انسان تھے، قرطاس و قلم سے اُنھیں چڑ تھی۔

کوئی سی کوتاہی رہ گئی ہو تو مجھے اس کی تصحیح و اصلاح میں خوشی ہو گی میں نے جو کچھ لکھا لِلّٰہی جذبے سے لکھا اور کوشش کی ہے کہ تحریر کا دامن کسی آلودگی سے داغ دار نہ ہو۔ میں نے الفاظ کے چناؤ میں پورے غور و فکر سے کام لیا اور بار بار قطع و برید کی ہے اس پر بھی اگر کوئی لفظ قلم سے ایسا نکل گیا ہو جو نفس مضمون کی ثقاہت کے خلاف ہو تو مجھے اہلِ ذوق سے عفوخواہی میں تامل نہ ہو گا۔ البتہ سی آئی ڈی کی یادداشتوں کے بارے میں دو چار فقرے عام اسلوب سے ذرا مختلف نظر آئیں تو یہ ان یادداشتوں کا ردِعمل ہے جن کی تلخی اور سختی زہرناک تھی۔ نطشے کہتا ہے۔

''میں اُن بھیانک چہروں سے خوف کھاتا ہوں جو صبح کے اُجالوں پر اپنی کھوکھلی ہنسی پھینکتے ہیں''۔

ناشکر گزاری ہو گی اگر میں محبِ گرامی مولانا تاج محمود لائل پوری کے ان مخلصانہ تقاضوں کا اعتراف نہ کروں جن کی شدت کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے محاسن اُنھی کی مساعی مشکور کا ثمرہ ہیں اور جو قبائح آپ دیکھ رہے ہیں وہ تمام تر میرے قلم کی

درماندگیاں ہیں۔ بہرحال وہ تمام دوست میرے سپاس و تشکر کے حق دار ہیں جو قلم کے اس سفر میں اپنے مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔

ہمیں عشق است برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ

کسے از معنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

شورش کاشمیری

لاہور

۱۱۔ ستمبر ۱۹۵۶ء

ایک کہانی..........ایک تاریخ

شاہ جی ان لوگوں میں سے ہیں؛ جن کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے اور جو اپنی متنوع زندگی کے باعث مجموعہ اضداد ہوتے ہیں ان شخصیتوں کا صحیح تاثر ان کے قریب ہی سے مرتب ہوتا ہے۔

شاہ جی کے چہرے مُہرے سے عنانِ خیال معاً ان یونانی فلسفیوں کی طرف مڑ جاتی جن کے فکر و نظر کی بہت سی راہیں صدیوں کی شب کاری کے باوجود روشن چلی آتی ہیں اور جن کے تصویری پیراہن؛ ان شہ دماغوں کی یاد دلاتے ہیں جن کی صورتوں سے ایک ساحرانہ شکوہ کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ جی کا نک سک[1] قرون وسطیٰ کے ان حکما و فقہا اور علما و خطبا سے مشابہ تھا جو طلوع تاریخ سے پہلے یونان و روما میں اور طلوع تاریخ کے بعد بغداد و دہلی میں پائے جاتے تھے۔

اتفاق کہیے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں یک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں؛ مثلاً فیثاغورث؛ کارل مارکس؛ رابندرناتھ ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظر؛ عقیدہ و ایمان اور علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہ تھی لیکن کچھ ایسا بانکپن ضرور تھا کہ ان کا چہرہ مہرہ ہر صفاتی بُعد کے باوجود ایک سا تھا۔

---

[1] نکھ سکھ

بہر حال یہ ایک شاعرانہ چیز ہے ان بڑوں کی زندگی ایک خاص طرز رکھتی ہے جس سانچے میں بھی ڈھلیں ہمیشہ اُبھرے ہوئے ملیں گے یہ کسی کے نقشِ پا نہیں ڈھونڈتے بلکہ لوگ ان کے نقشِ پا کی تلاش میں رہتے ہیں۔

شاہ جی کی زندگی جس نہج پر استوار ہوئی اس میں ادب و سیاست کا ایک رومانی امتزاج تھا' ظاہر ہے کہ ایک رومانی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے اس میں سرے سے ادق عبارتیں ہوتی ہی نہیں' ایسا شخص جذبات پر جیتا اور جذبات پر مرتا ہے۔ اس میں احساس کی شدت اور استغنا کی شرافت تاحد کمال ہوتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں کون کیا سوچتا ہے اس کی ذات ہی اس کا پیمانہ ہے وہ گردوپیش سے متاثر ہوتا اور چاہتا ہے کہ گردو پیش اس سے متاثر ہوں اس کی روح اس وقت معراج پر ہوتی ہے جب وہ عام چہروں میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

۱۹۴۷ء کا ذکر ہے غالباً مارچ کا مہینا تھا۔ پنجاب میں عام فسادات پھوٹ چکے تھے شاہ جی اس سے تو خوش تھے کہ انگریزوں کا چل چلاؤ ہے لیکن اس کا انھیں بہت ہی دکھ تھا کہ ملک بھر میں خون خرابا بے قابو ہو گیا ہے۔

ہمارے اصرار پر وہ اُمرت سَر سے لاہور چلے آئے اور دفتر احرار میں مقیم تھے۔ دن بھر محفلیں جمتیں۔ رات گئے تک دربار لگا رہتا۔ عام عقیدت مند جمع ہوتے اور ان کے انوارِ سخن سے جھولیاں بھرتے لیکن ان دنوں ان کے چہرے پر ہنسی کے آثار بہت تھوڑے تھے۔

اس سے پہلے وزارتی مشن کے زمانے میں ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے۔

وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار دور تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں۔ اگر آپ اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو

یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں۔ وہ طرح دے گئے ان کے نزدیک اس کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ تحریر کو ایک فتنہ سمجھتے اور اپنے اس عقیدے کو ہمیشہ دُہراتے کہ جب سے حافظہ کی جگہ تحریر نے لی ہے انسان کو نہ صرف عقلی اعتبار سے ضعف پہنچا ہے بلکہ ہر کہیں عجیب الخلقت تنازعوں کی آب و ہوا پھیل گئی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح اس دور کو ترقی کا دور نہیں کہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ خسران کا دور تھا اور تحریر اس خسران کی پیچ دار بنیادوں میں سے ایک

''بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے؟.......... مولانا ابوالکلام آزاد نے ''تذکرہ'' میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامیٔ حیات دو روزے نہ بود بیش
آں ہم کلیم با تو چگویم چساں گزشت
یک روز صرف بستن دل شد بایں وآں
روزے دگر بکندن دل زیں و آں گزشت

تفصیل طلب کی تو مسکرا دیئے' آغا فہمیدیم اور بس.......... لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف تھا۔ مولاناؒ اپنے سے باہر جھانکتے نہیں تھے اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی' مولانا کے لیے تخلیہ صحبت عیش تھا شاہ جی کے لیے جان کنی' مولاناؒ کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہ کر پاتے تھے' شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی تھی۔

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یہاں لاہور میں ان کی آزردگی بڑھتی ہی گئی' ہر روز ایک نیا سانحہ! پہلے انھیں ہندوستان کی بربادی کا غم تھا۔ اب وہ مسلمانوں کے لیے بے چین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ وہ کلکتۂ نوا کھالی

اور بہار کے حالات سے پہلے ہی مغموم تھے۔اب جن حالات میں خضر وزارت کا استعفیٰ ہوا تھا اور اس استعفیٰ سے پہلے مسلم لیگ نے جو مظاہرے اور مجاہرے کیے تھے شاہ جی کی طبیعت پر ان کا ایک منفی اثر تھا۔فسادات جنگل کی آگ تھے اور وہ انسانی خون کا تماشا دیکھ ہی نہ سکتے تھے' فرماتے :

''بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب کا رُکنا محال ہے''۔

خضر وزارت کے خلاف بلاناغہ احتجاجی جلوس نکل رہے تھے۔ان جلوسوں میں زبان طیش کی ساری خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔شاہ جی مغرب کے وقت دفتر کے چھجے میں آ کھڑے ہوتے' ان مظاہروں کا نظارہ کرتے اور جب بے قابو نوجوانوں کی آوازیں شفق میں گھلنے لگتیں تو سرد آہ بھرتے اور کہتے :۔

شورش!...... مجھے نظر آ رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ دُور دُور تک آگ لگی ہوئی ہے' مکان جل رہے' دُکانیں لُوٹی جارہی اور قزاق عصمتیں اُڑائے سرپٹ دَوڑ رہے ہیں' ماں بیٹے کو چھوڑ چکی' باپ بیٹی کو ہار چکا ہے' چاروں طرف قیامت کا صور پھک گیا ہے''۔

پھر ایکا ایکی ملنگوں کے انداز میں نعرہ گونجانے لگتے۔

''کردے چٹیل میدان مولا کردے چٹیل میدان ....لعنت بر پدرِ فرنگ''۔

اور لفظ فرنگ پر خاص زور دیتے۔تبرا کی یہ آواز کبھی کبھار شاہ محمد غوث کی مسجد سے اٹھتی ہوئی اذان سے جا ٹکراتی۔نیاز مند شاہ جی کے اس قلندرانہ نعرے پر مسکراتے اور شاہ جی جھنجھلا کر فرماتے۔

''میاں آج ہنستے ہو کل روؤ گے' تم نہیں دیکھ سکتے' میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ایک وبا پھوٹ چکی' ایک وبا آ رہی ہے تب ان کی زبان پر قرآن مجید کی آیتیں جاری ہو جاتیں۔ان کی قرأت میں گداز پیدا ہو جاتا' ان کے لحن میں آنسو آ جاتے اور ہم تھے کہ ان کا منہ تکا کرتے۔ہمارا وجدان شہادت دیتا کہ فقیر غلط نہیں کہہ رہا لیکن عقل سپر انداز ہونے سے انکار کرتی' ہم کہتے :۔

''شاہ جی! حالات ابھی اتنے خراب نہیں انگریزوں کا مفاد..... ؟'' اور وہ فقرہ ہی توڑ لیتے۔

''ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہو جائیں' لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی؟...... یہ اس کی پہلی قسط ہے''۔

شاہ جی! سیاست؟

''ہاں میں جانتا ہوں' سیاست کے معنی ہیں مکر' کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ میں نے لفظ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع وفریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بابو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں''۔

اور میں جی ہی جی میں سوچ کر چپ ہو رہتا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

بظاہر یہ باتیں بے وزن تھیں۔ جس شخص کی نصف زندگی خود سیاست میں گزری ہو جس نے ''قبرستانوں'' میں ''اذانیں'' دی ہوں۔ اس کا سیاست کے بارے میں یہ ذہن ایک لطیفہ تھا۔ یہ ذہن اُنھوں نے تحریک خلافت کے بیٹھ جانے پر زعمائی کرتوت سے متاثر ہو کر قائم کیا تھا اور اس پر سختی سے قائم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد تو وہ سیاست ہی کو منکرات میں سے سمجھتے تھے گو تحریکِ خلافت کے بعد بھی اُنھوں نے سیاست میں وافر حصہ لیا لیکن اپنی مرضی سے کم دوسروں کی مرضی سے زیادہ۔ ان کا ایک خاص معیار تھا جس سے حالات کے بجائے افراد کا جائزہ لیتے۔ انھیں اس سے غرض نہ تھی کہ حالات کیا کہتے ہیں ان کے لیے بس یہ کافی تھا کہ احباب کیا کہتے ہیں' جب تک دوست ان کے اعتماد کو مجروح نہ کریں وہ ان کے دماغ سے بھی سوچ لیتے' ملک کی سیاسی تحریکوں کے اٹھانے میں ان کے دماغی فیصلے شاذ ہی شریک ہوتے لیکن ان تحریکوں کے جگمگانے میں ان کی زبان برقی لہر ثابت ہوتی۔

وہ سب سے بڑے عوامی خطیب تھے لیکن عوام کو کالانعام ہی سمجھتے۔ انھیں جدید سیاسی

اصطلاحوں سے کوئی رغبت نہ تھی' ان کا خیال تھا کہ تحریکات میں عوامی قوت فعال ضرور ہوتی ہے لیکن سرچشمہ نہیں۔ وہ نتائج کو مشیتِ ایزدی کے تابع سمجھتے تھے ان کی بے نیازی حد سے بڑھی ہوئی تھی' اُنھیں اخبارات سے نفرت تھی ان کا عقیدہ تھا کہ اخبارات نے آغاز سے اب تک بڑے بڑے جھوٹ گھڑے ہیں' اگر اس جھوٹ کا بوجھ ماؤنٹ ایورسٹ پر پڑتا تو وہ زمین میں دھنس چکی ہوتی۔ اُنھیں اشتہار دینے یا بننے سے سخت نفرت تھی۔ ایسی کوئی ترغیب یا تحریص اُنھیں بہلا یا پھسلا نہ سکی اور نہ وہ خوشامد ہی سے رام ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ انسان کی ملعون کمزوریاں تھیں۔ یہاں بڑے بڑے تخلیہ دوست راہ نُما اور گوشہ نشین مہاتما بھی اخباروں میں چھپنے کی آرزو سے بے نیاز نہ رہ سکے لیکن شاہ جی غالباً تنہا انسان تھے جنھیں اس کوچے سے رسم و راہ رکھنے میں عار تھی' وہ غصہ میں اکثر اسے کو جہنم کی آگ کہہ اٹھتے اور ہمیشہ اس سے کنی کتراتے رہے۔

''بابو! میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں''۔

جب کسی فوٹوگرافر نے ان کی تصویر لینا چاہی تو چہرے پر رومال ڈال لیا یا ڈانٹ کر بٹھا دیا' کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں' میرے خیالات کو اتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر......؟

بیٹا پاس بیٹھا ہو تو اس سے کہتے ''کھڑے ہو جاؤ شاہ جی!''

فوٹوگرافر سے مخاطب ہو کر'

''میری تصویر میرا یہ بیٹا ہے اسے دیکھ لو''۔

''اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے؟''

خود عمر بھر میں ایک آدھ تصویر کھنچوائی' اس کے علاوہ دو چار تصویریں اور ہوں گی لیکن سب چوری چھپے کی' وہ تصویر کا رکھنا اور کھنچوانا شرعاً ممنوع سمجھتے تھے۔ اُنھیں مصوری اور عکاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ انھیں کٹ حجتی سمجھتے۔ عرض کیا کہ فلاں فلاں بزرگ

کی تصویر بن چکی ہے مثلاً مولانا ابو الکلام آزادؒ (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت تھی) فرماتے۔

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد تھا' شریعت میں نہیں۔ میرے لیے ان کا کوئی فعل حجت نہیں' بابو! میرے میاں (ﷺ) نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں''۔

اور وہ میاں کے لقب سے حضور سرور کائنات ﷺ (فداامی وابی) کا نام لیتے اور ذکر کرتے تھے۔

راقم نے عرض کیا۔

''شاہ جی! آپ تو کُرتے کے ساتھ شلوار پہنا کرتے تھے لیکن یہ کچھ دنوں سے آپ نے تہ بند پہننا شروع کرر کھا ہے؟ فوراً ہی بات کاٹ لی:

''بھائی حضور کا لباس ہے' میاں پہنتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہر سوال ختم ہو جاتا' شاہ جی کی دو تہائی زندگی سیاسیات میں کٹی' ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا' ان دنوں کے سوا جو قید خانے میں بسر ہوئے کوئی دن بھی تقریر کے بغیر نہ گزارا' سیکڑوں قومی و ملکی مسائل پیدا ہوئے اور ہر مسئلے میں لوگوں سے کہا سنا لیکن اخباروں میں بیان بازی سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں اور جب نامہ نگاروں نے گھیرا دامن چھڑا لیا' تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دل چسپ خموشی تھی۔ مجلسِ احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی کبھی کوئی بیان نہیں چھپوایا جو بیان یا پیغام ان سے منسوب ہیں ان میں بھی ان کا منشا تھا' قلم نہیں' راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مُستثنٰی ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ ''آزاد'' میں ان کے قلم سے نکلا۔ تقریباً تمام بڑے ایڈیٹروں سے ان کے تعلقات رہے لیکن چھپنے چھپانے سے فرار ہی کیا۔ کسی نامہ نگار نے گھیر لیا' کوئی سٹاف رپورٹر آنکلا یا کسی نمایندے سے ٹکر ہوگئی اور وہ سوال کر رہا ہے' شاہ جی فلاں مسئلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شاہ جی

کنی کترا کے نکل جاتے، فرماتے:

''بھائی میں آج کل قرآن مجید کی فلاں آیت پر غور کر رہا ہوں، میرا خیال ہے فلاں فلاں مفسر نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے البتہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں بات ابھرتی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سامنے نہیں، غالباً انھوں نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے''۔

اخبار نویس پوچھتا ہے:

دو قومی نظریے کے مسئلے میں آپ علامہ اقبالؒ سے متفق ہیں یا مولانا حسین احمد مدنی سے؟ آپ نے بحث تو دیکھی ہوگی؟ بھائی میں نے جانبین کے فرمودات کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آج کل بیاض کھنگالنے میں لگا ہوں۔ کوئی ۳۵ برس پہلے ''جب آتش جوان تھا'' یہ بیاض مرتب کی تھی۔ سنو یہ شعر کس قدر پیارا ہے۔

ہر کسے را دامن تر ہست اما دیگران
باز می پوشند و مادر آفتاب انداختیم

اخبار نویس کہتا ہے! ''شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟ جمہوریت اس وفاق کا ذریعہ بن سکتی ہے یا فسطائیت یا اشتمالیت؟

شاہ جی موڈ کے آدمی تھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دیتے کہ انھوں نے عصری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟ ان کے نزدیک ہر چیز کی ایک ہی ترازو ہے اور وہ ہے قرآن مجید اُسوۂ رسول ﷺ سیر صحابہؓ اور علمائے اُمت کا فہم و تدبر۔ ان ائمہ اربعہ کے سوا جن کی فقہ چلتی ہے وہ کسی جدید فقہ کے قائل نہ تھے، ان کا واحد معیار اسلاف تھا۔ اس دور کی بیش تر تحریکیں ان کے نزدیک ذہنی بدکاری تھیں۔ انھوں نے سرے سے ان تحریکوں کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں ان کی معلومات محدود اور بالواسطہ تھیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے اور عصری تحریکوں کا علم انگریزی میں رسوخ کے بغیر حاصل نہ ہوتا تھا۔ گو ایک حد تک انگریزی زبان کے مزاج سے آشنائی بھی اس خلا کو پورا کرتی ہے لیکن شاہ جی دونوں سے دست کش تھے۔

ان کا تعلق دیوبند کے اس مدرسۂ فکر سے تھا جس نے انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تھا وہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن ان کی ذہنیت کا خمیر اسی خاک سے اٹھا تھا جن اکابر علما نے سرسید کے مشن کی مخالفت کی وہ ان پر ہزار ہزار رحمتیں بھیجتے۔ ان کے عقیدہ میں خرابی کی اصل جڑ انگریزی تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کے بدن سے ''روحِ محمد ﷺ'' نکال لی اور انھیں مغربی افکار کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا اس خرابی کو ابتداءً روک لیا جاتا تو آج نقشہ مختلف ہوتا اور مسلمان اس طرح نہ گرتے جس طرح گر چکے ہیں۔ پھر ان کا یہ خیال معناً درست تھا کہ زبان کے بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں کی زبان عربی بنا ڈالی اور عام باشندے اسلامیات میں گُھل مل گئے۔ جہاں عربی زبان کا تسلط نہ ہوا وہاں جہاں بانی کی مُدت گزرتے ہی عمارت بیٹھ گئی۔ ہندوستان کی نظیر سامنے ہے۔ یہاں اسلام حکمرانوں کی معرفت نہیں بلکہ اہل اللہ کی وساطت سے آیا لیکن عام آبادی میں اسلامی فکر رچ پچ نہ سکی۔ عربی اثر سے قاہرہ ہمیشہ کے لیے اسلام کا شہر ہو گیا لیکن دہلی مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے باوجود اس شرف سے محروم رہا۔ جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی ان کا اسلام کئی واسطوں سے متاثر تھا وہ اسلام کی اصل زبان ہی سے نا آشنا تھے۔ فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی' لیکن قبول اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔ اس کی کوکھ سے اُردو پیدا ہوئی جس نے خاص قسم کے اثرات پیدا کیے باوجودے کہ اس زبان کے بنانے اور بولنے والے مسلمان تھے لیکن زبان مسلمان ہو گئی اسلام اُردو نہ ہو سکا۔ انگریزی کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اولاً نصاریٰ کی زبان' ثانیاً فاتحوں کی بولی' ثالثاً اسے وہ لوگ لے کر آئے تھے جو کلیسا کے ردِعمل سے نفس مذہب کے خلاف اُبھرتی ہوئی تحریکوں کے ہراول تھے۔ حد یہ کہ صنعتی انقلاب نے زبان کا مزاج ہی بدل ڈالا...... ان حالات میں جن علما نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا اور ان میں اس کے خلاف ایک عمومی تحریک کی نیو اُٹھائی۔ ان کے ذہن میں یقیناً حالات کی خرابیوں کا یہ نقشہ ہو گا لیکن اب دنیا ایک صدی آگے بڑھ چکی ہے اور آج انگریزی کو دنیا میں وہی عروج حاصل ہے جو

کبھی عربی کو تھا۔ پھر انگریزی محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ سائنسی انکشافات کی طرح ناگزیر ہو گئی ہے لیکن شاہ جی کے نزدیک انگریزی میں پڑھنا پڑھانا دونوں حرام تھے۔

ایک دفعہ میں نے ان کے بچوں سے متعلق عرض کیا:

''شاہ جی انھیں انگریزی پڑھائیے' انگریزی مدرسوں میں بھیجیے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے آئندہ معاشرے کی باگ ڈور قانون دانوں کے ہاتھ میں ہے''۔

بس اس پر بگڑ گئے۔

''تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انھیں زندہ دفنا دو...... لعنت بر پدرِ فرنگ۔

اور یہ ان کا قلندرانہ نعرہ تھا۔

کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی ایک خاص کھیپ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے' ہندوستان ایک تھا تو ان کے نیازمندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ (ہندو اور مسلمان) شامل تھے۔ ان کی ایک بڑی جمعیت کو ہمیشہ آپ سے لگاؤ رہا' سبھی آپ کا احترام کرتے لیکن نہ وہ انھیں ہم خیال بنا سکے اور نہ یہ اُنھیں قائل معقول کر سکے۔ دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا۔ ان میں سے اکثر آپ کے صحبت یافتہ تھے' مثلاً منشی احمد دین سوشلسٹوں کے سب سے بڑے مقرر تھے ان کا سیاسی راستہ ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن خطابت میں شاہ جی ہی کے خوشہ چین تھے۔

شاہ جی کمیونزم کو بھی اسلام کے خلاف یہودیوں کی لامتناہی سازشوں کا ایک حصہ سمجھتے تھے دلیل یہ تھی کہ کارل مارکس یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ سے اسلام کے خلاف سازشیں کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اسلام کے خلاف کی گئی سازشوں کی پوری تاریخ اپنے خطیبانہ جوش میں بیان کر جاتے۔ ان کی یہ باتیں نئی نسل کے لیے سطحی ہوتیں یا اجنبی یا پھر جذباتی لیکن ان کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

کارل مارکس نسلاً یہودی ضرور تھا لیکن اس نے انسان کے اجتماعی اور انفرادی دکھ کو نہ

صرف محسوس کیا بلکہ ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کی اساس جدلیات پر ہے صہیونیت پر نہیں، مگر شاہ جی تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی کش مکش، جدلیاتی اُصول اور سرمایہ ومحنت کے معاشی مباحث کو اپنی خطابت میں کوئی اہمیت نہ دیتے، فرماتے۔

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

جس تحریک یا جماعت میں خدا نہ ہو اخلاقی قدریں اضافی سمجھی جائیں اور پیغمبر صرف مادی حالات کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آئے ہوں، شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر نکتہ چینی کرتے، عام اشتمالی نوجوانوں کو گم راہ مگر مخلص خیال کرتے۔

لیکن دُکان دار علما کی طرح وہ نہ تو سرمایہ داری کا جواز پیدا کرتے اور نہ بڑی زمین داریوں ہی کے حق میں تھے، فرماتے زمینیں خدا کی ملکیت ہیں اور جو لوگ ان میں ہل جوتتے ہیں وہی از رُوئے اسلام ان کے حق دار ہیں۔ جس نظامِ معیشت سے بھی استحصال پیدا ہو وہ اس کے سخت خلاف تھے انھیں خونیں انقلاب برپا کرنے میں کوئی عار نہ تھی، لیکن ان کے نزدیک راہ نما ''قرآن'' تھا ''سرمایہ'' نہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر حکومت الٰہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیوں کر اشترا کیوں کا ذکر آ گیا، کسی نے لقمہ دیا، حضرت ان کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ بس پھر کیا تھا، گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے پھر تاؤ میں آ گئے۔ ''ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے، ہائے اکبر الٰہ آبادی کس وقت یاد آ گئے .... (لَے کے ساتھ)

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوند ایزد متعال کہ ''کُن'' کے لفظ سے کائنات پیدا کی، کہاں روس، توے پر دانۂ اسپند الٹا دو تو سور ہو جائے''۔

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا اُلٹ پھیر تھا لیکن اس ایک ادا نے مجمع کو گرویدہ کر لیا' نعرہ ہائے تکبیر گونج اٹھے' اس سحر ہی سے خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا ''آپ لوگوں پر ایسا جادو کرتے ہیں کہ ان کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں آپ کا علاج گولی ہے''۔

غرض شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ تھے' ان کی باتیں اکثر و بیش حقائق پر منتج ہوتیں۔ جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوتے تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہ بیٹھتیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پزیر ہوتیں کہ لوگوں کو شاہ جی کے مُلہم ہونے کا گمان ہوتا۔ ان کی قلندرانہ شوخیاں اکثر و بیش تر حقائق پر منتج ہوتیں۔ یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہ تھی ان لوگوں میں جھنجھلاہٹ پیدا کرتی جو سیاست کو مادیات کے آئینے میں دیکھتے تھے لیکن اس جھنجھلاہٹ کے باوجود جب نتیجوں کی منزل سامنے آتی تو ان باتوں کا بہت بڑا حصہ صحیح ہوتا۔ خضر وزارت ٹوٹی تو ان کی قلندرانہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوتی گئیں۔

چڑھتے دن سے رات گئے تک وہ مکانوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کرتے' کوئی پوچھ لیتا تو فرماتے۔

''میاں کیا پوچھتے ہو؟ شعلے نہیں ٹوانوں کے طرّے ہیں طرّے''۔

شاہ جی نے فسادات کے آغاز ہی میں اَمرت سر چھوڑ دیا تھا' امرت سر سے کوئی دوست آتا تو اس سے کہتے۔ ''وہاں کیا رکھا ہے چلے آؤ جو خط کھنچ چکا ہے وہ اب مٹنے کا نہیں''۔ مجھے دیکھو سخن متروکہ ہو گیا ہوں۔

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

عمر بھر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے رہے لیکن ان دنوں وہ التزام بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اخبار مل گیا' پڑھ لیا۔ نہ ملا تو دوستوں سے خبریں معلوم کر لیں یا ریڈیو سن لیا۔

ان کی سفری کائنات ایک چھوٹا سا بستر، ٹین کا بیمار بکس، بید کی ٹوکری، تانبے کا لوٹا اور گول سا پان دان تھا۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آ گئی تو جب تک پڑھ نہ لی شریکِ سفر رہی، ان دنوں ''غبار خاطر'' کا دستخطی نسخہ ہم راہ تھا۔ اس کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی کہانی بھی کہنے لگے، حافظ کی گرہیں کھلنے لگیں انھیں عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور ملتانی کے بے شمار شعر، مثنویاں، قصیدے، مسدسیں، مخمسیں، نوحے، نعتیں، غزلیں، نظمیں ازبر تھیں اور مولانا آزادؔ کی طرح اپنے حافظے پر انھیں بھی بڑا ناز تھا۔

''یہ اشعار آج سے کوئی تیس سال پہلے پڑھے تھے، فلاں شعر شاد عظیم آبادی سے سنا تھا اب تک یاد ہے، نظیری کے فلاں فلاں شعر نانا مرحوم کی بیاض سے نقل کیے تھے میاں! فارسی کا ذوق تو اب عنقا ہو رہا ہے، ادھر اردو بھی اب نئے نئے تجربوں کی زد میں ہے۔ شاعری نے ایک نیا بچہ جنا ہے، نظم معریٰ یا نظم آزاد، مرزا غلام احمد کی نبوت اور نظم معریٰ میرے لیے ناقابل فہم ہیں ....
لعنت بر پدرِ فرنگ!

مدت العمر پنجابی کی شوخ و شنگ شاعری کا شوق رہا۔ لیکن عمر کے ساتھ ہاتھ اُٹھا لیا۔ ایک دفعہ مولانا آزادؔ کو ہیر وارث شاہ کا ایک بند سنایا۔ اس وقت تو مولانا عادتاً ''ہاں میرے بھائی'' کہہ کر چپ ہو رہے لیکن ۲۵-۲۶ برس بعد ملے تو فرمایا ''شاہ جی سنا کہ آپ تقریر میں گالی دینے لگے ہو؟''۔

''حضرت، آپ سے کس نے کہا؟''

''میرے بھائی، نام تو یاد نہیں آ رہا، بہر حال کوئی صاحب ضرور تھے''۔

''تو حضرت آپ نے اعتبار کر لیا؟''

''میرے بھائی اعتبار کی بات نہیں، ایک زمانہ میں آپ نے ہیر وارث شاہ کے چند شعر سنائے تھے ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے، میں نے سمجھا شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو''۔

شاہ جی نے قہقہہ لگایا، مولانا نے تبسم فرمایا اور بات ہوا ہو گئی۔

انھیں بلّھے شاہ کی کافیاں اور بابا فرید کا کلام بھی خوب یاد تھا بابا فرید کی زبان دو ضلعی ہے اور مُقابلتہً دشوار۔ بلّھے شاہ سریع الفہم ہیں اور ان کے ہاں کُھلی صاف گوئی ہے۔

سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے

''ہاں بھائی سچ کہنا فرنگی کے دَور میں بہت بڑا جرم ہے''۔

''جی نہیں شاہ جی ہر دور میں جُرم رہا ہے''۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بھائی لیکن ہمارا معاملہ تو اس دور سے ہے''۔

مَیں چاہتا تھا شاہ جی اس موضوع پر کُھلیں اور میں ان پر بزعم خود ثابت کروں کہ انسان کو اس دور میں مُقابلتہً زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں اور پہلے تمام دور سیاستاً گھناؤنے اور ڈراؤنے تھے۔ میں نے ان سے کہہ ہی دیا' شاہ جی مسلمان بادشاہوں نے بھی تو راست باز زبانوں کے کاٹنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی؟ آج جن لوگوں کو تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں کہا جاتا ہے ان کے ساتھ حُکّام اور عوام نے ایک سا برتاؤ کیا آج استبداد کی اجتماعی حمایت میں کم از کم عوام تو شریک نہیں ہوتے؟

''میاں! یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے' تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے' اس نے روحیں قتل کر دی ہیں' روحیں! اسلام اُٹھ گیا مسلمان رہ گئے۔ ہائے اکبر کس وقت یاد آیا (لَے میں)

یُوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

اِن کے بھی اکبر الٰہ آبادی کی طرح احتجاجی مگر منفی جذبات تھے لیکن دونوں میں وہی فرق تھا جو ایک مُصلح اور انقلابی میں ہوتا ہے۔ اکبر مسکرا کر چٹکی لیتے ہیں شاہ جی جھنجھلا کر تھپڑ مارتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ کے لیے یہ گرہ پڑ چکی تھی کہ انگریز سے بڑا دشمنِ اسلام کوئی نہیں۔ ان کے سامنے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری تاریخ تھی۔ انھوں نے سیاسیات میں قدم رکھا تو پہلی جنگِ عظیم کے نتائج آنکھوں کے سامنے تھے جو خیالات ورثہ میں

پائے وہ استعمار کے مخالف علما کے خیالات تھے۔ خلافت عثمانیہ جس طرح پارہ پارہ ہوئی اور عرب ملکوں میں قومیت کے نام پر جو گُل کھلائے گئے وہ ان کی انگریزوں سے برگشتگی کے لیے کافی تھے۔ ہندوستان میں تحریکِ خلافت اور جلیاں والا باغ کے حادثے نے مہمیز کا کام کیا۔ نتیجۃً شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ فرماتے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو راستہ دکھایا ہے آخرت کی فکر میں اُسی پر چل رہا ہوں مجھے اسی کے لیے جینا اور اسی پر مرنا ہے۔

حرف ناگفتہ مجال نفسے مے خواہد

ورنہ مارا بہ جہاں تو سروکار کجاست

الغرض ان کی ذات ربع صدی تک انگریزوں کے خلاف ایک تحریک بنی رہی اس لحاظ سے وہ ایک ادارہ تھے۔ انھوں نے ایسے علاقوں میں انگریز دشمنی کے بیج بوئے جہاں ان کے اپنے الفاظ میں اور گو یہ الفاظ کس قدر سخت ہیں "پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی تھیں"۔

ایک دوست نے دریافت کیا "ملکی سیاسیات میں آپ کی کارگزاری (Contribution) کیا ہے اور آزادیٔ ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لیے آپ کوشاں ہیں؟"

فرمایا "یہ فیصلہ تو آپ کیجیے کہ میری (Contribution) کیا ہے میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سری نگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کون سا تصور ہے جس کے لیے میں لڑتا رہا تو سمجھ لیجیے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئیڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو...... یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں' فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں' منفی تصور کا ہے' ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلوخلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں' تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوہارے بانٹنا

چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں سپاہی ہوں' تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دشمن ہے انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی' ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہوگئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا' پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اسے چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے"۔

ان کی اس جھنجلاہٹ میں ایک قسم کی جارحانہ لگن ہوتی جو باتیں اقبال نے قلندرانہ رنگ میں کہی ہیں اور جن میں "پیچ وتاب رازی" اور "سوز و ساز رومی" کی شدت پائی جاتی ہے شاہ جی ان کے اَن تھک مفسر تھے' اقبال و اکبر کی مثالیں یہاں اس لیے زیر قلم آئی ہیں کہ قارئین شاہ جی کی سیرت کے اس پہلو کو آسانی سے سمجھ لیں۔

اکبر اور اقبال دونوں کا مشن ایک تھا' لیکن دونوں کا طرز بیان' مقاصد میں ہم آہنگی کے باعث مختلف رہا۔ اقبال کا انداز عقلی ہے' اکبر کا جذباتی ...... اکبر نے ایک گرتی ہوئی دیوار سے دل برداشتہ ہو کر گرد و پیش کے ظواہر پر سنگ دلانہ قہقہے لگائے تھے لیکن اقبال اس دور کی تمام عصری تحریکوں کے نقاد تھے وہ انگریزوں کے صرف اسی لیے مخالف نہیں تھے کہ انھوں نے کسی مدرسہ فکر سے عقیدے کے طور پر بعض معلوم سچائیاں حاصل کی تھیں' ان کی انگریزوں پر چوٹیں ایک مسلسل مطالعے اور لگاتار مشاہدے کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

کرے قبول اگر دینِ مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

گویا اقبال کے علم و نظر کی معراج اس خیال پر ختم ہوتی ہے جس خیال کو شاہ جی کے ہاں قریب قریب عقیدہ کا درجہ حاصل تھا اور جو جذبہ سے شروع ہو کر جذبہ ہی پر ختم ہوتا تھا۔

شاہ جی کا یہ جذباتی سراپا انتہائی دلآویز تھا انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی

جدوجہد کی بنیاد محض اس اصل پر نہیں رکھی تھی کہ وہ ایک استعماری قوت تھی' اس کا نوآبادیاتی نظام استحصال محض تھا اور وہ دنیا کے سب سے بڑے سامراج کی مظہر تھی۔ ان کی بنیادِ مخاصمت میں کچھ اور باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں مثلاً:

''۱۸۵۷ء کا غدر اور وہ اسے ''غدر'' کہنے والوں کو غدار کہتے۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی' شہزادوں کا خونی دروازوں پر لٹکایا جانا' آزاد قبائل کے پٹھانوں پر انگریزوں کی مسلسل بمباری' گیلی پولی کے مقام پر مصطفیٰ کمال کے خلاف گکھڑوں' ٹوانوں اور نونوں کی نبرد آزمائی' قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کا بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جانا' غلافِ کعبہ کا جلنا' مہدی سوڈانی کا خرطوم کے صدر دروازے پر سولی پانا' اس کی لاش کا جلایا جانا اور راکھ کا اڑانا' شاہ عبدالقادر جیلانی کے بغداد پر گولہ باری اور حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا''...... ان سانحات کو قرآن و حدیث کا رنگ و روغن دے کر اس طرح بیان کرتے کہ ہزارہا لوگ گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے اور ان کے اعجازِ بیان پر سر دُھنتے تھے۔

''شاہ جی اپنی سوانح عمری ہی لکھیے؟''

''کس کے لیے؟''

''ہمارے لیے''۔

''آخر تیس بتیس برس تم لوگوں میں جھک مارتا رہا ہوں۔ اس سے تم نے کیا حاصل کیا جواب چند اوراق کی کہانی سے حاصل کر لو گے؟''

''اچھا اپنے لیے لکھیے''۔

''میں لکھی لکھائی کہانی ہوں' اپنے تئیں ہر روز پڑھ لیتا ہوں''۔

بہر حال شاہ جی اس طرح ایک تاریخ ہو جائے گی''۔

''پھر وہی بات؟ تاریخ کیا؟ اور کس کے لیے؟ پہلے ہی لوگوں نے تاریخ سے کون سا سبق لیا ہے کہ اب اپنی زندگی لکھنے بیٹھوں؟''

''شاہ جی یہ ''زبان'' کا نہیں ''قلم'' کا زمانہ ہے!''

''ٹھیک ہے بھائی! لیکن لکھوں کیا؟''

''کچھ تو کہیے کہ زمانہ گوش بر آواز ہے''۔

''ہائے ذوق، ساری سوانح عمری تو اس شعر میں کہ گیا ہے (لَے میں)۔

لائی حیات' آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

''چلیے اسی شعر کو طرازِ عنوان بنا کر بسم اللہ کیجیے''

''خوب! آخر صحافی ہونا؟ قلم اٹھایا اور صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے' زندگی میں محض سوانح ہی نہیں ہوتے؟ کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں؟ بعض گفتنی بعض ناگفتنی۔ ناگفتنی میں کام کی کوئی چیز نہیں اور گفتنی میں خطرات ہی خطرات ہیں۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم پختہ شدم' سوختم

آج سے چوتھائی صدی پیش تر ایک سفر شروع کیا تھا۔ تب بے شمار لوگ شریک راہ تھے۔ ہر پڑاؤ پر قافلہ گھٹتا ہی رہا حتیٰ کہ:

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے' کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چُھوٹ گیا

کچھ دوست راستہ بدل گئے کچھ اپنے ہی تعاقب میں پیچھے لوٹ گئے' اکثر بچھڑ گئے' بیش تر بچھڑ گئے۔

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہِ ما' دشمن خویش است

دوستوں سے فریب نہیں کیا' دشمنوں سے انتقام نہیں لیا۔ ذاتی دشمن بنائے ہی نہیں اور

نہ بننے کی کوشش کی۔ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ انگریز دوست ہے اس سے کنارہ کیا۔ جس نے ملی مقاصد سے بدعہدی کی اس سے علیک سلیک کو بھی عار سمجھا' اب اس عمر میں لوگوں اور شہروں کے خمیر و ضمیر سے واقف ہو گیا ہوں۔

ان کو بہت قریب سے پہچانتا ہوں مَیں

اور جب اُمید نہیں تو شکایت کس سے؟

مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم

صد بیابان بگزشت و دگرے در پیش است.......... اس سارے سفر کا حاصل ہے لگا تار چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا' پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں' سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لیے طوفان بکنار ہو جاتے' درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے' کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں' صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی' دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے' جنگل لہرانے لگتے' صحرا سرسبز ہو جاتے' افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لیے بنجر ہو چکی تھیں۔.......... جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے' جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا' جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے جن میں ٹھہرنا اَلم ناک اور جن سے گزر جانا طرب ناک تھا' جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے' تیرہ سو برس کی تاریخ اِنھی حادثوں کی کہانی ہے' اِنھی چھچھورے' ناسمجھ' نازک اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے...... یہاں اُمرا دوزخ کے کُتے اور سیاست دان کھٹمل کی طرح ہیں' ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں''۔

میاں بابو! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں ڈھونڈ لو۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور نظر بہ ظاہر گرامی کا یہ مصرح بھی اسی اجمال کی شرح ہے۔

زدی کشتی شکستی سوختی انداختی رفتی

الغرض انھیں اپنی ناکامیوں کا شدید احساس تھا اور اس آزردگی کے آثار آخر عمر میں ان کے چہرے پر آگئے تھے' ان کی متحرک اور روشن آنکھیں جن میں عمر ڈھلنے تک ساری مستی شراب کی سی تھی بالآخر اندر کو دھنس گئی تھیں' ان کے ماتھے کی بے شمار سلوٹوں میں ہزیمت کی ترشی منجمد ہو گئی تھی اور سلوٹیں اپنے ماضی کے بوجھ سے مضمحل تھیں' آواز میں کرارا پن آخر تک رہا لیکن کمر کی خمیدگی پکار رہی تھی۔

لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

۱۹۴۷ء کا زمانہء رستاخیز سب سے طویل عرصہ تھا جو انھوں نے ایامِ قید سے قطع نظر ایک ہی جگہ نشست جما کر بسر کیا' چند ماہ دفترِ احرار میں رہے اور اس اثنا میں کتاب کے جتنے ورق تھے ایک ایک کر کے کھل گئے۔ وہ اپنی کہانی لکھتے تو حقیقتاً بڑے بڑے وقائع نگاروں کا اثاثہ مفلس کا چراغ ہو جاتا۔ انھوں نے ہندوستان کا ہر کونا کھدرا چھان مارا۔ وہ بعض صوبوں ہی کی نہیں بلکہ شہروں' قصبوں' گاؤں اور بازاروں تک کی بولی ٹھولی محاورہ و روزمرہ جانتے تھے۔ اُنھوں نے انگلیوں پر گنی ہوئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن انسان اتنے بڑے تھے کہ ہندوستان میں کوئی بڑے سے بڑا عوامی لیڈر بھی اس خصوصیت میں ان کا ہم سر نہیں تھا۔ اس دوڑ میں وہ مہاتما گاندھی اور قائداعظمؒ سے بھی منزلوں آگے تھے لیکن گاندھی جی کے الفاظ میں تالیاں پیٹنے والے مسلمان ان کے ساتھ تھے اور ووٹ دینے والے قائداعظمؒ کے ساتھ۔ اُنھیں ہندوستان کی بہت سی زبانوں پر قدرت حاصل تھی' ہزاروں لطائف یاد تھے۔ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی میں اتنے مستعد کہ ان سے کئی کتابیں مرتب ہو سکتی تھیں۔ پنجاب کی بعض اضلاعی بولیاں رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی تھیں۔ ان کی گفت گو سے یہ پہچاننا مشکل تھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

اُردو بولتے تو اہلِ زبان کا لب ولہجہ کھلا جاتا۔ قرآن پڑھتے تو قرأت سے عرب ہونے کا دھوکا ہوتا۔ پنجابی بولتے وقت منہ سے موتی جھڑتے' غرض ہر نگر کی بولی ٹھولی نوکِ زباں تھی ؎

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

اکثر شخصیتوں کے قرب سے ان کا ملمع اُتر جاتا ہے لیکن شاہ جی کے قرب سے ان کا سونا اور دمکتا' وہ بے پناہ تھے۔ ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی تھیں۔

راجندر بابو نے گاندھی جی کی سوانح عمری کے دیباچے میں لکھا ہے:

''ان کے حالاتِ زندگی لکھنا ایسا ہے جیسے تیرتھ یاترا؟''

شاہ جی تیرتھ نہ تھے لیکن ان کی یاترا سے ایک ایسے تیرتھ کا احساس ضرور ہوتا تھا جس میں صدیوں سے ایک ہی آواز گونج رہی ہو ؎

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد



خاندانی حالات

نام ونسب

نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ شاہ بخاری' ننھیال کی طرف سے شرف الدین احمد باپ کا نام ضیاء الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ' دادا کا نام نور الدین احمد (نور اللہ مرقدہ) پردادا کا نام سید محمد شاہ' ان سید محمد شاہ کے پانچ بیٹے تھے' دو لاولد رہے تین کے اولاد ہوئی۔

شاہ جی کے دادا کے ایک بھائی سید حیدر شاہ کا ایک بیٹا سید مقیم شاہ بنگال پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا' اس کے پاس خاندان کا شجرہ محفوظ تھا لیکن برعظیم کے بٹوارے میں حوادث کی نذر ہو گیا' معلوماتِ ذیل کچھ تو افرادِ خاندان کی فراہم کی ہوئی ہیں اور کچھ منشی محمد دین فوق کی تالیف ''تاریخِ کشمیر'' سے ماخوذ ہیں۔

شاہ جی کا سلسلہ نسب ۳۹ ویں پشت میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبد الغفار بخاری اپنے والد ماجد سید محمد شاہ بخاری کے ہمراہ بخارا سے کشمیر میں وارد ہوئے' اس وقت کشمیر میں مسلمانوں کی فرماں روائی تھی۔ اپنے علم و تدبر کی بدولت سید عبد الغفار شاہ بخاری درس و قضا کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور بڑا نام پایا۔ سید عبد الغفار امام

حسنؓ کی چوبیسویں اور شاہ عبدالقادر جیلانی بغدادی کی تیرھویں پشت سے تھے۔ انہی شاہ صاحب کے خویش کشمیر سے اٹھ کر گجرات اور اُمرت سر میں آباد ہو گئے' پھر بیعت وارشاد کے سلسلے میں دہلی سے پٹنہ چلے گئے اور وہاں لوگوں کی عقیدت مندی کے باعث سکونت اختیار کر لی۔ فی الجملہ ایک خاندان کئی شاخوں میں منقسم ہو گیا۔

شاہ جی کے فرزند ارجمند سید ابوذر بخاری (سید عطاء المنعم بخاری) نے اپنے والد کے مجموعۂ کلام "سواطع الالہام" میں دیباچہ کے تحت خاندان کے حالات پر جو اشارات مرتب کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں' مثلاً شاہ عبدالقادر جیلانی (بغدادی) جنھیں عراق میں پیر ہندیاں کہتے ہیں اور یہاں ان کے نام سے گیارھویں شریف ہوتی ہے۔

سید اکمل الدین محمد بخاری اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو تلاشِ مرشد کے سلسلہ میں دہلی گئے اور وہاں سید غلام علی شاہؒ سے بیعت ہو کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانہ میں موضع سرہالی ضلع گجرات پنجاب میں آباد ہو گئے۔ انگریزی عمل داری کے وقت نقل مکانی کر کے اس ضلع کے ایک دوسرے گاؤں ناگڑیاں چلے گئے تب سے اب تک یہ خاندان وہیں آباد ہے۔ سید اکمل الدین محمد بخاری کا وصال اُمرت سر میں ہوا تھا۔

شاہ جی کے دادا نورالدین شاہ بخاری حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی علیہ الرحمتہ سے بیعت تھے' کہا جاتا ہے کہ نورالدین شاہ بیعت کے لیے سیال شریف پہنچے تو خواجہ صاحب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ کچھ دنوں مہمان رکھا پھر پروانہ خلافت اور سند ارشاد دے کر رخصت کیا۔

اتفاقات حسنہ ملاحظہ ہوں کہ شاہ جی کے دادا سیال شریف سے بیعت تھے اور حضرت سید مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف بھی وہیں سے بیعت تھے۔ شاہ جی نے اولاً سید مہر علی شاہ سے گولڑہ میں بیعت ارشاد کی تھی۔

شاہ جی کے اعزہ میں سے ایک صاحب سید ہارون شاہ کا بیان ہے کہ ہمارے بزرگ

بخارا سے کشمیر پہنچے' وہاں برسوں قیام کیا پھر پنجاب چلے گئے' پنجاب سے کاروبار کے لیے دہلی اور پٹنہ کا رخ کیا اور وہاں آباد ہوتے گئے۔

سید نورالدین شاہ کے ہزاروں مرید تھے وہ کسی مرید سے پھوٹی کوڑی نہ لیتے' خود کماتے اور کھاتے' انگریزوں نے پنجاب پر قابض ہونے کے فوراً بعد زرعی نظام کی تنظیم جدید کے لیے زمینوں کی پیمائش کرائی تو ایک اہل کار نے جو آپ کے روحانی کمالات سے متاثر تھا' عرض کیا آپ جتنی زمین چاہیں اس پر قبضہ کر لیں' اندراجات میرے سپرد ہیں' آپ کے حسب منشا خانہ پُری ہو جائے گی لیکن شاہ صاحب نے انکار کیا اور فرمایا: تمام زمینیں اللہ کی ہیں' ان پر ذاتی ملکیت کی مہریں لگوانا شرعاً ناجائز ہے۔ ان کے سرہالی چھوڑ کر ناگڑیاں میں آباد ہونے کا باعث بھی یہی تھا کہ اس وقت بہت سے لوگوں نے اس طرح جھوٹ موٹ سے زمینیں حاصل کی تھیں۔

شاہ جی کا ننھیال

شاہ جی کی والدہ سیدہ فاطمہ اندرابی حکیم سید احمد اندرابی کی صاحب زادی تھیں۔ حکیم صاحب طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور مروجہ عُلوم میں دست گاہ رکھتے تھے۔ علم دین سے گہرا لگاؤ تھا۔ آواز میں قدرت نے جادو بھر دیا تھا' شاہ جی ان کی آواز کے سحر کا ذکر بڑے مزے سے کرتے اور فرماتے کہ میرے گلے کی دل فریبی نانا ہی کا صدقہ ہے۔ سید ابوذر بخاری کا بیان ہے کہ اندرابی خاندان سے خاندانی تعلقات کشمیر ہی سے چلے آ رہے تھے۔ شاہ جی کے والد سید ضیاء الدین ابھی نابالغ ہی تھے کہ اپنے تایا سید پیر شاہ بخاری اور اپنے چچا سید حیدر شاہ بخاری (والد سید مقیم شاہ بخاری) کے ہم راہ پشمینہ کی فروخت کے لیے پٹنہ جاتے تو ان حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرتے' حکیم صاحب نے ایک روز سید ضیاء الدین کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی بیٹی فاطمہ اندرابی سے ان کی شادی کر دی۔ ان دنوں رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا' سید ضیاء الدین نے چوک بازار پٹنہ کی مسجد خواجہ عنبر میں اپنی کم سنی کے باوجود ایک ہی رکعت

میں ۲۶ پارے ختم کیے اور مقتدیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کی یادداشتوں میں درج ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی ساڑھ ستی کے بعد پٹنہ میں مقیم تھے وہاں انھوں نے سید ضیاء الدین سے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال تھی ایک رات ایک ہی رکعت میں پورا قرآنِ پاک سنا تھا۔

شاہ جی کے ننھیالی سلسلے میں سب سے پہلے میر سید عبدالسبحان اندرابی نے ڈوگرا راج کے مظالم سے عاجز آ کر ترک وطن کیا اور کچھ دنوں شاہ جی کے بزرگوں کے ساتھ ان کے گاؤں میں ٹکے رہے۔ پھر پٹنہ چلے گئے' ان میر سید عبدالسبحان ہی کی پوتی شاہ جی کی والدہ تھیں۔

سیّدہ فاطمہ اندرابی کی والدہ (شاہ جی کی نانی) حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی نواسی تھیں۔

خواجہ باقی باللہ

حضرت خواجہ باقی باللہ کا مرتبہ ہندوستان کے اہل اللہ میں بہت ہی بلند ہے۔ کل اکتالیس برس کی عمر پائی لیکن اپنے پیچھے جو ورثہ چھوڑا اس پر کئی عمریں قربان کی جا سکتی ہیں۔ کابل میں پیدا ہوئے۔ اصل نام رضی الدین تھا لیکن باقی باللہ کے نام سے شہرت پائی...... آپ کے والد قاضی عبدالسّلام اہلِ علم میں سے تھے۔ بیٹے کو بھی اسی ڈگر پر ڈالا۔ پہلے خود پڑھاتے رہے پھر ملا صادق حلوائی کے تلمذ میں دے دیا۔ ملّا صاحب کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے تو خواجہ بھی ہم راہ تھے۔ وہاں ایک مجذوب کی بدولت کتابوں سے ہاتھ اٹھایا اور مرشد کی تلاش میں نکل گئے' فقرا و مشائخ کے عروج کا زمانہ تھا۔ کچھ عرصہ ماوراء النہر کے مشائخ کی صحبت میں رہے مگر گوہر مقصود نہ پایا۔ اسی اثنا میں امیر عبداللہ بلخی سے فیضان حاصل کیا اور طبیعت میں استقامت نے راہ پائی۔ مگر داخلی اضطراب جوش پر رہا' آخر ہندوستان پہنچے۔ یہاں کشمیر میں بابا بھائی کشمیری سے فیض حاصل کر رہے تھے کہ مرزا یادگار نے بابا صاحب کو زہر دلوا کر مروا ڈالا۔ چار و نا چار دہلی کا قصد کیا۔

وہاں چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں قیام فرمایا اور حضرت شیخ کے فرزند خواجہ قطب العالم سے رجوع کیا۔ ایک رات حضرت قطب العالم پر منکشف ہوا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں۔ آپ نے فوراً ہی انھیں مطلع کیا اس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ ایک ازار تھی وہ دے کر روانہ کر دیا۔ خواجہ صاحب بخارا پہنچ کر خواجہ امکنگی کی خدمت میں حاضر ہوئے' اُنھوں نے آپ کو محنت اور توجہ سے نقشبندی سلسلے کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے وہاں جاؤ اور خلقِ خدا کو فیض یاب کرو۔ خواجہ سمرقند سے پشاور پہنچے۔ وہاں سے لاہور' جہاں سال بھر قیام کیا اور دہلی چلے گئے۔ وہاں فیروز شاہ کے قلعے میں مقیم ہوئے۔ اکبر کا آخری دور تھا اور آپ بھی کچھ زیادہ عمر لے کر نہ آئے تھے فوراً ہی دربارِ اکبری کی بدعات روکنے کے لیے مفاہمانہ لیکن مضبوط اور مختلف قدم اٹھایا۔ نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اہل دربار سے بگاڑ مُناسب نہیں' فی الحال ان سے تعلق پیدا کر کے ہی درباری گُم راہیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ افسوس عمر نے وفا نہ کی چار پانچ سال کام کیا ہوگا کہ سفرِ آخرت پیش آ گیا۔ لیکن اس مختصر سی مدّت میں بھی ملتِ اسلامیہ کو جو فیض پہنچا اس کی نظیر پورے ہندوستان میں نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی آپ ہی سے بیعت تھے۔ حضرت مجدد نے تاحینِ حیات آپ سے فیض حاصل کیا جس کا اعتراف انھوں نے اپنے مختلف مکاتیب میں کیا ہے۔ بعض اُمرائے سلطنت بھی آپ کے مریدوں میں سے تھے جن سے سلسلہ چشتیہ کو کماحقہ فائدہ پہنچا۔ مثلاً:

ا۔ شیخ فریدالدین شہنشاہ اکبر کے عہد میں ڈیڑھ ہزاری منصب سے دیوان تن کے عہدہ پر پہنچے' کئی مہمیں سر کیں' جن میں افغانوں کی سرکوبی' کشمیر کی فتح اور اسیر گڑھ کا محاصرہ نمایاں ہیں۔ جہاں گیر کی تخت نشینی پر شیخ کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ تمام اعیان سلطنت میں بازی لے گئے۔ صاحب سیف وقلم کا خطاب ملا۔ ڈیڑھ ہزاری سے پنج ہزاری ہو گئے۔ شہزادہ خسرو کو شکست دی۔ جہاں گیر نے خوش ہو کر نواب مرتضیٰ خان کا خطاب دیا اور گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ کوئی چار سال بعد پنجاب کا گورنر بنایا۔ آخر اسی عہدے پر پٹھان کوٹ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وصیت کے

مطابق دہلی میں دفن کیے گئے۔ آپ ان اکابرِ سلطنت میں سے تھے جنھیں قدرت اقتدار کے ساتھ فقر بھی عطا کرتی ہے اور جن کی درویشانہ فیاضیاں اس زمانہ میں زبان زدِ عام تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ شیخ فرید کے حقوق ہم سب پر ثابت اور مقرر ہیں کیوں کہ ان سے نقشبندی جمعیت کو استحکام حاصل ہے۔

۲۔ قلیج خان حاکم پنجاب جس کی بیٹی سے اکبر کا بڑا لڑکا دانیال بیاہا ہوا تھا' ہر روز کوئی گھنٹا بھر فقہ و تفسیر کا کھلا درس دیتا۔ اہل لاہور اس کی وسعت نظر اور فراخ دلی کے گرویدہ تھے۔

۳۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں جو بیرم خان کے بڑھاپے میں بمقام لاہور پیدا ہوا۔ اس کی علم دوستیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں' ہر کوئی ان سے آشنا ہے۔

۴۔ مرزا حسام الدین جن کے والد کی بابت بدایونی نے لکھا ہے کہ دربار اکبری میں سجدۂ زمین بوسی کا بانی تھا۔ شیخ مبارک کا داماد اور ابوالفضل و فیضی کا بہنوئی تھا اسے باپ کی وفات پر موروثی منصب ملا۔ خان خاناں نے بہتیرا روکا لیکن دیوانہ ہو کر گلی کوچوں میں گھومنے لگا۔ کچھ دنوں بعد دہلی کا قصد کیا وہاں باقی باللہ سے بیعت کی جب حضرت خواجہ اللہ کو پیارے ہو رہے تھے تو آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت خواجہ کے دونوں بیٹے خواجہ کلاں اور خواجہ خُرد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی کے حلقہ رشد میں تھے لیکن ان کی عام خبر گیری کے فرائض مرزا حسام الدین کے سپرد تھے۔ اِنھی خواجہ خُرد سے شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے تھے اور فیض حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالنبی صدر الصدور بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

شیخ قطبِ عالم کے ذکر میں آ چکا ہے کہ ان کے والد حضرت شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں حضرت خواجہ نے کچھ دن گزارے اور شیخ قطبِ عالم سے استفادہ فرمایا۔ انھی شیخ قطبِ عالم کے فرزند شیخ رفیع الدین کا دہلی سے باہر اعظم پُور میں نکاح تھا۔ اُنھوں نے اصرار کیا کہ حضرت خواجہ شریک ہوں۔ آپ نے ضعف و علالت کے باعث معذرت چاہی۔ شیخ نہ مانے'

کہنے لگے آپ نہیں آتے تو میں شادی نہیں کروں گا؟ راضی ہو گئے' نکاح پڑھایا۔ اس زوجہ سے شیخ رفیع الدین کے ہاں جو بیٹی پیدا ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا یگانہ عصر پوتا عطا ہوا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ خون نسلاً بعد نسلٍ بولتا ہے غلط نہیں' بعض خصائص فی الواقع[1] قدرت کاملہ کی طرف سے اہل اللہ کی اولاد کو جزواً یا کلاً ودیعت ہوتے ہیں۔ اس مادی دنیا میں روحانی تصرفات کی یہ باتیں بہ ظاہر عجیب و غریب نظر آتی ہیں لیکن بہر حال توثیقی آثار و مظاہر موجود ہیں۔ شاہ جی اور ان کے بزرگوں کی زندگی میں اکثر باتیں آج بھی یک گونہ مماثلت رکھتی ہیں۔

مثلاً خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں پہلے پہل جن بزرگ سے تعلق پیدا کیا وہ

۱۔ خواجہ عبید اللہ احرار تھے۔ آپ نے سلسلۂ الاحرار کے نام سے رباعیات بھی لکھی ہیں جن میں سے ایک رُباعی یہ ہے۔

این سکّہ کہ من زدم بنام فقراست
وین روشنی از نور تمام فقراست
برخیز درہ خواجہ احرار بگیر
کان راہ ز سرحد مقام فقراست

شاہ جی سراپا احرار اور احرار ان کی تمام زندگی کے برگ و بار تھے۔

۲۔ خواجہ باقی باللہ علومِ متداول حاصل کر رہے تھے کہ ایک مجذوب صدا دیتا ہوا گزرا۔

درکنز و ہدایہ نتواں دید خدارا
آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

خواجہ نے کتابوں کو طاق پر رکھا اور کتاب دل سے معاملہ کر لیا۔ حضرت شاہ صاحب بھی کسی باقاعدہ مدرسہ کے طالب علم نہ تھے اور نہ علومِ متداولہ ہی میں سند یافتہ تھے لیکن "آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست" سے بہرہ ضرور وافر پایا تھا۔

---

۱ فی الحقیقت زیادہ موزوں ہے۔

۳۔ حضرت خواجہ نے مرشد کے ارشاد پر لاہور میں سال بھر قیام کیا اور ہمیشہ خلفا پر زور دیتے رہے کہ پنجاب میں ارشاد و ہدایت کا بیڑا اٹھائیں چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی کو اول اول لاہور ہی کے لیے نامزد فرمایا جو آپ کے وصال تک لاہور ہی میں مقیم تھے۔

شاہ جی نے بھی تبلیغ کی ساری عمر پنجاب میں گزاری۔ حضرت علامہ انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ اور پانچ سو علما نے انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ منعقدہ لاہور میں آپ سے بیعت کی اور اسی جلسہ میں آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت خواجہ نے اپنے ملفوظات میں حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا ہے۔

''اگر سخن (وعظ) کا اتفاق ہو تو بہ طور علما کے کہنا بطور صوفیا کے نہیں''۔

شاہ جی کی ساری زندگی اس کا آئینہ رہی، وہ علم و تصوف کا سیاسی مرقع تھے، ان میں حضور سے غیب، عین سے علم اور شہود سے استدلال کی رنگارنگی سمٹی ہوئی تھی۔ لیکن ان میں سلوک و طریقت کے وہ طریق بالکل نہ تھے جن سے مشیخت کو آب و دانہ ملتا ہے۔

خواجہ (نور اللہ مرقدہ) کا مقولہ ہے کہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق ہے، شاہ جی عملاً اس قول کا عکس تھے۔ فرق یہ تھا کہ زمانہ سابق میں مشائخ و علما کے حدود و فرائض اب سے مختلف تھے۔ کبھی اصلاحِ احوال مقصود تھا۔ شاہ جی کے زمانے میں انقلاب احوال مقصود رہا۔

غرض ہر دور میں اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فقر و استغنا میں ممتاز تھا اور حسبِ توفیق فکر و نظر کی لادینی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔

ولادت

شاہ جی یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ عیسوی) کی چاند رات کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے کہ والدہ کا سایہء عاطف سر سے اُٹھ گیا۔ شاہ جی کی بیٹی اُم کفیل نے اس کتاب کی اشاعت اوّل کے بعض مندرجات پر مولف کی بیوی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ

''دادا مرحوم (شاہ جی کے والد) نے بیٹے کو ۹ برس کی عمر تک خود ہی پالا پوسا اور خواجہ عنبر کی مسجد میں اپنے ساتھ سُلاتے رہے پھر جب ابا جی کی عمر نو اور دس برس کے درمیان ہوئی تو دادا جی نے پنجاب آ کر دوسرا عقد کیا۔ ہماری یہ دادی رشتہ میں پردادا کی بھتیجی تھیں۔ تھوڑا عرصہ بعد دادا واپس پٹنہ گئے وہاں ہماری ان دادی صاحبہ کے بطن سے ایک چچا اور ایک پھوپھی پیدا ہوئے۔ چچا بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور گجرات میں بزازی کی دُکان کرتے ہیں۔ پھوپھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، چچا کا نام سیّد عطاء الرحمٰن بُخاری ہے۔

ابا جی کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی کہ دادا جان کے ہم راہ ۱۹۱۳ء میں پنجاب آ گئے۔ دادا جان نے تو اپنے آبائی گاؤں ناگڑیاں (ضلع گجرات) میں مُستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۹۴۹ء میں واصل بحق ہوئے لیکن ابا جان نے ۱۹۱۴ء سے اُمرت سر میں قیام کیا اور وہیں کے ہو گئے۔ پاکستان بن رہا تھا کہ امرت سر سے اٹھ کر لاہور آ گئے اور دو چار ماہ لاہور میں قیام کیا پھر نواب زادہ نصر اللہ خان کے گاؤں ''خان گڑھ'' چلے گئے وہاں چند مہینے قیام کیا، پھر ملتان میں آ کر آباد ہو گئے اور وہاں ۹۔ ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ (۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء) کو چھے بجے شام واصل بحق ہو گئے۔''

کل من علیہا فان

تعلیم و تربیت

شاہ جی کسی بھی روایتی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مادرزاد عبقری ہوتے اور جن کی تربیت مبداءِ فیض کرتا ہے اس ضمن میں چند باتیں واضح ہیں۔ مثلاً:

۱۔ شاہ جی کے ننھیال اور ددھیال میں پنجاب اور بہار کا جغرافیائی فاصلہ تھا۔

۲۔ وہ اپنے ننھیال کی اکلوتی بیٹی کے فرزند تھے، ان کی والدہ رحلت کر گئیں تو ان کی عمر چار سال تھی۔ نانی اماں نے آغوش میں لے لیا۔ ان حالات میں وہ بہمہ وجوہ مدرسہ کی تعلیم سے محروم ہو گئے۔

۳۔ ایک تو حالات حسبِ حال نہ تھے دوسرے والدہ کی وفات سے پیش آمدہ حالات کے نتیجہ میں مدرسہ کی تعلیم کا ہاتھ آنا مشکل ہو گیا تھا۔

۴۔ انگریزی مدرسوں میں ان کے داخلہ کا سوال ہی نہ تھا کیوں کہ جس خاندان سے متعلق تھے وہاں انگریزی مدرسوں میں داخلہ خارج از بحث تھا۔

۵۔ اس زمانہ میں ایک خاص عمر تک شرفا کے بچے گھروں ہی میں تعلیم حاصل کرتے اور بڑی بوڑھیوں سے زبان و محاورہ سیکھتے تھے۔

شاہ جی کی بیٹی صادقہ بانو (اُم کفیل) نے مولف کی اہلیہ کو لکھا ہے۔

''ابا جی کا ادبی ذوق ننھیال ہی کی مجالس میں نکھرا تھا' فرماتے ماموں اور ہم بیٹھ جاتے' رات گئے تک بیت بازی ہوتی' فارسی کتابیں ننھیال ہی میں پڑھیں' خواجہ عنبر کی مسجد میں ایک ملا تھے (نام بھول گیا) ان سے ابتدائی کتابیں پڑھیں' پنجاب آ گئے تو گھر سے نزدیک موضع راجووالی میں قاضی عطا محمد کے ہاں پڑھنے جاتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں اُمرت سر کی سکونت اختیار کی تو وہاں حضرت مولانا نور احمد سے تفسیرِ قرآن پڑھی' مولانا غلام مُصطفٰی قاسمی سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسن سے حدیث (مسلم) پڑھتے رہے' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مکی سے بھی استفادہ کیا۔ قرآن پاک دادا جی سے حِفظ کیا۔ دادا' دو یا تین بجے شب جگا دیتے' دو پارے منزل سنتے اور سُلا دیتے پھر نمازِ فجر کے لیے اٹھاتے' نماز پڑھ چکتے تو سبق ہوتا۔

خلیفہ عبدالمجید (سلطان ترکی) کی اولاد کے اتالیق' کویت کے ایک قاری سید محمد عُمر عاصم کسی وجہ سے سلطان کی خفگی کا شکار ہو کر ہندوستان آ گئے۔ پٹنہ میں قیام کیا اور خواجہ عنبر کی مسجد میں قرآن پاک پڑھانے لگے' غضب کے خوش الحان تھے' تلاوت کرتے تو مسجد کے دروازہ پر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھیڑ لگ جاتی۔ ہندو دیویاں اُن سے بچوں کو دم کراتیں سارے شہر میں اُن کا چرچا ہو گیا۔ اس زمانہ کے روسا و شرفا نے اُنھیں آنکھوں پر بٹھایا اس وقت شاہ جی' عمر کے ابتدائی سفر میں تھے ایک دن شاہ جی ان قاری کی نقل کر رہے تھے کہ ان کی نگاہ میں آ گئے' وہ

بہت خوش ہوئے اور شاہ جی کو فنِ قرأت سکھانے کے لیے اپنے تلمذ میں لے لیا۔ نتیجتہً شاہ جی اس باب میں یکتا ہو گئے' قاری محمد عمر عاصم کچھ عرصہ بعد کویت لوٹ گئے' ایک زمانہ میں اُمرت سر کے مولوی عبداللہ ڈار کویت گئے تو قاری صاحب سے وہاں ملاقات ہوئی۔ قاری صاحب نے ان سے پوچھا ایک نوجوان سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری مجھ سے پڑھا کرتا تھا اس سے واقف ہو؟ مولوی صاحب نے بتایا کہ وہ اب ملک گیر شہرت کے مالک ہیں' پورا ہندوستان ان کا شیدائی ہے' قاری بہت خوش ہوئے۔

شاہ جی فرماتے تھے کہ نانی مرحومہ سے اُردو بول چال میں صحّت پیدا کی' شاد عظیم آبادی کی ادبی شُہرت کا آغاز تھا وہ زبان و محاورہ کی سند و تحقیق کے لیے اکثر نانی اماں سے مشورہ کرتے اور مستفیض ہوتے تھے۔ ہم (شاہ جی) شاد کی صحبتوں میں رہ کر زبان و بیان میں اُتارو ہو گئے اور ذہانت و ذکاوت کے فطری انعام نے طبیعت میں چار چاند لگا دیئے۔

پنجاب میں آمد

پنجاب آنے کی ایک روایت اوپر نقل ہو چکی ہے' دوسری روایت یہ ہے کہ شاہ جی' والد کی اجازت کے بغیر پٹنہ سے روانہ ہو کر اُمرت سر پہنچے اور وہاں اپنے ایک قرابت دار سیّد اسد اللہ شاہ بخاری کے ہاں چلے گئے۔ ان سے کہا کہ مَیں سید ضیاء الدین شاہ کا بیٹا ہوں اور ان کی اجازت کے بغیر آیا ہوں' شاہ جی فرماتے تھے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال ہو گی' اس لمبے سفر میں صعوبتیں سہیں مثلاً بنارس میں چینے والی مسجد سے متصل میاں شاکر اللہ کے ہاں چاندی کے ورق کوٹ کر روزی پیدا کی' میاں صاحب کو کُشتی لڑنے لڑانے کا شوق تھا ان سے ڈنٹر پیلنا سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اُمرت سر آ کر یہ شوق تو ختم ہو گیا لیکن بدن کسرتی تھا ورزش کرتا رہا جسم و جان تن دُرست رہے۔ فرماتے اوائل عمر میں مجھے پتنگیں لڑانے اور کبوتر اُڑانے کا بھی بہت شوق تھا لیکن ابا جان سے چوری چھپے۔ ابا اِدھر اُدھر ہوتے تو ماموں جان سے مل کر کوٹھے پر پتنگیں لڑاتا۔

بسا اوقات پیچ اس لیے کٹ جاتے کہ ابا جان دکھائی پڑتے اور ہم چھت سے نیچے آ کر گھر میں حفظ کرنے لگتے جب تک ان کا چہرہ متبسم نہ ہو خوف ہی رہتا' مبادا دیکھ لیا ہو اور پٹائی ہو۔

شاہ جی آخر عمر میں بالخصوص جب ہندوستان بٹ رہا تھا' ان گئے دنوں کو یاد کرتے اور عمرِ رفتہ کے تذکرہ سے خوش ہوتے تھے' ان کے تحت الشعور میں پنجابی ہونے سے کہیں اپنے بہاری ہونے کا احساس تھا۔ وہ نانی اماں کی زبان دانی سے فیض پانے پر فخر کرتے اور شاد عظیم آبادی سے اپنی ہم صحبتی و ہم سخنی کے واقعات بڑے کروفر سے بیان کرتے جہاں تک اُردو زبان سے آشنائی کا تعلق تھا وہ کسی بھی اہل زبان سے اپنے تئیں کم نہ سمجھتے تھے اپنی زبان کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ۔

مستند ہے میرا فرمایا ہُوا

اور یہ غلط نہ تھا۔

احساسِ شرف

شاہ جی میں گدی نشینوں کی سی انسان آزاری بالکل نہ تھی' البتہ ان میں اپنے سید ہونے پر جائز فخر تھا اور اکثر اس فخر و شرف کا تذکرہ کرتے۔

ایک دن دہلی دروازہ کے باغ میں مدح صحابہ پر تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے اعتراض کیا۔

شاہ جی! غضب کرتے ہو سید ہو کے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی مدح!

بس تاؤ میں آ گئے اپنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''تم کون ہو مجھے ٹوکنے والے جاؤ میں علیؓ کا بیٹا' ابوبکر و عُمر و عُثمان رضوان اللہ وتعالیٰ اجمعین کی مدح کرتا ہوں۔ یہ علیؓ کا بیٹا ہی جانتا ہے کہ اُن کا رتبہ کیا ہے' ایرے غیرے پچ کلیان کیا جانیں کہ شیخینؓ کا مقام کیا ہے؟

فرماتے:

مسلمانوں کے معاملات شروع ہی سے بگڑے ہوئے ہیں وہ قال الرسول پر ایمان لا کر بھی آل رسول کو ذبح کرتے رہے ہیں۔ سید ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی ناکامیوں پر ذرہ برابر ملال نہیں، ہمارے ساتھ یہی ہوتا رہا اور یہی ہوتا رہے گا۔ مسلمانوں نے جن لوگوں کی دین میں راہ نمائی قبول کی انھیں دنیا میں ہمیشہ ستایا ہے۔

سیاست میں شرکت

شاہ جی اُمرت سر میں عُلُومِ دینیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ پہلی جنگ عظیم خلافت عثمانیہ کو تاراج کر کے ختم ہو گئی، ہندوستان کو جو صلہ ملا وہ سب کے سامنے تھا۔ رولٹ ایکٹ نے سارے ملک کو برہم کر دیا، پنجاب کو، جو اس جنگ میں برطانوی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن تھا یہ انعام ملا کہ کئی اَضلاع میں مارشل لا یا اس سے مشابہ قانون نافذ کیے گئے گرفتاریوں کا زور بندھ گیا۔ اُمرت سر میں جلیاں والا باغ کا حادثہ پیش آیا جس سے ملک کی تاریخ پلٹا کھا گئی اور سیاسی لیڈر شپ پہلے ہاتھوں سے نکل کے نئے ہاتھوں میں آ گئی، یہی وہ آغاز تھا کہ تلک اور گھوکھلے پیچھے ہٹ گئے مسٹر جینا ابھی نوجوان تھے اور گاندھی جی کی طرح گھوکھلے کے سیاسی شاگرد تھے لیکن وہ بھی مسلمانوں کی سرکاری لیڈر شپ کے مانند گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ زمانہ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو اور علی برادران کا سرِ آغاز تھا اور ملک اس نئی لیڈر شپ کے ہاتھ میں جا رہا تھا۔

جلیاں والا باغ کے مظالم سے ملک بھر میں آگ لگ گئی۔ اُمرت سر میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ ہندوستان کے سفر آزادی کا پہلا موڑ تھا۔ اس زمانہ کے بعض انگریز افسروں نے اعتراف کیا ہے کہ جلیاں والا باغ میں جنرل ڈائر کی آتش بازی ہندوستان سے انگریزی حکومت کی رخصتی کا سرآغاز تھا۔ پاکستان کے مشہور مصنف ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ ۱۹۶۸ء میں وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کے انگلستان کے ایک گاؤں

میں اُمرت سر کے اُس ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے جس نے جلیاں والا باغ میں فائرنگ کا حکم دیا تھا۔ اس بوڑھے انسان نے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ہم نے اُمرت سر پر قابو ضرور پا لیا تھا لیکن وہ دن برطانوی حکومت کے انخلا کا پہلا دن تھا۔

شاہ جی ان دنوں مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے لیکن طالب علمی ادھوری تھی، ایک چھوٹی سی مسجد (کوچہ جیل خانہ) میں امام ہو گئے چوں کہ خوش الحان وخوش بیان تھے لہٰذا اُمرت سر کے مسلمانوں میں وعظ کرنے لگے' ان دنوں بدعات کا زور تھا' اصلاحِ رسوم کی نیو اٹھائی اور تمام شہر میں ایک خوش بیان و فصیح اللسان کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمہ نے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ:

''میں نے اُمرت سر میں خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو انگریزوں کے مظالم سے آگاہ کرنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے میرے خلاف شاہ جی کو کھڑا کیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ شاہ جی کو ملکی حالات اور قومی سیاست کا مطلقاً علم نہیں۔ وہ استعمال کیے گئے ہیں، مَیں نے شاہ جی کو اپنے ہاں بُلا بھیجا' ان سے بات چیت کی معلوم ہوا وہ نہ تو اخبارات پڑھتے ہیں نہ سیاست سے آشنا ہیں اور نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ خلافت وغیرہ کا مسئلہ کیا ہے؟ آخر میری تحریک پر راضی ہو گئے کہ وہ میرے ساتھ رہ کر چند دنوں میں ان مسائل سے آگاہ ہو جائیں گے چنانچہ ایک مختصر سی مدت ہی میں وہ سب کچھ جان گئے پھر دنیا جانتی ہے کہ اس عظیم الشان خطیب نے سارے ملک میں آگ لگا دی''۔

شاہ جی فرماتے تھے مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' نے ان کی کایا پلٹ دی اور مولانا ظفر علی خان کے ''زمین دار و ستارۂ صبح'' نے انھیں حریت پسندوں کے قافلہ میں شامل کر دیا۔

یہاں لاہور کے ایک جلسۂ عام میں مولانا ظفر علی خاں کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا:

''ظفر علی خان ترے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی''۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک پنجاب کی سیاسی آبیاری اور ہندوستان کے قومی

ذہن کی نشو و نما میں جن راہ نُماؤں کا نام سرفہرست ہے ان سر برآوردہ راہ نُماؤں کی جماعت میں شاہ جی کی جادو بیانی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ اس وقت مہاتما گاندھی' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صف کے سیاسی راہ نُما نہ تھے۔ لیکن تحریک خلافت یا تحریکِ عدم تعاون کا تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی نے اس قومی جدوجہد کو بال و پر مہیا کیے اور دیکھتی آنکھوں ہندوستان کے ان نامور خطبا کی صف میں شامل ہو گئے جن کی رجز خوانیوں سے یہ کارواں منزل مقصود کی طرف چلا جا رہا تھا۔

مہاتما گاندھی نے قومی سیاست میں داخل ہوتے ہی ۶۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف ہمہ گیر ہڑتال کا اعلان کیا تو ایک نیا ہندوستان پیدا ہو گیا۔ یہی وہ دن تھے جب ہندو مسلم اتحاد ایک معجزہ تھا۔ اور انگریز اس سے سخت ہراساں تھے۔ انھی دنوں اُمرت سر میں ریلوے کے بڑے پُل سے ایک احتجاجی جلوس گزر رہا تھا کہ گورا سپاہیوں نے گولی چلا دی جس سے چھے ہندوستانی جاں بحق ہو گئے' شاہ جی نے خیر الدین کی مسجد میں مسلمان شہدا کا جنازہ پڑھایا۔ ۱۰۔ اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کیے گئے تو سارا شہر آگ بگولا ہو گیا۔ ۱۳۔ اپریل کو یکم بیساکھ تھا اُمرت سَر کے لوگ اپنے راہ نُماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے جلیاں والا باغ میں اکٹھے ہوئے لیکن جنرل ڈائر کی بے تحاشا گولیوں کا نشانہ بن گئے اس مقتل میں پانچ سو ہندوستانی شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بصدارت موتی لال نہرو اُمرت سر میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی حکیم اجمل خان کے زیر صدارت یہیں ہوا اور خلافت کانفرنس بھی مولانا شوکت علی کے زیر صدارت گول باغ اُمرت سَر میں منعقد ہوئی۔ شاہ جی نے اس کانفرنس میں معرکہ آرا سیاسی تقریر کی یہ ان کے جماعتی سفر کا آغاز تھا۔ اجلاس میں تحریکِ خلافت کے لیے دس لاکھ روپے اکٹھے ہو گئے' شاہ جی اُمرت سر سے باہر پہلی دفعہ کلکتہ کانگرس (فروری ۱۹۲۱ء) کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوئے اور وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز ترک موالات کی تائید میں

ایک پُر شکوہ تقریر کی اس سے ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صفِ اوّل کے ہندوستانی راہ نُماؤں میں شمار ہونے لگے۔

لاہور میں پہلی خلافت کمیٹی قائم کی گئی تو علامہ اقبالؒ اس کے صدر اور سر محمد شفیع سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن سر مائیکل اڈوائر کے غضب کی تاب نہ لا کر ڈپٹی کمشنر لاہور کے اشارے پر مستعفی ہو گئے بلکہ خلافت کمیٹی ہی کو ختم کر دیا۔ حکیم عبدالمجید عتیقی مولانا ثناءاللہ کے ہاں اُمرت سر پہنچے اور ان سے یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا ثناءاللہ نے ان کے ساتھ شاہ جی کو لاہور بھجوا دیا' جلسۂ عام کا اعلان ہوا تو خوف کا یہ عالم تھا کہ موچی دروازہ کے باغ میں تین چار سو آدمی جمع نہ ہو سکے لیکن شاہ جی کی قرآن خوانی اور خوش بیانی رنگ لائی' اگلے روز جلسہ میں ۲۰ ہزار آدمی شریک ہوئے اور شاہ جی صبح تین بجے تک بولتے رہے۔ تمام شہر کا مسحور ہو گئے۔ شاہ جی نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ لاہور میں خلافت کمیٹی ضرور بنے گی کسی حاطب اللیل میں ہمت ہے تو وہ اس کمیٹی کو توڑ کر دکھائے۔ چنانچہ شاہ محمد غوث سے متصل میاں سراج الدین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم کیا گیا اور وہیں عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کمیٹی کے صدر اور میاں فیروز الدین احمد سیکرٹری منتخب کیے گئے۔

سیاسی مسلک

یہ کہنا مشکل ہے کہ شاہ جی دیوبند کے مدرسہ فکر سے ذہناً کب وابستہ ہوئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے ان کی نظری وابستگی کا سنِ آغاز کیا تھا لیکن دیوبندی نہ ہونے کے باوجود ان کا دیوبند کے اکابر و افکار سے رشتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ ان کے مبلغ بھی تھے اور مجاہد بھی۔ عمر بھر انھوں نے اس مدرسہ فکر کا ساتھ دیا' کسی عنوان سے جب کوئی معرکہ دیوبند کے دفاع یا دعوت کا پیش آیا شاہ جی ہمیشہ اس کے ہراول میں رہے۔

شاہ جی نے بدعات سے جنگ کی تو دیوبند کی تعلیمات کو ملحوظ رکھا۔ سلطان ابن سعود کا

ساتھ دیا تو دیو بندہی کا مطمحِ نظر سامنے رکھا۔ انگریزوں سے ان کے جہاد و غزا کا سبب بھی دیو بندہی کے اکابر کا فکر و عمل تھا۔ وہ انگریزوں کے اس لیے مخالف نہیں تھے کہ ان کے پیشِ نظر محض نظریاتی مہم کا اصل اُصول تھا' ان کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا سبب یہ بھی تھا کہ برعظیم کے علما نے نصاریٰ کی ہر نوعی غلامی کو حرام قرار دیا اور ہندوستان ان کے نزدیک ''دارالحرب'' ہو گیا تھا' برطانیہ کو وہ اسلام کا دشمن سمجھتے اور اس کے خلاف جہاد و جنگ فی الجملہ ان کا نصب العین تھا۔

وہ دراصل شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جدوجہد کے سیاسی ورثا میں سے تھے۔ ان کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ تھا کہ جو کچھ ان اکابر کے منہ سے نکلا اس کی آبیاری و ثمر آوری اپنا دینی فرض سمجھا۔ انھیں ہندوستان کے سیاسی مباحث یا قومی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا وہ صرف اکابر علما کی سیاسی روایتوں اور دینی حکایتوں کے معنوی وارث تھے اور ان کے مطابق اپنی جدوجہد کا سفر کرتے رہے۔ ان کے سامنے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کا یہ فتویٰ (۱۷۶۵ء) تھا کہ:

''انگریزی حکومت سے جہاد فرض ہو چکا ہے اس کی توفیق نہ ہو تو ہر دین دار مسلمان پر ہجرت لازم ہو گئی ہے''۔ (بہ تلخیص)

مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنؤ نے اپریل ۱۹۱۵ء کو اس فتویٰ ہی کی اساس پر فتویٰ دیا تھا کہ:

''ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں کی قدریں اسلام سے ملحق ہوں''۔

اسی کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کی ہجرت تھی۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس دہلی کے اجلاس میں علامہ عزیز ہندی نے اس مضمون کی قرارداد پیش کی تو فوراً پاس ہو گئی' لوگوں نے ہجرت شروع کی اور لوگ قافلہ در قافلہ کابل جانے لگے حکومت نے ابتداءً روکنا چاہا لیکن مانتا کون؟ آناً فاناً کوئی چالیس ہزار افراد افغانستان پہنچ گئے۔

غازی امان اللہ نے انھیں زمینیں دیں' ملازمتیں دیں اور تجارت میں حصہ دار کیا لیکن جو لوگ سرکاری جاسوس کی حیثیت سے ان کے ساتھ گئے تھے وہ گُل کھلانے میں کام یاب ہو گئے انھوں نے امان اللہ خان کو بھی زچ کیا تاہم ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ افغانستان انگریزی حکومت کے اِستذاب سے آزاد ہو گیا۔ ہجرت کرنے والوں میں مولانا احمد علی لاہوری' خان عبدالغفار خان اور جناب اقبال شیدائی بھی شامل تھے۔

مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ ان دنوں لندن میں وفدِ خلافت لے کر گئے ہوئے تھے' یہاں مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا شوکت علی' ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ اس ہجرت کو مضر خیال کرتے اور ہندوستان ہی میں غیر ملکی غلامی کے خلاف نبرد آزمائی کے حق میں تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کراچی کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی ہر نوعی ملازمت کو شرعاً حرام قرار دیا تو اس قرارداد اور مختلف زعما کی تقریروں سے برافروختہ ہو کر حکومت نے ملک بھر میں گرفتاریوں کا آغاز کیا۔ مولانا محمد علی' مولانا حسین احمد مدنی' پیر غلام مجدد وغیرہم کراچی میں ۱۲۴۔ الف کے تحت دھر لیے گئے' انھیں دو دو اور تین تین برس کی سزا دی گئی۔

آخر کار منفی و مثبت اثرات کے تحت ہجرت کی تحریک ختم ہو گئی' کچھ لوگوں کے سوا تقریباً سبھی لوگ واپس آ گئے' اُن مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا جو اپنی جائدادیں اَونے پونے فروخت کر کے کابل گئے تھے' لاہور سے دو مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن بھی سرکاری جاسوس کی حیثیت سے مہاجروں کے ساتھ گئے تھے لیکن ان کا انجام یہ ہوا کہ دونوں حکومت کے ہاتھوں مارے گئے۔

شاہ جی تحریکِ ہجرت کے معاون تھے اور انھی کی تقریروں سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ اُمرت سر سے کابل گئے تھے۔

اُدھر حضرت شیخ الہند محمود حسن (علیہ الرحمتہ) اپنے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی

کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو جمعیۃ العلما نے شیخ الہند کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس زمانہ ہی میں شیخ الہند کے ہاتھوں جامعہ ملیہ دہلی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر جامعہ کے بانی تھے اور انھی کی تحریک پر جامعہ قائم ہوا تھا۔ ادھر شاہ جی نے انھی دنوں گجرات میں آزاد ہائی سکول قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے افتتاح کیا۔ چودھری فیض محمد ایم اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خان عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔ آج کل وہ اسلامیہ ہائی سکول کے نام سے منسوب ہے۔ آخر کار حکومت نے ۲۷۔ مارچ ۱۹۲۱ء کو آدھی رات کے وقت زیر دفعہ ۱۲۴۔الف شاہ جی کو پکڑ لیا۔ کچھ دنوں مقدمہ چلا پھر ۸۔ اپریل کو مسٹر ایف اے کارنر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی' اس میں تین ماہ قیدِ تنہائی کے تھے...... اس قید نے شاہ جی کو انگریزی حکومت کا مستقل باغی بنا دیا اور وہ ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کے بارہ بجے تک برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرتے رہے' ان ۲۶ سال میں انھوں نے آٹھ سے دس ہزار کے درمیان تقریریں کی ہوں گی جن کا لُبِ لباب اور مطلع و مقطع انگریزی حکومت کی بیخ کنی تھا۔

شاہ جی نے اس سارے عرصہ میں بہت سے معرکے سر کیے اور کئی دفعہ جیل گئے مثلاً تحریکِ خلافت' تحریکِ شدھی' تحریکِ قبہ' تحریکِ حفظ ناموس رسالت ﷺ تحریکِ میرزائیت تحریکِ عدم تعاون' تحریکِ کشمیر' تحریکِ شہید گنج' تحریکِ آزادیٔ وطن اور دوسری جنگِ عظیم میں فوجی بھرتی کی مزاحمت! فی الجملہ قومی جدوجہد' سیاسی رزم و بزم اور دینی جہاد و جنگ کے مختلف العنوان سلسلے تھے جن میں شاہ جی نے بھرپور حصہ لیا۔ وہ محض حصہ دار ہی نہیں تھے بلکہ ان کا پورا کردار ایک ایسے حدی خوان کا تھا جس کی آواز سے قافلہ مرتب ہوتا اور منزل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ یہ ذکر کسی دوسرے باب میں آئے گا کہ اس سفر میں وہ کن کن صعوبتوں سے گزرے اور اپنی عمرِ عزیز کا کتنا حصہ قید و بند کے آغوش میں بسر کیا حتّٰی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عقیدہ و مسلک

شاہ جی حنفی مسلک کے تھے لیکن ان حدود کے باوجود قلندر قسم کے مسلمان تھے کہ ہر مسلک و مشرب سے یک گونہ مناسبت تھی؛ کسی مسلک سے تعرض ہوتا تو اس کے پس منظر میں صرف یہ چیز ہوتی کہ اس کی بنیاد میں انگریز دوستی تو نہیں ہے یا پھر وہ ان مظاہر و آثار کے مخالف تھے جن سے شرک فی التوحید یا شرک فی النبوۃ کو راستہ ملتا تھا اور لوگ اصل دین کو چھوڑ کر نقلی دین کا کھڑاگ رچاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ از روئے اسلام وہ ہر اُس مسلک و مشرب کے ساتھ تھے جس سے انگریزوں کی غلامی ختم ہوتی اور ان کے خلاف ذہنی آب و ہوا کو نشو و بلوغ حاصل ہوتا اور ہر اس مسلک و مشرب سے کنّی کتراتے بلکہ اس کے پیرووں پر بشرط ضرورت تابڑ توڑ حملے کرتے جس مسلک و مشرب کو مداہنت و مصلحت سے داغ دار پاتے۔

انھوں نے شہادتِ حسینؓ پر بہت کم تقریریں کیں؛ ایک دفعہ راقم نے عرض کیا کہ شاہ جی سانحہ کربلا پر تقریر فرمایئے کہنے لگے میں اس موضوع پر تقریر نہیں کرسکتا میرے خاندان پر جو بیتی ہے بیان کروں تو خود میرا جگر شق ہو جائے گا لیکن عام تقریروں میں جب کبھی اس حادثہ محزنہ کا ذکر کرتے تو ایک آدھ روایت ہی سے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں کہ بڑے بڑے ذاکر و مجتہد ان کے سامنے رہ جاتے تھے۔ ان کا مسلک سینہ کوبی یا سوز خوانی نہیں تھا۔ جب کبھی کسی سیاسی مسئلہ میں شیعہ اکابر کو جھنجھوڑتے تو فرماتے:

کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ حسینؓ کا نام لیتے ہو لیکن صدیوں سے تمھارا شعار یہ ہو گیا ہے کہ یزید مُردہ پر لعن کرتے ہو اور یزید زندہ کی پوجا کرتے ہو؟''

بدعات کے خلاف طعن و تعریض کرتے اور مسلمانوں کو ان سے روکتے تو دُکان دار علما ان پر وہابی کا طعن توڑتے، لیکن ان کے لیے یہ طعن بے کار تھا۔ جن دنوں ابنِ سعود نے قُبہ شکنی کی

اور سرکاری علما نے ہندوستان میں ابنِ سعود کے خلاف ہنگامہ برپا کیا تو شاہ جی ابن سعود کے طرف دار تھے اس جرم میں انھیں وہابی کہا گیا حالانکہ وہابی نہ تھے اور نہ کبھی جماعتِ اہل حدیث نے اپنی کسی تحریر و تاریخ میں انھیں اپنا تسلیم کیا لیکن ہندوستان کے اہل حدیث علما کی سزا اکثر انھیں ملی، جگہ جگہ شاہ جی کے وہابی ہونے کا چرچا ہو گیا۔ ان دنوں کسی بدو نے سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو بیت اللہ میں خنجر مار کر ہلاک کرنا چاہا، محافظ دستہ آڑے آ گیا اور سلطان محفوظ ہو گئے لیکن حملہ آور محافظ کی گولی سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شاہ جی ابن سعود ہی کے مسئلہ پر تقریر کر رہے تھے سوال کیا گیا،

شاہ جی! حرم میں گولی چلانا جائز ہے؟

فرمایا، نہیں بھائی خنجر چلانا جائز ہے۔

اور لوگ داد و تحسین میں ڈوب گئے۔

غرض شاہ جی ہنستے ہنساتے بہت سی باتیں کہ جاتے، کسی نے کہا:

شاہ جی وہابی اور غیر وہابی میں کیا فرق ہے؟

فرمایا اس قسم کے سوال نہ کیا کرو، دین کی توقیر کم ہوتی ہے، سائل کا اصرار بڑھا تو کہنے لگے، میاں! جو تم کہلوانا چاہتے ہو وہ یہ ہے کہ وہابی بے ادب باایمان ہوتا ہے اور غیر وہابی باادب بے ایمان۔

ظاہر ہے کہ یہ مذاق تھا جو لوگ اس قسم کے شرارتی سوال کرتے ان کے لیے ایسے ہی جواب شافی ہوتے تھے۔

ایک روز شاہ جی علامہ انور صابری سے قوالی سُن رہے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن آ گئے، لاحول پڑھا، شاہ جی نے اِنَّا لِلّٰہِ فرمایا، بھائی حبیب الرحمٰن! مذہب کسی یبوست کا نام نہیں، میں چشتی بھی ہوں، نقشبندی بھی اور قادری بھی، مجھے ان تمام مسالک سے باطنی ربط ہے۔

شاہ جی روایتی طور پر صوفی بالکل نہیں تھے لیکن زندگی سنوارنے کے لیے شیخ کی صحبت ضروری سمجھتے، ان کے نزدیک تصوف، مسکینی و عاجزی یا گوشہ نشینی و دست برداری کا نام نہیں تھا۔ وہ

تصوف کو احسان سے تعبیر کرتے اور احسان رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایک ایسی عبادت ہے گویا خدا تمھیں دیکھ رہا ہے یا تمھارا یہ سمجھنا کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے' شاہ جی عموماً کہا کرتے کہ نظر کا فیضان کتابوں سے نہیں بزرگوں کی صحبت اور توجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہی اصل تصوف ہے' جن چیزوں کو معروفات سمجھتے ان کے نزدیک وُہ علم الیقین اور عین الیقین ہی نہیں بلکہ حق الیقین کا درجہ رکھتی تھیں۔ فرماتے تصوف' وجدان کی تنقیح کرتا ہے اور علم سے وسعتِ فکر پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں امام مالک کے نقطہ نگاہ سے موافق تھے کہ جو شخص صوفی ہُوا اور فقیہ نہ ہوا وہ گُم راہ ہوا' اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے صوفیوں کی بہت سی ٹکڑیوں سے بیزار تھے ان کا خیال ہی نہیں' تجربہ تھا کہ ہندوستان کا تصوف ہندو مائی تھالوجی (خرافیات) کی اسلامی شکل ہے اسے کو حجازی اسلام سے کوئی واسطہ نہیں' جس تصوف سے مسکنت پیدا ہو یا توجہ الی اللہ مخلوقِ خدا سے کنارہ کشی سکھائے وہ اس مسلک سے بیزار تھے ان کے نزدیک یہ ہندوازم کا جوگ تھا۔

فرمایا ایک دفعہ میں نے بھی خانقاہی ہونا چاہا' ۲۱۔ سال تک روزے رکھے چھے چھے گھنٹے میں قرآن پاک ختم کیا' کئی کئی روز پانی مین نمک ملا کر جو کے ستوؤں پر گزر کی' تنور کی روٹی کے خستہ ٹکڑے کھاتا رہا لیکن اس سے بس اتنی معرفت قلب پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں قناعت پیدا کر دی اور مَیں سیر چشم ہو گیا اس ریاضت ہی کا نتیجہ میری خطابت کا بانکپن تھا۔

قُبہ شکنی کا ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے مَیں نے ابنِ سعود کی حمایت صرف اس لیے کی تھی کہ جو لوگ یہاں ان کی مخالفت میں پیش پیش ہیں وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مہرے تھے اور ابنِ سعود کا وجود برطانوی حکومت کے لیے اس لحاظ سے سوہانِ رُوح تھا کہ اس نے انگریزی استعمار کے ایک ذلیل مہرے شریف مکّہ کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ شاہ جی کا ارشاد تھا کہ ہندوستان میں وہی لوگ ابنِ سعود کے خلاف واویلا کر رہے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے خدمت گار اور سپاس گزار تھے۔ (اِلّا ماشاء اللہ) ان کے نزدیک ابن سعود کے خلاف

ہندوستان کے مسلمانوں کا ہنگامہ انگریزوں کی شاطری تھا۔ انگریزوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ تحریکِ خلافت ان کے لیے کیا داغ چھوڑ گئی ہے اور مسلمانوں کی دُنیائے اسلام سے وابستگی کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو شریف مکہ سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی انگریز اپنے اس مہرے کی شکست کے بعد اس نفرت کو ابنِ سعود کی طرف منتقل کرنا چاہتے تھے تاکہ حجاز میں انگریزوں کی آئندہ سیاست ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کسی نئی تحریک کا باعث نہ ہو۔

شاہ جی نے اس مہم میں ضعیف الخیال مسلمانوں سے بہت سی گالیاں سنیں لیکن اپنا مشن جاری رکھا۔ اور کفر کے فتووں کو خندۂ زیرِ لب کی نذر کرتے رہے، جیسے کوئی چیز ہی نہیں۔

شاہ جی اصلح من الناس کے قائل تھے، حضرت سید پیر مہر علی شاہؒ گولڑہ شریف سے بیعت ارشاد کی، حضرت شیخ عبدالقادرؒ رائے پوری سے بیعت جہاد، وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیا، اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے والہ و شیدا تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شیدائی اور شاہ ولی اللہ کے فدائی تھے۔ حقیقتاً وہ ایک سیدھے سادے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کے ہاں مذہب کی رعونت اور دین کا آزار بالکل نہ تھا، غرض فقر و سیاست کا ایک ایسا چشمہ تھے جس سے کئی سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ اہل اللہ کے سوا کسی سے مرعوب نہ ہوتے، قدرت سے بے نیاز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے اور آخری سانس تک اس پر قائم رہے کوئی شخص اپنے اقتدار و وجاہت کے بل پر ان سے کوئی مطالبہ نہ کر سکتا تھا۔

ان کی محفل آرائیاں سیکڑوں مرتب و غیر مرتب کتابوں کا خلاصہ ہوتیں، ان کے ہاں کسی کے لیے کوئی روک نہ تھی وہ انگریزی استعمار اور میرزا غلام احمد کی نبوت کے سوا کسی کے دشمن نہ تھے ان کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا۔ جہاں ایک جام بدست رند سے لے کر ایک عمامہ بر سر زاہد تک اور ایک کفن بدوش مجاہد سے لے کر ایک شاہد بکنار شاعر تک بلا تکلف داخل ہو سکتے تھے۔ وہ تنہائی سے نفرت کرتے اور آشنائی سے محبت رکھتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ تنہائی کے آگے بازار ہے اور بازار پریشانی کا نام ہے لیکن وہ کانٹوں میں کھلنے والے انسان تھے، انھیں تخلیہ سے

زیادہ مجمع اور کتابوں سے زیادہ انسانوں کا غول پسند تھا' فرماتے ان کتابوں کو پڑھ کر کیا لوں گا؟ جن سے عقل ویران ہوتی اور عشق کو مصلحت کی دیمک لگ جاتی ہے' اپنے احباب میں اکثر وبیش تر ذیل کا شعر بہ لحن پڑھا کرتے۔

بیا کہ رونق ایں کار خانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئے یا زفسق ہمچو منے

اٹکاؤ اور لگاؤ

ان کی سب سے بڑی کم زوری (Weekness) حُسن تھا' حُسن کے معاملے میں ''دل پھینک'' واقع ہوئے تھے یہاں ان کا مسلک بو علی قلندر کا مسلک تھا حسن آواز میں ہو یا چہرے میں' پہاڑوں پہ ہو یا میدانوں میں غرض کہ فطری حسن سے والہانہ لگاؤ تھا انھی کا شعر ہے۔

باغ و بہار ما ندیم یعنی کہ جنت النعیم
روئے خوش است خوئے خوش بوئے خوش وگلوئے خوش

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم ومغفور آزادئ ہندوستان کی جدوجہد میں ان کے رفیق تھے' ان سے جو خصوصیت رہی واقفان حال سے پوشیدہ نہیں' اکثر کہا کرتے ''میں بلھے شاہ ہوں اور حبیب الرحمٰن عنایت آرائیں''...... لیکن پیر ومرید دونوں ایک دوسرے کی ضِد تھے' وہ جلالی یہ جمالی' جلالی نے جمالی کو ٹوکا شاہ صاحب کیا بزم جما رکھی ہے؟ فضول' بے معنیٰ' لغو' مگر شاہ جی فضول' بے معنیٰ' لغو پر ریجھ چکے تھے اب انھیں لاکھ کہیئے' قبلہ! جلسہ گاہ میں ہزاروں لوگ امیرِ شریعت کی راہ دیکھ رہے ہیں لیکن امیرِ شریعت گردوپیش کے حُسن پر نقد ونظر فرما رہے اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کے نقد ونظر کی زبان غالبؔ سے لے کر نظیریؔ تک اور میرؔ سے لے کر عرفیؔ تک سے مستعار ہوتی۔ ان مواقع پر خود آواز بن جاتے' طبیعت موج زن ہوتی تو عربی شعرا کا بھرپور کلام سنانے لگتے' کسی مصرع کی شرح کر دی' کسی مصرع پر چپ سادھ لی' بسا

اوقات اچھے چہروں سے موضوع ڈھونڈ لیتے اور قرآن و حدیث سے استنباط کرتے۔

التمسوا الخیر فی حسان الوجوہ (الحدیث)

اچھے چہروں میں بھلائی کی جستجو کرو۔

اس ضمن میں ان کی معلومات حد درجہ وسیع تھیں' آخری عمر میں آواز کا رسیلا پن کسی قدر بہہ گیا تھا لیکن لٹک اور کھٹک موت کے بستر پر دراز ہونے تک رہی۔ عمدہ عطر اور اچھی آواز پر جی جان سے مرتے تھے۔ کوئی خوش الحان قاری ملتا تو پہروں قرآن سنتے اور مغنی ہوتا تو شعر و شاعری میں جہاں تک بس چلے ڈوب جاتے۔

شاعری کا شوق

خطیب معناً شاعر ہوتا ہے انھیں شعر گوئی کا ملکہ بھی تھا۔ ندیم تخلص فرماتے' ان کا مجموعہ کلام "سواطع الالہام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کے مطابق شعر گوئی کا ذوق شروع میں نانا مرحوم اور شاد عظیم آبادی کی صحبتوں سے پیدا ہوا لیکن امرت سر میں مولانا محمد دین غریب سے تلمذ اختیار کیا مگر جلد ہی پنڈ چھوڑ دیا۔ تحریک خلافت میں قید ہوئے تو میاں والی جیل میں ملکہ شعر جاگ اُٹھا۔ مولانا عبدالمجید سالک بھی ساتھ ہی قید میں تھے ان سے مشورۂ سخن شروع کیا۔ پھر حضرت طالوت سے استفادہ فرماتے رہے۔ کوئی باقاعدہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری باقاعدہ تھی۔ بس جذبات کا ایک اُبال تھا۔ اس مجموعہ میں دو چار نعتیں ایسی ضرور ہیں جن میں شعری بانکپن جھلکتا ہے' طبیعت کی موزونی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ساحر لدھیانوی نے قحطِ بنگال پر جو نظم لکھی ہے اس کے ایک بند کا دوسرا شعر نہیں ہو رہا تھا' شاہ جی نے نظم پڑھی' تعریف کی' ساحر سے کہا:

"اس کا صلہ یہ چند آنسو ہیں انھیں فقیر کا نذرانہ سمجھو"۔

شاعر نے تشکر و امتنان میں سر جھکا لیا' شاہ جی نے پوچھا اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے' وہ شعر تھا۔

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں
کہ دُخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

ساحر نے کہا ابھی تک کوئی مُناسب شعر موزوں نہیں ہو سکا' شاہ جی نے قدرے توقف کیا پھر فرمایا یہ لو حاضر ہے۔

چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

اور ساحر نے قبول کر لیا' ان کے مجموعہ کلام ''تلخیاں'' میں شامل ہے۔

مُطالعہ

شاہ جی اصطلاحاً کتابی نہ تھے' ابتدائی مطالعہ ہی سے سیر تھے ان کے غور و فکر کا اصل محور قرآن مجید تھا جب کبھی تنہا ہوتے پڑھتے' سوچتے اور سر دھنتے' کوئی اچھی کتاب بالخصوص دینیات یا اسلامیات پر مل جاتی تو بڑے انہماک سے پڑھتے۔ تاریخ سے یک گونہ دلچسپی تھی لیکن سیاسی تاریخ سے خصوصی بُغض تھا' کلام ہر شاعر کا دیکھتے اور اس کی داد بھی دیتے' کوئی باقاعدہ لائبریری نہ تھی۔ اُمرت سر میں بعض نادر کتابیں اسلامیات پر جمع کی تھیں جن میں ''الہلال'' کے فائل وغیرہ بھی تھے مگر اُمرت سر لٹا تو وہ بھی غارت ہو گئیں۔ میرزائیت کے لٹریچر کو اپنی تبلیغی مہم کے لیے انتقادی نقطہ نگاہ سے دیکھتے اور پرکھتے' اخبار مستقلاً پڑھتے۔ بعض اخبارات کو ہاتھ تک نہ لگاتے کیوں کہ ان پرچوں کی بجائے ان کے پرچہ نویسوں کو پڑھ چکے تھے' جدید لٹریچر سے انھیں کوئی واسطہ نہ رہا۔ بالخصوص کہانی' ناول اور افسانہ سے کوئی ربط نہ تھا۔ جدید شاعری میں نظم آزاد اور نظم معرّا کو نہ صرف مضحک خیال کرتے بلکہ بعض معرّا ابیات کی پیروڈی کی۔ جس کتاب کو اپنے نقطۂ نگاہ سے مفید سمجھا اس کے لیے اشتہار بن گئے۔ ایک زمانہ میں سید محمد طفیل منگلوری کی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' کا مطالعہ ہر سیاسی کارکن پر فرض کر دیا' مدتوں علامہ اقبالؒ کا کلام

ساتھ رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابی مطالعہ بہت تھوڑا اور انسانی بہت زیادہ تھا' فرماتے' جس زمانہ میں پڑھتا تھا تو شب و روز پڑھتا تھا اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بہت سی کتابوں کے پڑھنے سے چند کام کی کتابیں پڑھ لینا بہتر ہے۔

تفریحات

کسی کھیل سے کوئی رغبت نہ تھی۔ تفریحات میں یک سر کورے تھے ان کی واحد تفریح محفل آرائیاں تھیں کبھی موج میں ہوتے تو گفتگو کے بہاؤ میں بعض باتیں کہ جاتے' مثلاً جھٹپنے میں پتنگ بازی کا شوق تھا' اسی باعث گڈی کے کاغذ سے لے کر ڈور کی نسل تک سے باخبر تھے۔

ایک زمانہ میں کبوتر پالنے کا شوق تھا اور امرت سر میں کبوتروں کی ٹکڑی رکھتے تھے ہر کبوتر کا حسب نسب' رنگ روغن اور چال ڈھال جانتے تھے۔

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

فرماتے' گولے اور گرہ باز اڑان کبوتروں میں جواب نہیں رکھتے۔ گرہ باز کابل سے لائے گئے اور گولے عربی نسل سے ہیں لیکن ہندوستان میں ترکستان اور ایران سے درآمد کیے گئے تھے' ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک وقت میں دو سو کی ٹکڑی بنا کر اُڑ سکتے ہیں۔ گرہ باز دس بارہ کی ٹکڑی سے زائد میں نہیں اُڑتے لیکن صبح سے شام تک اڑتے ہیں' اپنے آقا اور اڈے کو کبھی نہیں بھولتے' جن کبوتروں کو خوش رنگی اور خوب صورتی میں شہرت حاصل ہے ان میں شیرازی گلی' نساوری' گلوے' لقے' لوٹن' چویا' چندن اور یاہو' فقر اور مشائخ کو عزیز ہیں' یاہو عموماً اہل اللہ کے مزاروں پر ہوتے ہیں۔

بٹیر بازی کو شرفا کا کھیل نہیں سمجھتے تھے مگر ان کی دو قسموں گھاگس اور چننگ کو برطانوی نمک خواروں کے خلاف پھبتی کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلنے کا شوق تھا جو رفتہ رفتہ محو ہو گیا۔ جوان تھے تو مگدر ہلاتے اور بنوٹ کھیلتے تھے۔ جیل خانے میں بیڈمنٹن

سیکھی تھی' آخر ہر کھیل سے جی بھر گیا تو مُرغ پالنے لگے' آٹے کی گولیاں بناتے اور مرغوں کو کھلاتے' اصیل مرغ کے بڑے قدردان تھے کہ عربی نسل سے ہے' میدان میں جم کر لڑتا ہے' کوئی جانور اس سے بڑھ کر بہادر نہیں' مر جاتا ہے لیکن میدان سے منہ نہیں موڑتا۔

لباس و خوراک

تمام عمر موٹا جھوٹا پہنا۔ کھدر کبھی ترک نہیں کیا' پہلے شلوار کُرتہ پہنتے اور سر پر رنگ دار تولیا کی خود ساختہ ٹوپی اوڑھتے تھے پھر شلوار کی جگہ تہ بند نے لے لی اکثر خاکستری کُرتہ یا قمیص جس کے اندر ترچھی جیبیں ہوتیں پہنتے تھے۔ ایک زمانہ میں سرخ قمیص پہننا شروع کی تو بعض شرعی گوشوں نے لب بستہ اعتراض کیا۔ فرمایا قصہ خوانی بازار (پشاور) کے شہیدوں کی یاد میں قمیص سُرخ کی ہے احرار رضا کاروں کی وردی کا رنگ بھی انھی کے خون کی یاد میں سُرخ تھا۔

خوراک عموماً سادہ کھاتے' محلوں اور جھونپڑوں میں مہمان ہوتے لیکن کسی چیز سے کوئی رغبت نہ تھی۔ دال بھات جو ملا کھا لیا۔ ایک وقت میں کئی کئی کھانوں کا سوال ہی نہ تھا بس ایک سالن روٹی یا چاول' میٹھا ملا کھا لیا نہ ملا شکر پھانک لی' خوراک زیادہ نہ کھاتے لیکن سیر ہو کر کھاتے اور دو وقت کھاتے' چائے گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ہمیشہ نفیس چائے پیتے اور اکثر خود بنا کر پیتے' مدتوں کیتلی اور تام چینی کا آب خورہ ساتھ رکھا' ان کے خیال میں ہر شخص چائے بنانے اور چائے پینے کا اہل نہ تھا' فرماتے عام لوگ چائے نہیں جوشاندہ پیتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح انھیں بھی چائے کی کہانی یاد تھی۔ طبیعت حاضر ہو تو مزے سے بیان کرتے' پان شروع سے کھاتے تھے' ایک چھوٹا سا پان دان ساتھ رکھتے' چھالیا خود کاٹتے' چونا خود بناتے اور کتھا بھی خود پکاتے تھے' اس پان خوری میں دانت گلا دیئے تھے۔

عادات و خصائل

کبھی کسی دوست کی غیبت نہ کی اور نہ کسی دوست کی غیبت سنتے تھے۔ جو لوگ ان سے

شدید اختلاف رکھتے مگر مخلص تھے ان کی جی جان سے عزت کرتے اور آنکھوں پر بٹھاتے۔ ذاتی دوستوں میں کئی ایسے تھے جن کی سیاسی راہیں مختلف تھیں۔ مثلاً تاثیر مرحوم لیکن ان سے یک گونہ تعلق خاطر تھا۔ اسی طرح مولانا عبدالمجید سالکؔ، سید احمد شاہ بخاری (پطرس) اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا میدان فکر و نظر مختلف تھا لیکن ان سے سال ہا سال کی دوستی تھی۔ ایک دفعہ جنھیں کو پرکھ لیا، پرکھ لیا۔ پسند و ناپسند دونوں میں سخت تھے، ہر شخص سے متعلق نپی تلی رائے ہوتی، ہندوستان میں کوئی سیاسی یا شرعی راہ نُما ایسا نہ تھا جن سے ان کے مراسم نہ رہے ہوں لیکن ہر ایک کے بارے میں دو ٹوک رائے رکھتے اگر کسی کے خلاف رائے قائم ہو گئی تو اس میں کینہ یا بغض نام کو نہ ہوتا اور نہ کسی سے ذاتی بنیادوں پر منتقم ہوتے۔ جن رُفقا پر اعتماد کیا ان کی غلطیوں پر دامن ڈال دیتے۔ جن دوستوں میں عمر بسر کی اُنھیں جی جان سے چاہا۔ ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو مسکرا کر ٹال گئے۔ بعض بڑی ہستیوں کے متعلق عجیب و غریب رائے تھی، گاندھی جی کو مہاتما کم اور سیاست دان زیادہ سمجھتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کو سچا نیشنلسٹ مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو پکّا ہندو، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا سمندر، پنڈت جواہر لال نہرو کو سیاسی طوفان، مولانا حسین احمد مدنی کو متحرک تقویٰ اور مفتی کفایت اللہ مرحوم کو دورِ حاضر کا ابو حنیفہ سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال سے تا زیست دلی تعلق رہا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو حضرت علامہ تپاک سے ملتے، فرماتے۔

"پیر جی فُلاں بات ہو گئی ہے"۔

"کون سی بات؟"

"بس ہو گئی ہے، آپ سے بیان کیا تو آپ دہلی دروازہ کے باغ میں ڈونڈی پیٹ دو گے؟ اچھا سُنیئے، ایک تازہ نظم ہوئی ہے"۔

علامہ سناتے، شاہ جی سُنتے اور جھومتے، چودھری افضل حق مرحوم کو احرار کے مہاتما کا لقب دے رکھا تھا۔

"کہو مہاتما جی، ہمارے لیے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟"

مولانا حبیب الرحمٰن کو عنایت ارائیں کہتے اور خود بگھے شاہ بنتے۔ میاں قمر الدین مرحوم احرار کے برلا تھے' انھیں اپنا چلتا پھرتا بینک کہہ کر پکارتے' شیخ حسام الدین سے انتہائی انس تھا' مولانا مظہر علی کو یار جانی سمجھتے رہے' قاضی احسان احمد کو بیٹا۔ جماعت کے جن ساتھیوں سے اُنھیں لگاؤ تھا ان میں مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا تاج محمود لائل پوری غایت درجہ قریب تھے۔ فی الجملہ احرار کا ایک ایک ساتھی اور ایک ایک رضا کار انھیں یکساں جذبات کے ساتھ عزیز تھا اور ان سب کو اپنی متاع سمجھتے تھے۔

ڈنڈے والا پیر

پنجاب کے دیہات میں ''ڈنڈے والا پیر'' کے نام سے مشہور تھے' احرار رضا کار کلہاڑی رکھنے لگے تو اُنھوں نے کلہاڑی اُٹھالی' کئی سال تلوار لیے پھرے' آخری عمر میں ڈنڈا رکھتے تھے۔

خط و کتابت

لکھنے لکھانے کا شوق کبھی نہ تھا۔ البتہ خطوط کا جواب سفر و حضر دونوں صورتوں میں خود لکھتے' غیر ضروری خط و کتابت سے اجتناب کرتے کسی کو تہدید یا تعزیت کا خط نہیں لکھتے تھے' کوئی عزیز رحلت کر گیا تو گھر میں بیٹھ کر افسوس کر لیا کسی دوست کے ہاں خوشی ہوئی تو دعا فرمادی۔

مجموعۂ صفات

زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں حضور سرور کائنات ﷺ کی حدیثیں اور آئمہ کبار کے حالات اکٹھے کیے۔ ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں اتنے مشاق تھے کہ سارے برعظیم میں ان کی ٹکر کا ایک آدمی نہ تھا۔ ہر علاقہ کے عادات و اخلاق

اور زبان وکلام سے اس تبحّر کے ساتھ واقف تھے کہ انھیں پاکستانی زبانوں کا چلتا پھرتا لُغت کہنا بے جا نہ تھا۔ سب سے بڑا کمال ان کی بے نیازی تھی' خوفِ غیراللہ چمڑی میں نہ تھا۔ کسی کے روپے کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ذاتی مریدوں میں رنگارنگ کے لوگ شامل تھے۔ بالخصوص ایسے لوگ جو قومی سیاست سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ بہت سے لوگ آپ کو پیروں بلکہ قبروں کی طرح پوجتے۔ پنجاب میں جتنے شخصی جاں نثار پیدا کیے اتنے کسی اور گروہ' جماعت یا فرد کے گرد کبھی جمع نہیں ہوئے۔ اس باب میں منفرد تھے۔ لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حکومت کی لیکن کسی شخص سے کوئی غرض نہ رکھی۔ ایک درویشانہ زندگی تھی' کسی مرید نے چھپا کر کچھ نذر گزارنا چاہا تو فوراً مُٹھی کھول دیتے' جس جماعت میں رہے اس سے کبھی پھوٹی کوڑی تک نہ لی۔ الٹا اسی کے لیے روپیہ فراہم کیا۔ زندگی بھر جو کمایا اس سے اُمرت سر میں دو مکان خرید کیے۔ ایک میں خود رہتے دوسرا کرایہ پر دے رکھا تھا' لیکن تقسیم کے وقت دونوں متروکہ ہو گئے۔ یہاں آ کر کسی سرکاری دفتر سے کوئی آرزو نہیں کی حتّٰی کہ متروکہ جائداد کے کلیم بھی داخل نہ کیے۔

عجیب وغریب

ان کے پاس ایک عجیب وغریب بٹوا تھا جس میں ایک مجذوب کی دی ہوئی پائیاں اور دھیلے پڑے تھے' فرماتے ان کی برکت سے ان کا بٹوا کبھی خالی نہیں رہا۔ ان معاملوں میں وہ خود بھی ایک مجذوب تھے۔

قاتلانہ حملے

قید و بند کی روداد تو علیحدہ باب میں آئے گی لیکن غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد کا سفر معمولی نہ تھا۔ قید و بند کے علاوہ بھی' اس میں دو چار بہت سخت مقام آئے تھے' انگریزی حکومت نے تحریکِ خلافت کے تجربہ و مشاہدہ سے خوف زدہ ہو کر ہندو مسلم مناقشہ کی ایک ایسی

نیو اٹھائی کہ سرکار کے مسلمان زلہ رباؤں نے نہ صرف اس فتنہ کو مستقل کر دیا بلکہ ان تمام مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کی داغ بیل ڈالی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بنیاد سمجھتے اور انگریزی حکومت کے خلاف ہر نوعی جہاد میں شریک تھے۔ ظاہر ہے اس قسم کے پروپیگنڈے سے اشتعال پیدا ہوتا اور لوگ مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں اور زیادہ غصہ وغضب اپنوں ہی کے خلاف ہوتا ہے۔ ملک کے مختلف شہروں میں شاہ جی پر کئی دفعہ قاتلانہ حملے ہوئے اور وہ بفضل تعالیٰ ہر دفعہ بچ گئے' پہلا حملہ نمکین ستیہ گرہ کی تحریک کے دنوں آگرہ میں ہوا' وہاں قصابوں نے رات بھر شور مچائے رکھا کہ ہم جلسہ نہیں ہونے دیں گے اور فجر کی اذان تک یہی عالم رہا۔ اُدھر قصابوں کے پاس چھریاں اور کلہاڑیاں تھیں ادھر شاہ جی ڈٹے ہوئے تھے' آخر فسادیوں کو جانا پڑا اور شاہ جی نے صبح کی نماز سے ۹ بجے دن تک تقریر کی' اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں شاہ جی نے عمر بھر برداشت کیں' بالخصوص نہرو رپورٹ سے لے کر شہید گنج کی تحریک تک اور شہید گنج کی تحریک سے لے کر تحریک پاکستان تک وہ انھی طوفانوں سے گزرتے رہے' اکثر دفعہ قاتلوں سے واسطہ پڑا لیکن قدرت دست گیری کرتی رہی اور وہ ہر معرکہ سے سُرخ رُو نکلے۔ ان پر ایک سخت قسم کا وار بمبئی میں ہوا ایک جانب سے تیزاب میں بجھی ہوئی تیز دھار کی چھری مجمع کے سروں سے نکلتی ہوئی ان کے سینہ میں پیوست ہوا چاہتی تھی کہ کوہاٹ کے ایک ۲۱ سالہ نوجوان نور خان نے پُھرتی سے بڑھ کر سینہ پر اُٹھالی نتیجۃً وہ نوجوان اس کے مہلک وار سے انتقال کر گیا۔

مئی ۱۹۳۳ء میں شاہ جی مدرسہ عربیہ شجاع آباد میں مدعو تھے وہاں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو قاضی احسان احمد سے فرمائش کی' پان نہیں کھلاؤ گے؟ ایک صاحب پاس کھڑے تھے انھوں نے پان پیش کیا اور چلے گئے۔ شاہ جی نے پان کو منہ میں رکھا تو چلا اُٹھے ''زہر دے دیا ہے''۔

فوراً تھوکا' چہرے کا رنگ سیاہ ہو گیا' ڈاکٹر لچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن رات تین بجے تک زہر نکالنے میں کام یاب ہو گئے اور اس طرح موت کا وار ناکام ہو گیا۔

میرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے بہت سے لوگ ان کے قتل پر مامور کیے لیکن کسی

کو کبھی حوصلہ نہ ہوا' آخر میرزا صاحب نے رجندر سنگھ آتش نام کے ایک سکھ نوجوان کو دس ہزار روپے میں خرید کیا۔ پانچ ہزار پیشگی ادا کیے پانچ ہزار بعد از قتل دینے کا وعدہ کیا لیکن راجندر سنگھ آتش نے شاہ جی پر اس راز کا انکشاف کر دیا' دوسری جنگِ عظیم میں راجندر سنگھ آتش منٹگمری سنٹرل جیل میں راقم کے ساتھ قید تھا ''پسِ دیوارِ زنداں'' میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

شاہ جی کو زہر کھلانے کی کئی دفعہ کوشش کی گئی جن لوگوں کو مامور کیا جاتا وہ شاہ جی کے چہرے مہرے سے اتنے مرعوب ہوتے کہ ارادہ توڑ ڈالتے یا انکشاف کر دیتے۔ انھی واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض زندگیاں قدرت کی طرف سے معجزہ ہوتی ہیں جب تک اپنی طبعی زندگی گزار نہ لیں موت ان سے بھاگتی ہے اور کوئی سی تلوار یا سازش ان پر کامیاب نہیں ہوتی۔

اولاد

شاہ جی کے نو بچے تھے' چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں' سب سے بڑی اولاد سیدہ صفیہ خدیجہ تھیں جو ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں۔ اُس وقت شاہ جی میانوالی جیل میں تین سال قید گزار رہے تھے اس بچی کا سوا مہینا ہی میں انتقال ہو گیا۔ دوسری بچی سیدہ صالحہ بانو ایک برس کی عمر پا کر رحلت کر گئی' تیسری سیدہ اُمِ کلثوم سوا سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئی۔ شاہ جی ان دنوں دیناج پور جیل میں چھ ماہ قید گزار رہے تھے سب سے چھوٹی سیدہ سائمہ پونے دو برس کی ہو کر ۱۹۴۸ء میں لقمہ اجل ہو گئی ان دنوں شاہ جی خان گڑھ میں نواب زادہ نصر اللہ خان کے ہاں مہاجرت کے دن گزار رہے تھے' پانچویں بیٹی سیدہ صادقہ بانو چار بھائیوں کی عابدہ بہن ہیں۔ ان کے میاں سید وکیل شاہ کسی کالج میں تاریخ کے استاد ہیں' غایت درجہ متقی' صالح' فاضل نیک سرشت اور نیک نہاد!

سب سے بڑے صاحب زادے سید عطاء المنعم (ابوذر بخاری) مدرسہ خیر المدارس کے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل ملتان میں خود ایک عربی مدرسہ چلا رہے ہیں' باقی تین بیٹے سید عطاء المحسن' سید عطاء المہمن اور سید عطاء المومن باپ نہیں تو باپ کا عکس ضرور ہیں۔ تینوں عربی مدرسوں کے

فارغ التحصیل ہیں، کسی بچے کو انگریزی نہیں پڑھائی کہ ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا قطعاً حرام تھا۔ ایک دفعہ راقم نے انگریزی پڑھانے پر زور دیا تو بگڑ گئے فرمایا اس سے بہتر ہے کہ میں انھیں زندہ دفنا دوں۔ پھر انگریزی تعلیم کے خلاف لیکچر جھاڑ ڈالا کہ اس نے مسلمانوں کی نئی پود کو ان کی حمیت سے محروم کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس پود کو فنا کر دینے کے حق میں تھے۔

علالت

پروفیسر کرنل ضیاء اللہ نے شاہ جی کا طبی معاینہ کرتے ہوئے کہا تھا حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کو صدیوں کی عمر دے کر بھیجا تھا لیکن اپنی صحت سے آپ نے انصاف نہیں کیا اور جو کچھ یکایک پیش آ گیا ہے اس ''مجرمانہ تغافل'' ہی کا نتیجہ ہے۔

شاہ جی نے ۱۸۔۱۹۱۷ء میں تقریریں شروع کی تھیں لیکن اس وقت اُمرت سر میں ایک واعظ تھے۔ جُوں ہی جلیاں والا باغ (۱۹۱۹ء) کا حادثہ ہوا تو سیاسی زندگی میں داخل ہو گئے۔ پھر مرض الموت سے کچھ عرصہ پیش تر تک (۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء) ریل و جیل اور خطابت و سیاست میں لگے رہے۔ ایّامِ قید، عیدین اور خاص تہواروں کے علاوہ کوئی دن ہوگا کہ آپ نے کسی شہر یا قصبہ میں خطاب نہ کیا ہو۔ عموماً طویل تقریر فرماتے اور جب تک اپنی بات لوگوں کے دل پر نقش نہ کر لیتے تقریر ختم نہ کرتے۔ ان کی بعض تقریریں دس دس گھنٹے بلکہ کئی ایک بیس بیس گھنٹے تک چلی گئیں لیکن کوئی سی تقریر بھی تین چار گھنٹے سے کم نہ ہوتی، ہر جلسہ کے آخر میں تقریر کرتے۔ ان کی نوے فی صد تقریریں دوسرے مقرروں کے بعد رات بارہ بجے شروع ہوتیں اور اذان فجر تک چلتیں۔ جس شخص کو اس قسم کا سفر عنفوان شباب سے لے کر عمر کے آخر دور تک پیش آیا ہو اور زندگی بسر کرنے

کے جو اصول ہوتے ہیں ان سے غفلت کی ہو اس کا ۷۲ سال کی عمر میں مرجانا کوئی سانحہ نہیں اس عمر تک زندہ رہنا معجزہ تھا۔

شاہ جی ہندوستان کی تقسیم کے برگ و بار سے اتنے ملول تھے کہ روز بروز ان کی صحت ہلتی گئی۔ اس کے بعد اپنے آپ کو کبھی صحت مند نہ پایا۔ ختم نبوت ﷺ کی تحریک ۱۹۵۳ء میں سکھر جیل میں تھے پہلی دفعہ معلوم ہوا ذیابیطس لگی ہوئی ہے۔ ۱۶۔ نومبر ۱۹۵۴ء کو نماز عشا کے لیے وضو کر رہے تھے کہ انھیں اپنی انگلی پر فالج کا اثر محسوس ہوا۔ فرمایا میں کلمہ پڑھنے لگا اور انگلی پر لا نبی بعدی کا ورد کر کے پھونکتا رہا اللہ تعالیٰ نے فوراً شفا بخش دی۔

۲۔ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا لیکن شدید حملہ ہُوا اس حملہ سے بے بس ہو گئے ان دنوں آپ کے معالج ملتان کے حکیم عطاء اللہ خان تھے پھر اسی سال ۱۶۔ مارچ کو حملہ اور شدید ہو گیا اس حملہ نے زبان اور گلے کو معطل کر دیا۔ عقیدت مندوں کو پریشانی ہوئی۔ بیماری شاہانہ، علاج فقیرانہ، فقر و فاقہ کہاں متحمل ہوتے؟ دوستوں نے مل ملا کے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ہسپتال کی جنرل وارڈ میں داخل کرا دیا۔ لاہور خبر پہنچی تو راقم نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سیکرٹری مسٹر قدرت اللہ شہاب کے نام ذیل کا خط لکھا۔

۲۱۔ مارچ ۱۹۶۱ء

برادر مکرم

سلام مسنون۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری عمر کی آخری منزل میں ہیں کئی عوارض نے انھیں گھیر رکھا ہے، کسی نہ کسی طرح نشتر ہسپتال ملتان میں داخلہ مل گیا ہے، ہم سب ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ کے ممنون ہیں۔

چوں کہ ایک پورے عہد پر شاہ جی کے احسانات ہیں اس لیے دستک دے رہا ہوں کہ

اس متاعِ عظیم کو عمر کی اس ویرانی میں آپ بے توجہگی کا شکار نہ ہونے دیں گے' اگر آں جہانی استعمار کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو نشتر ہسپتال کی مجلس منتظمہ کو اس گرتی ہوئی تاریخی دیوار کی پُشتی بانی کی ہدایت فرمائیں' والسلام۔

آپ کا مخلص

(شورش کاشمیری)

بشرفِ نظر'

جناب قدرت اللہ شہاب سی ایس پی'

سیکرٹری صدر مملکت پاکستان

پریذیڈنٹ ہاؤس' راولپنڈی

ادھر ہسپتال میں شاہ جی کے معالج پروفیسر ڈاکٹر عالم گیر تھے وہ میرے عزیز تھے' ایک خط اسی روز انھیں بھی لکھا۔

۲۱۔ مارچ ۱۹۶۱ء

برادر مکرم'

سلام مسنون سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمارے قافلہ گم شدہ کی متاع عظیم ہیں' آپ کے زیر علاج ہیں۔ مرحوم ماضی پر ان کے احسانات کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی تمام مسیحائی ان پر صرف کر دیں۔ یہ خط میں خورشیدہ (راقم کی اہلیہ) کے کہنے پر لکھ رہا ہوں وہ کہتی ہے کہ میرے ماموں ہمارے روحانی مرشد کا علاج اپنی صحت کی قربانی پر بھی کریں گے' والسلام

آپ کا مخلص

(شورش کاشمیری)

بشرفِ نظر'

پروفیسر ڈاکٹر محمد عالم گیر

نشتر میڈیکل کالج

ملتان۔

تیسرا خط اسی دن ملتان کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس میاں محمد عباس کو لکھا جن سے احقر کا تھوڑا بہت دوستانہ علاقہ تھا۔

۲۱۔ مارچ ۱۹۶۱ء

برادرم میاں صاحب

سلام مسنون' اگر کوئی سرکاری مصلحت مانع نہ ہو تو از راہ کرم نشتر ہسپتال میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کی عیادت فی نفسہٖ فرمائیں۔ یہ آپ کا تاریخ کے ساتھ ایک دوستانہ تعلق ہو گا۔ میں نہیں کہ سکتا کہ میں آپ کو یہ خط صحیح لکھ رہا ہوں یا غلط؟ بہر حال دوستی کا تقاضا اس راستہ کی

سفارش بن گیا ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص

(شورش کاشمیری)

بشرف نظر،

میاں محمد عباس صاحب

ایس ایس پی، ملتان

مسٹر قدرت اللہ شہاب نے اپنے خط بتاریخ ۲۹۔ مارچ ۱۹۶۱ء بحوالہ ڈی۔۲۔۲۸۷۔ ۱۹۶۱ء میں محولہ بالا خط کا جواب دیا۔

برادرم! اَلسَّلامُ علیکُم

نوازش نامہ ملا۔ عرصہ سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علالت کی خبریں آرہی تھیں؛ جب یہ حالات صدر مملکت کے نوٹس میں لائے گئے تو اُنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر شاہ صاحب منظور فرمائیں تو علاج کے لیے ان کی خدمت میں کوئی مناسب ماہانہ بھی پیش کیا جائے چنانچہ میں نے ایک آفیسر کو ملتان بھیجا اور شاہ صاحب کی منظوری حاصل کر کے ان کے نام ہدیۃً ماہانہ جاری[1] ہو چکا ہے۔

آپ کا خط آنے پر میں نے پرنسپل نشتر کالج کو آج ہی لکھ دیا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے علاج پر خصوصی توجہ دیں۔ اور اس سلسلہ میں اگر کسی خاص مہنگے علاج کی ضرورت ہو تو اس سے گریز نہ کریں اور اخراجات کا بل ہمیں بھیج دیں۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے، والسلام

نیاز مند

قدرت اللہ شہاب

معتمد برائے صدر

جناب آغا شورش کاشمیری

ایڈیٹر ہفتہ وار چٹان، ۸۸۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

---

[1] شاہ جی نے نقد روپیہ وصول کرنے سے بشکریہ انکار کر دیا تھا۔

۳۔اپریل ۱۹۶۱ء کو لیفٹیننٹ کرنل اے ایف حسین ایڈمنسٹریٹر نشتر میڈیکل کالج وہسپتال نے مسٹر قدرت اللہ شہاب کو شاہ جی کے بارے میں ذیل کی رپورٹ بھیج دی۔

بحوالہ ۵۱۰۸۔این ایچ بتاریخ ۳۔اپریل ۱۹۶۱ء

شہاب صاحب نے اس کی نقل راقم کے نام بھجوا دی۔ بحوالہ ۶۱۔ پریس ۳۲۶۱ ڈی بتاریخ ۸۔اپریل ۱۹۶۱ء

Copy of D.O letter No. 5108/N.H.dated 3rd April. from Lt.Col.A.F.Hussain, Nishtar Medical College and Hospital, Multan to Mr.Q.U. Shahab, Secretary to the President.

Your letter No.2159-press/61 dated the 29th March 1961, addressed to the Principal Nishtar Medical College Multan was received by the Chairman, Academic Council, Lt.Col-Najib Khan, on 1st April, 1961, and passed on to me for disposal today.

Syed Ata Ullah Shah Bokhari, was admitted into this Hospital on 20.3 1961- He is suffering from Diabetes, Thrombotic Phenomenon and Senility. He is under the treatment of Dr. Mohammad Alamgir Khan. M.R.C.P Professor Clinical Medicine. He is accommodated in a separate room in the ward and given all possible facilities to make him as such

comfortable as possible. No special treatment likely to involve any special expenditure would be necessary. I can assure you that every thing possible is already being done and he will "INSHA ALLAH" be looked after in the best possible mannel He is already making some progress.

Regards

PRESIDENT'S SECRETARIAT (PUBLIC)

D.3261-Press/61 Dated 8-4-61

Thy with Compliments to Shorish Kashmiri Sahib.

Editor Chatan; Lahore

Sd/ (Q U. Shahab)

8th April.1961. Secretary to the President

ترجمہ: آپ کا خط بحوالہ ۲۱۵۹۔ پریس ۶۱ بتاریخ ۲۹۔ مارچ بنام پرنسپل نشتر میڈیکل کالج ملتان اکیڈمک کونسل کے چیئرمین لیفٹیننٹ کرنل نجیب اللہ خان کو یکم اپریل کے دن موصول ہوا جو مجھے کارروائی کے لیے دیا گیا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری اس ہسپتال میں ۲۰۔ مارچ کو داخل کیے گئے وہ ذیابیطس Thrombotic Phenomenon اور Senility کے امراض کا شکار ہیں؛ پروفیسر ڈاکٹر محمد عالمگیر خان ایم آر سی پی کے زیرِ علاج ہیں۔

انھیں وارڈ کے ایک کمرا میں علیحدہ رکھا گیا اور ممکنہ حد تک آرام و راحت کی تمام

سہولتیں دی گئی ہیں۔ کسی خاص علاج کے لیے خاص اخراجات کی ضرورت نہیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علاج کے لیے ممکنہ حد تک توجہ دی گئی ہے اور آیندہ بھی ان شاء اللہ کوئی سی کمی نہ ہوگی، وہ کسی قدر روبصحت ہو رہے ہیں۔ احترامات

چوں کہ شاہ جی کا مزاج انگریزی ادویات کے مطابق نہ تھا، ادھر اہلِ خانہ بھی یہی چاہتے تھے، اس لیے ہسپتال میں ایک ڈیڑھ ماہ گزار کے گھر آ گئے لیکن چند دنوں بعد حملہ شدید سے شدید ہو گیا۔ لاہور سلطان فونڈری کے مالکان (مولوی محمد اکرم و مولوی محمد اسلم)[1] ملتان گئے اور وہاں سے اٹھا کر لاہور لے آئے۔ وہ شاہ صاحب کے عقیدت مند تھے یہاں اپنے بنگلے واقع ماڈل ٹاؤن بی بلاک کوٹھی نمبر ۷۶ میں رکھا۔ کرنل ضیاء اللہ اور ڈاکٹر محمد یوسف کا علاج ہونے لگا۔ ان کے علاوہ حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی، حکیم نبی احمد سویدا وغیرہ سے بھی معائنہ کرایا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۲۷ یا ۲۸۔ جولائی ۱۹۶۱ء کو اعزہ لاہور سے واپس ملتان لے گئے لیکن شاہ جی اتنے بوڑھے ہو چکے اور مرض اتنا جوان ہو گیا تھا کہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت کے مصداق ہو گئے۔

وفات

آخر ۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء کو چھے بج کر ۵۵ منٹ پر سناؤنی آ گئی کلمہ طیبہ پڑھا اور اُردو زبان کا یہ سب سے بڑا خطیب جس نے ایک تہائی صدی تک سیاسی قبرستانوں اور شرعی بُت کدوں میں اذانیں دی تھیں، خالقِ حقیقی سے جاملا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ریڈیو نے ملک بھر میں خبر پھیلا دی، پاکستان کے کونے کونے سے لوگ ملتان میں جمع ہونے لگے، ۲۲ اگست کی سہ پہر تک تقریباً ۲۵ ہزار افراد مختلف شہروں سے ملتان میں وارد ہو گئے۔

---

[1] دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں

جنازہ

کوئی ساڑھے تین بجے بعد نمازِ ظہر جنازہ اٹھایا گیا' اس وقت تنّی شیر خان جہاں شاہ جی رہتے تھے کی تمام سڑکیں' میدان' گلیاں' مکان اور چھتیں لوگوں سے اٹی ہوئی تھیں' جنازہ کے چاروں طرف آٹھ بانس لگا دیئے گئے۔ ہر شخص کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک میل لمبا جنازہ کا جلوس تھا اور کوئی دو لاکھ آدمی شریک تھے' شاہ جی کے فرزند اکبر سید ابو ذر بخاری نے ساڑھے چار یا پانچ بجے شام نماز جنازہ پڑھائی' حکّامِ ضلع کے علاوہ اکابر شہر اور قرب و جوار کے علما و صوفیا بھی جنازہ میں شریک تھے۔ کوئی ساڑھے چھ بجے شام انسانی عظمتوں اور شرافتوں کا یہ پیکر باغ لنگے خان کے نزدیک جلال باقری کے مشہور قبرستان میں ابدی نیند سو گیا۔ اس وقت لوگوں کے صدمے اور رقت کا یہ حال تھا کہ دُور دُور تک آنسوؤں کا سیل اور چیخوں کا طوفان امڈا ہوا تھا۔

مسٹر بی اے قریشی کمشنر ملتان نے ملک امیر محمد خان کالا باغ کی ہدایت پر ملتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کرنے کی پیش کش کی بلکہ اصرار کیا لیکن شاہ جی کے فرزندانِ ارجمند نے اس عذر پر انکار کر دیا کہ وہ اپنے باپ کو مسلمانوں سے الگ کسی امتیازی جگہ میں دفن کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔

تعزیت

شاہ جی کی رحلت پر میرزائیوں کے سوا پورا ملک سوگوار تھا۔ اسی رات قاسم باغ میں فقید المثال تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی جالندھری' ماسٹر تاج الدین انصاری' قاضی احسان احمد' مولانا عبدالرحمٰن لدھیانوی' مولانا مظہر علی اظہر' شیخ حسام الدین اور آغا شورش کاشمیری نے اپنے جلیل المرتبت قائد کو خراج ادا کیا۔ اس وقت مجمع ڈھائیں مار مار کر رو رہا تھا۔ آغا شورش

کاشمیری نے کالونی ملز ملتان کے میرزائی مالکوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی جو اس وقت بھی اپنی کسی تقریب میں فلمی دُھنوں کے ریکارڈ بجا رہے تھے' اور جن کے لیے شاہ جی کی رحلت اس سال کا لمحہ مسرت تھا۔

ارادت

شاہ جی کی وفات پر ملک بھر میں ماتم کیا گیا۔ تمام اخبارات نے اداریے لکھے ہندوستان میں خبر پہنچی تو وہاں دینی حلقوں نے ماتم کیا اور سیاسی حلقوں میں اندوہ کا اظہار کیا گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کہا کہ:

''سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنگِ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے''۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا:

وہ اپنے دَور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے تعزیت کے خط میں لکھا کہ:

''زمانہ ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گیا جس کا وجود اس برعظیم کے لیے ایک عظیم عطیہ تھا۔ تاریخ ان کے مقام کا فیصلہ ضرور کرے گی لیکن ہمارے دل ان کے مقام کا تعین کر چکے ہیں کہ ان کی رحلت سے آنکھیں اشک بار ہیں نہ جانے اب ان سے کہاں ملاقات ہو گی''۔

قید و بند

’’زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی' ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں باہر رہا لوگ گلے کا ہار ہوتے رہے آج کلکتہ کل ڈھاکا' ڈھاکا سے لکھنؤ' لکھنؤ سے بمبئی پھر آگرہ' آگرہ سے دہلی' دہلی سے لاہور' لاہور سے پشاور' پشاور سے کراچی' ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کرلو' ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔

دن کہیں صبح کہیں شام کہیں رات کہیں

’’میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا ’’واہ شاہ جی واہ‘‘ میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا ’’آہ شاہ جی آہ‘‘ اور واہ و آہ میں ہم ہو گئے تباہ۔!‘‘

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ

اجتماعی قید

شاہ جی کی کل قید آٹھ اور نو سال کے لگ بھگ ہے' پہلی دفعہ آپ تحریکِ خلافت میں زیر دفعہ ۱۲۴۔ الف' ۱۴۔ مارچ ۱۹۲۱ کو بمقام اُمرت سر پکڑے گئے اور تین سال بامشقت قید کی سزا پائی جو تمام بھگتی۔ دوسری دفعہ راج پال کے فتنہ کی سرکوبی میں ۶۔ جولائی ۱۹۲۷ء کو گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کیا تو مولانا ابوالکلام آزادؒ اور پنڈت موتی لال نہرو کی خواہش پر تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ خیبر سے کلکتہ تک پولیس نے تعاقب کیا لیکن اسے جل دے کر نکل جاتے رہے۔ آخر ۳۰۔ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں پکڑے گئے اور ۲۰۔ اکتوبر کو چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ یہ تمام عرصہ آپ نے علی پور اور ڈم ڈم جیل میں گزارا۔ ۱۹۳۲ء میں احرار نے تحریکِ کشمیر چلائی تو اس کی پاداش میں دھر لیے گئے اور دو سال جیل میں رہے۔

میرزائیت کا محاسبہ شروع کیا تو انگریزی عہد میں دو دفعہ پکڑے گئے' ایک دفعہ تو مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداس پور نے تا بہ اجلاس عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا اور میرزائیوں کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ لکھا۔ دوسری دفعہ قادیان میں داخلہ کی پابندی توڑی اور تین ماہ کے لیے سزایاب ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے چند دن پیش تر سردار سکندر حیات کی وزارت نے ۳۰۲/۱۱۷' ۱۲۱' ۱۲۴۔ اور ۱۵۳۔ الف جیسی سنگین دفعات کے تحت گرفتار کر لیا اور دو جگہ مقدمات دائر کیے گئے' راول پنڈی اور گجرات! لیکن پولیس رپورٹر لدھا رام نے بھانڈا پھوڑ کر وزارت کی سازش کو چوپٹ کر دیا۔ چھ ماہ جیل میں رہ کر بری ہو گئے۔

پاکستان میں تحریکِ ختم نبوت ﷺ کی پاداش (۱۹۵۳ء) میں پکڑے گئے۔ ۲۷۔ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں راتوں رات پولیس نے گرفتار کیا اور سندھ کی مختلف جیلوں میں سیکورٹی ایکٹ کے تحت محبوس رکھا۔ کوئی ایک سال بعد مرافعہ دائر ہونے پر لاہور ہائی کورٹ کے

احکام سے چھوٹ گئے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ جولائی کے اواخر میں ڈاکٹر خان صاحب نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا۔ خانیوال اور ملتان میں ۲۱ سیفٹی ایکٹ کے تحت دو مقدمے چلائے گئے مگر آخر سرکار نے واپس لے لیے۔

تربیت گاہ

جیل خانے میں قیدی کی نفسیات عجیب و غریب ہوتی ہیں، جہاں تک ان کی معنوی خصوصیت کا تعلق ہے وہ تو ہر قیدی کے باب میں یکساں ہے لیکن مختلف طبائع مختلف اثرات اخذ کرتی ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں اجتماعی قید و بند نے بہت سے لوگوں میں ادب و سیاست اور فکر و نظر کی وسعتیں پیدا کیں، ہر شخص بقدر استعداد ایک دوسرے سے مستفید ہوتا اور ذہناً پروان چڑھتا تھا، انھی صحبتوں سے سیاسی ذہن میں استقلال پیدا ہوتا تھا اور مزاج میں پختگی آتی تھی۔ اس دور کے بیشتر راہ نماؤں اور بہت سے سیاسی کارکنوں کی سیاسی معراج جیل خانے کی ان صحبتوں ہی کے فیضان کا نتیجہ تھی۔ البتہ قید تنہائی غور و فکر کی عادی طبیعتوں کے سوا عام حالات میں مہلک ثابت ہوتی اس سے مزاج میں تہور پیدا ہوتا یا پھر غصہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاپن نشو و نما پاتے تھے۔

شاہ جی جب کبھی قید ہوئے عام جماعتی رفقا سے ان کا ساتھ رہا۔ اگر کبھی علیحدہ رہنا پڑا تو اپنی انجمن خود بنالی، جہاں گئے اپنی باغ و بہار طبیعت ساتھ لے گئے۔ ان کی شخصیت کے گرد بڑائی کا ایک خاص ہالہ بنا ہوا تھا جس سے ہر کوئی ان کے نام پر مجبور تھا۔ قیدی سے لے کر افسر تک سب ان کی طرف کھنچتے اور عزت کرتے تھے۔ ''سکندر وزارت'' کے عہد میں راول پنڈی ڈسٹرکٹ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاڈر آپ کا گرویدہ تھا اسے معلوم تھا کہ شاہ صاحب انگریزوں کے کٹر دشمن ہیں، لیکن وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہی نہیں مرعوب تھا۔ اس نے آپ کو

بیڈ منٹن کھیلنے پر آمادہ کیا۔شاہ جی جب تک راول پنڈی جیل میں رہے وہ ہر شام آپ سے بیڈ منٹن کھیلا کرتا۔اس نے بہ عنوان ''ہندوستان کی یادیں'' ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنے بعض مطالعات و تجربات کا ذکر کیا ہے۔شاہ جی کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں مُتاثر کیا ان میں عطاء اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دل فریب شخصیت کا مالک تھا' اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنھیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کتنے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ میں تو اس کی زبان کچھ نہ کچھ سمجھ ہی لیتا تھا لیکن وہ انگریزی سے قطعاً ناواقف تھا۔اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس ''اینٹی برٹش'' ذہن کی باقیات میں سے تھا جنھیں ہمارے پیش رووں نے علما کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا''۔

یادہائے رفتہ

شاہ جی تحریک خلافت کے ایام اسیری کا ذکر بڑی حسرت اور مسرت سے کرتے تھے' ان کی رائے میں وہ دن ان کی زندگی کا حاصل تھے۔تمام ملک مولانا ابوالکلام آزادؒ کے الفاظ میں ایک بڑا جیل خانہ بن چکا تھا۔ بالخصوص پنجاب کے قید خانے اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کا دارالعلوم تھے۔شاہ جی سزا یابی کے فوراً بعد لاہور جیل میں رکھے گئے۔ جہاں اُن کے ساتھ بابا گوردت سنگھ' لاجپت رائے' مولانا عبدالمجید سالکؔ' مولانا لقاء اللہ عثمانی' صوفی اقبال احمد پانی پتی' مولانا اختر علی خان' سردار سردول سنگھ کویشر' راجا غلام قادر خان' سردار منگل سنگھ' پنڈت نیکی رام شرما اور بعض دوسرے لوگ بھی محبوس تھے۔ کچھ دنوں بعد لالہ لاجپت رائے کے سوا گیارہ نفوس کا یہ قافلہ

میاں والی جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں مولانا احمد سعید دہلوی اور ڈاکٹر ستیہ پال پہلے سے موجود تھے۔ ایک بزم آراستہ ہوگئی۔ اس قید و بند کے حالات مولانا عبدالمجید سالکؔ نے اپنی ''سرگزشت'' میں تفصیل سے لکھے ہیں' ملاحظہ ہو:

''جیل میں ایک احاطہ تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ میں چار کوٹھڑیاں تھیں۔ اسے ''منڈے خانہ'' یعنی لڑکوں کا احاطہ کہتے تھے اور ایک حصے میں ایک بڑا اور کھلا کمرا تھا جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لیے گنجائش تھی چوں کہ یہ کمرا قید محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا اس لیے کمرا کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خان' مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا داؤد غزنوی' عبدالعزیز انصاری' عطاء اللہ شاہ بخاری' مولوی لقاء اللہ' صوفی اقبال' راجا غلام قادر خان' مولانا عبداللہ دہلوی' چوڑی والے' میں اور نذیر احمد سیماب ''محض کمرے'' اور ''منڈے خانے'' میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سردول سنگھ کویشر' سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیئے گئے جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال' لالہ گردھاری لال امرت سری' لالہ ترلوک چند' دیش بندھو گپتا (تیج) اور متعدد مشہور کارکن آ گئے تھے۔

چند ہی ہفتوں میں میاں والی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلآویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا' صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے' نماز باجماعت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجا غلام قادر خان' سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے' مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیوں کر چوری چھپے باہر سے منگوائی جائے اور فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے

اور یہ چوری چھپے کے کام بھی انھی کے سپرد تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا لقب ''امام لسارقین'' مقرر کیا تھا' سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے اس لیے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔۔ لیک زمانہ میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ انھیں کو انگریزی آئی نہ انھیں کو عربی..... خیر میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی مشقت بھی کرتے تھے یعنی چرخے یا پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بافی کے لیے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس وقت مولانا عبداللہ چوڑی والے للکار کے کہتے ''ارے بھائی! کھانا تیار ہے'' اگرچہ ہمارا کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبداللہ کو دے رکھا تھا اور انھوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے کہ ''جیل کو دیکھ کے گھر یاد آیا'' سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور جاری ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشا کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی۔ جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے' صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے' سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے' مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل' صوم وصلوٰۃ' تلاوتِ قرآن' تعلیم وتعلم اور تفریح وتفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔ لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہم سائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ ''حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجیے یہ ''مولبی'' لوگ ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے۔

اب ہمارے کمرے میں ایک قابلِ قدر شخصیت کا اضافہ ہو گیا تھا دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے آ چکے تھے اور ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی دوستوں میں پیدا ہو چکی

تھی۔ مولانا دہلی کے نہایت ممتاز قومی کارکن ہونے کے علاوہ مختلف قسم کے دہلوی کھانے پکانے میں بڑے ماہر تھے چنانچہ مولانا احمد سعید کی استدعا پر انھوں نے ہمارے باورچی خانے کا چارج لے لیا۔ اور اسی دن سے ہمارے دستر خوان کی لذتوں میں اضافہ ہو گیا۔ کہیں کھڑے مسالے کا قورمہ پک رہا ہے۔ کبھی میٹھے ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں' کبھی پُر تکلف قبولی کھچڑی تیار ہو رہی ہے۔ کبھی ماش کی پھریری دال دستر خوان پر آ رہی ہے۔ چوں کہ ہمیں دو چھٹانک فی کس کے حساب سے گھی ملتا تھا اور معمولی کھانوں میں استعمال ہونے کے بعد بچ رہتا تھا اس لیے مولانا عبداللہ اس کا خشک حلوا تیار کر لیتے تھے اور اس کے قتلے کاٹ کاٹ کر سب دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ حلوا عام طور پر تیسرے پہر کی چائے کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ مولانا عبداللہ کی عمر تو اس وقت سینتیس اڑتیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ڈاڑھی فرنچ کٹ تھی اور سرخ و سفید رنگت پر بہار دیتی تھی۔ پرلے درجے کے ہنسوڑ اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور دل چسپ واقعات اور لطیفے سنا کر ہم سب کا دل بہلاتے تھے۔

یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے اُستاد بھی تھے۔ عبدالعزیز انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں میرے ہم سبق تھے۔ لقاء اللہ عثمانی' صوفی اقبال احمد' اختر علی خان سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے لیکن جو خصوصیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی وہ اپنے رنگ میں مثال نہ رکھتی تھی شاہ صاحب اس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اُردو اور فارسی میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ خصوصی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شگفتی طبع' ان کا خلوص' ان کی محبت پروری بے مثال تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے وقت دوسرے احباب خوابِ غفلت میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں اور مَیں اور شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے۔ خدا جانے وہ کون سے موضوع تھے جن پر اس قدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں لیکن دل چسپی کا یہ عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔

جیل کی زندگی میں لطیفوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دن شاہ صاحب نے قصہ سنایا کہ پٹنہ میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے جس میں "ولاتنا بزوا بالالقاب" کی تفسیر کے سلسلے میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کی چڑ مقرر نہ کرنی چاہیے جس سے دوسرا شخص چڑ جائے۔ مجلس وعظ میں ایک مقامی تحصیل دار صاحب بیٹھے تھے انھوں نے پاس بیٹھتے ہوئے ایک صاحب سے کہا۔ لوگ یوں ہی چڑ جاتے ہیں اگر کوئی شخص کسی کو چڑانے کی کوشش کرے اور وہ نہ چڑے تو کوئی بات نہیں مخاطب نے جواب دیا' نہیں حضرت چڑ کی بات سے آدمی چڑ ہی جاتا ہے' اس سے تغافل کرنا بڑا مشکل ہے' تحصیل دار صاحب قائل نہ ہوئے تو دوسرے شخص نے خاموشی اختیار کر لی' دو چار منٹ گزرے تھے کہ اس شخص نے تحصیل دار صاحب سے پوچھا' کیوں صاحب! آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے' جواب ملا نہیں صاحب' میرے ہاں شلجم کا اچار نہیں ہے۔ کوئی دو منٹ کے بعد اس نے پھر سوال کیا' کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب نے جواب دیا کہ میں عرض کر چکا ہوں نہیں ہے' یہ بہت خوب کہ کر پھر چپ ہو گئے۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر پوچھا' تحصیل دار صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار تو ہو گا۔ تحصیل دار صاحب برہم ہو گئے اور کہنے لگے کیا آپ نے مجھے مسخرہ مقرر کر رکھا ہے۔ تین دفعہ تو کہ چکا ہوں کہ شلجم کا اچار نہیں ہے لیکن آپ برابر وہی پوچھتے جا رہے ہیں' اس شخص نے معافی مانگی اور خاموش ہو گیا لیکن ابھی دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس نے پھر وہی سوال دہرایا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے۔ اب تحصیل دار صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا کہنے لگے عجیب بد تمیز ہو تم؟" یہ کیا بکواس ہے؟ شلجم کا اچار ہے' شلجم کا اچار ہے' ساری مجلس وعظ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے وعظ روک دیا اس شخص نے فقط اتنا کہا کہ صاحب میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ شلجم کا اچار ہے۔

تحصیل دار صاحب نے جوتا پکڑ لیا۔ اب آگے آگے وہ شخص اور پیچھے پیچھے تحصیل دار صاحب بھاگتے ہوئے مجلس وعظ سے نکل کر بازار میں پہنچ گئے' وہ شخص بار بار پیچھے مڑ کر پوچھتا شلجم

کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب گالیاں دیتے ہوئے اسے مارنے دوڑے' یہاں تک کہ شلجم کا اچار شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار کا ذکر چھیڑ کر انھیں چڑاتے اور وہ چڑ کر گالیاں بکتے۔ لطیفہ نہایت دل کش تھا۔ دن بھر یاروں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی کہ سید عطاء اللہ شاہ کو چڑایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کر کے پوچھا۔ شاہ جی آپ کے پن ہوگی' شاہ جی نے کہا نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ کے بعد اختر علی خان پہنچے اور اس طرح انگشت شہادت کے پوروے سے اشارہ کر کے پوچھا کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہوگی' شاہ جی نے انھیں کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے۔ شاہ جی پن ہے؟ شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے اُدھڑ چکے ہیں کہ باری باری آ کر مجھ سے پن مانگتے ہو۔ اتنے میں ایک اور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے شاہ جی آپ کے پاس پن تو ہوگی؟ شاہ جی نے انھیں بُری طرح ڈانٹا اس کے بعد جو ہر طرف سے شاہ جی پن ہی کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی اتنے غصے میں آئے کہ مادر و خواہر کی مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد درآمد سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دُہرا رہے تھے۔

جیل یا کھیل

جو لوگ شاہ جی کے ساتھ جیل خانے میں رہے اُن کا بیان ہے کہ شاہ جی قید کو کبھی سیریس (Serious) نہیں لیتے تھے' جیل خانے کی چار دیواری میں ان کے قہقہے زیادہ وسیع ہو جاتے' اکثر ہندو نوجوان جو جیل میں ساتھ رہے آپ کی باغ و بہار طبیعت کے انتہائی گرویدہ تھے بالخصوص کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان ان کی شخصیت سے پیار کرتے لیکن خطابت سے خوف

کھاتے تھے۔ مشہور ٹیررسٹ قیدی شیر جنگ نے ملتان سنٹرل جیل میں آپ سے ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھا تھا' ایک دن اُس نے سوال کیا:

''شاہ جی' قرآن میں یہ تو درج ہے کہ مسلمان آزاد رہ کر اس طرح زندگی بسر کریں لیکن یہ کہیں درج نہیں کہ غلام ہوں تو کیوں کر زندگی گزاریں؟ سارے قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں' آخر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟''

یہ بات شاہ جی کے دل میں اُتر گئی۔ پھر کیا تھا مدت العمر عام جلسوں میں مسلمانوں سے اس کا جواب پوچھتے پھرے۔

ایک سوشلسٹ نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید میں تھا سوال کیا۔

شاہ جی آپ نے کبھی نماز ترک نہیں کی اور نہ کبھی روزہ چھوڑا؟ پھر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں؟

شاہ جی مسکرائے' فرمایا بھائی جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ جی نے جیل میں مونج کوٹی' بان بٹا اور گندم پیسی لیکن عام طور پر مشقت سے بے نیاز ہی رہے' ایک زمانہ میں ٹوپی پہننا چھوڑ دی' کسی نے وجہ پوچھی فرمایا پہلی دفعہ جیل گیا تو جیلر نے ہاتھ بڑھا کر ٹوپی اُتارنا چاہی' میں نے ہاتھ روک لیا اور اُتار کر خود حوالے کر دی' تب سے فیصلہ کیا ہے کہ ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ بس یہ جو گوشیہ رومال سر پر رکھتا ہوں ۔

اب تو جیل خانوں میں کافی اصلاح ہو چکی ہے ایک زمانہ میں قیدی کو تین ماہ بعد ایک خط لکھنے اور دو ماہ بعد ایک خط وصولنے کا حق ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا جبر تھا نتیجۃً بہت سے قیدی بیرنگ خط لکھتے جو بیرونی سنسر شپ کی وجہ سے پکڑے جاتے اور ان کی سزا کا موجب ہوتے' شاہ جی نے اس کا توڑ پیدا کیا۔ پنڈت کرپا رام برہم چاری کے نام سے اپنے احباب کو دیناج پور جیل سے اکثر خط لکھتے رہے اور یہ نام سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ترجمہ یا بدل تھا۔

آپ کی قید و بند کا یہ پہلو دلچسپ تھا کہ جب بھی آپ پر کوئی آفت ٹوٹی بفضل تعالیٰ آوارہ ٹکڑے کی طرح نکل گئی مثلاً سکندر روزارت کے ساختہ مقدمات نہایت سنگین تھے ان میں عمر قید یا سزائے موت کی سزائیں تھیں لیکن۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

ان مرحلوں میں لاکھوں انسانوں کی دعائیں آپ کے شامل حال تھیں ہزاروں افراد جن میں عابد شب زندہ دار سے لے کر زاہد مُرتاض تک شریک تھے' آپ کے دعاگو رہے اور بڑے سے بڑا معرکہ سر ہوتا رہا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

بعض اہل اللہ نے قرآنی وظائف بتا رکھے تھے۔عمر بھر ان قرآنی وظائف کا ورد کیا۔ آخری عمر میں انھی وظائف کے ہو گئے۔ان کا بیان تھا کہ اہل اللہ کی توجہ اور قرآن پاک سے ان کے شغف کا نتیجہ ہے کہ انھیں کوئی طاقت سر نہیں کر سکتی اور نہ کسی پخت و پز سے اپنی مرضی و منشا کے مطابق قید میں ڈال سکتی ہے لطیفہ غیبی کہیے کہ تحریکِ خلافت کی سہ سالہ قید کے بعد وہ کبھی کسی طویل عرصہ کے لیے اسیر نہ ہوئے۔جس زمانہ میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چلی تو اپنے واضح خیالات کے باوجود کھلا پھرتے رہے۔پاکستان میں تحریکِ ختم نبوت ﷺ کا جو اندوہ ناک نقشہ جما اس قید سے بھی ایک سال کے اندر اندر رہا ہو گئے۔تقریروں میں گرفت کا عنصر شاذ ہی ہوتا تمام تقریریں مصرعہ ہائے غزل کی طرح اتنی رنگارنگ ہوتیں کہ انھیں اوّل تو قلم بند کرنا ہی دشوار تھا' دوم سی آئی ڈی کا محکمہ جن فضلائے عصر پر مشتمل تھا وہ ان الفاظ و مطالب کی پکڑ سے قاصر تھے ان میں مطالب آشنائی کا جوہر ہی نہ تھا۔

سنگین مقدمہ

سکندر مرحوم کی وزارت نے آپ کو جس نازک موقع پر جن سنگین دفعات کے تحت پکڑا تھا اس کے پیش نظر ہر شخص کو اندیشہ تھا کہ عمر قید سے کیا کم سزا ہو گی۔ لیکن قدرت نے دست گیری کی اور حالات نے معجزاتی طور پر پلٹا کھایا جس رپورٹر (لدھا رام) نے تقریر قلم بند کی تھی وہ ایکا ایکی فرنٹ ہو گیا۔ اس نے لالہ لکھمی داس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گجرات کی عدالت میں ۱۸۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کے خلاف جو تقریر پیش کی جارہی ہے وہ حکومت کے ایما پر فرضی تیار کی گئی ہے چوں کہ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں ایک بے گناہ شخص کو بلاوجہ مصیبت میں مبتلا کروں لہٰذا مجھے اصل حقیقت کے انکشاف کی اجازت دی جائے۔

اس تاریخی بیان نے صورت حالات اُلٹا دی۔ وزارت گھبرا گئی' ایڈووکیٹ جنرل نے ۱۳۔ فروری ۱۹۴۰ء کو ہائی کورٹ میں درخواست گزاری کہ چوں کہ اس مقدمہ میں استغاثہ کے گواہ لدھا رام نے صوبہ کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مقدمہ کی نوعیت بدل گئی ہے لہٰذا مقدمہ کا فیصلہ عدالت عالیہ میں ہونا چاہیے۔ جسٹس سکیمپ نے درخواست منظور کر لی' چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژن بنچ نے گیارہ مارچ کو سماعت شروع کی اور بارہ مارچ کو مقدمہ لدھا رام کی شہادت کے لیے یکم۔ اپریل پر ملتوی ہو گیا۔ اس اثنا میں لدھا رام روپوش رہا۔ یکم۔ اپریل کو ڈرامائی انداز میں حاضر عدالت ہو گیا۔ اس کی شہادت تین دن جاری رہی' جس میں اس نے عجیب و غریب انکشاف کیے۔ عدالت عالیہ نے اسے جھوٹا قرار دے کر شاہ جی کو استغاثہ کی بے اعتبار شہادت کے پیش نظر رہا کر دیا۔ مسٹر ڈی فالشا سیشن جج لاہور نے بھی ۷۔ جون ۱۹۴۰ء کو دوسرے مقدمے میں رہا کر دیا۔

لدھا رام کے بیانات کا خلاصہ یہ تھا کہ جو تقریر اس عدالت میں پیش کی جارہی ہے وہ بنائی گئی ہے کیوں کہ جس شارٹ ہینڈ نوٹ بک پر اس نے تقریر کے حقیقی نوٹ لیے تھے اسے

پراسی کیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر جلا دیا تھا۔ اسے کہا گیا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو وزاعظم پنجاب کی ایک خفیہ چٹھی ملی ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری گجرات کے ضلع میں یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آرہا ہے اس کی تقریر کے نوٹ اس طریق سے لیے جائیں کہ تقریر دفعات ۳۰۲/۱۱۷/۱۱ اور ۱۵۳۔الف کی زد میں آجائے۔ اس کی تعمیل کی گئی پراسی کیوٹنگ انسپکٹر نے ان مختصرات کی بنا پر نئے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوائے اور ان سے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے گئے جن کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہے۔

اس بیان نے سکندر وزارت کی اخلاقی ساکھ کو بے حد نقصان پہنچایا۔ جنگ کا زمانہ نہ ہوتا تو ممکن تھا اس کے نتائج سیاسی اعتبار سے کچھ اور ہوتے مگر جنگ کی وجہ سے بہت سی گرہیں کھلتے کھلتے رہ گئیں تاہم سکندر وزارت کو رسوائی کا داغ سہنا پڑا۔ سر ڈگلس ینگ نے آغاز مقدمہ سے کچھ دن پہلے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ان کی خواہش پر ملاقات کی۔ مولانا کے علم میں تھا کہ سر ڈگلس اور سکندر حیات میں کسی بات پر شکر رنجی ہے' انھوں نے ساری رام کہانی سنائی' تو سر ڈگلس نے بروایت وعدہ کیا کہ وہ سازش کا کھوج نکال کر دم لیں گے لیکن مولانا سے سوال کیا کہ احرار نے فوجی بھرتی کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا ہے اس کا جواز کیا ہے؟ مولانا سوال کی گرفت سے چوکنے ہو گئے' کہنے لگے ہمارے خلاف جب اس قسم کے خطرناک مقدمات گھڑے جائیں تو اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ فوجی بھرتی کی مخالفت کر کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں قید ہو جائیں اس طرح یونینسٹ وزارت کا منشا بھی پورا ہو جائے گا اور احرار بھی مقابلتہً جھوٹے مقدمات کی طویل سزاؤں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ القصہ مقدمہ کی بہت سی راہیں سمٹ کر ایک خاص راہ پر آ گئیں نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی بری ہو گئے' سکندر حیات کے دامن پر چھینٹ تک نہ پڑی اور لدھا رام انحرافِ شہادت میں تین سال کے لیے قید ہو گیا۔

بعض وزارتی راوی لدھا رام کی شہادت کا ایک دوسرا رُخ پیش کرتے تھے' ان کا بیان تھا کہ گجرات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر برار کے خلاف رشوت ستانی کے بعض مقدمات زیرِ تفتیش

تھے اور اسے معطل کیا جا چکا تھا اس نے ان مقدمات کی واپسی کے لیے وزارت سے بلیک میل کیا یعنی لدھارام کو جو اس کا مرغ دست آموز تھا اس طرح قربان کر کے اپنے آپ کو بچایا' لدھارام کی شہادت کے بعد وہ بھی ایک گواہ ہو گیا کیوں کہ وزیر اعظم کی مبینہ چٹھی پر صحیح روشنی ڈالنے کا مجاز وہی تھا۔ اس نے سودا کیا اور کام یاب رہا۔ اس برأت کے بعد شاہ جی پر قیام پاکستان تک کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ پاکستان بنا تو سیاست سے ذہنا مستعفی ہو گئے لیکن قادیانیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ آخر ۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں راست اقدام کا فیصلہ کیا تو حکومت نے راتوں رات سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے سکھر جیل میں رکھا۔ ایک بڑے افسر نے آپ سے جیل میں ملاقات کی اور بزعم خویش نصیحت کرنے لگا۔

"شاہ صاحب اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور انگریز جا چکا ہے مگر آپ ابھی تک پرانی ڈگر پر قائم ہیں بھلا اپنی ہی حکومت کے خلاف ہنگامہ آرائی سے فائدہ؟ سوائے اس کے کہ اسلامی حکومت کمزور ہو؟"

شاہ جی ان بزرگوار کو اچھی طرح جانتے تھے ان کے لہجے کی صاحبی پر مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"جی ہاں میرے علم میں ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن۔

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

کچھ لوگ اسلامی حکومتوں میں برسر اقتدار ہوتے اور کچھ جیل خانے میں رہتے ہیں آپ اپنا کام کیجیے ہمیں ہمارا کام کرنے دیجیے' تاریخ اپنے آپ کو اسی طرح دہراتی ہے"۔

تجربہ گاہ

شاہ جی نے جیل خانے میں بڑے بڑے تجربے حاصل کیے' فرماتے جیل خانہ ترازو ہے اور کسوٹی بھی' جس سے ہر انسان کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے کسی انسان کا ظرف پرکھنا ہو یا یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا ہے؟ تو اسے دستر خوان یا جیل خانے میں پہچاننے کی کوشش کرو۔ دونوں

جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان بولتا ہے اس معیار پر انھوں نے ان دونوں کو پرکھا اور تولا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر افراد کے معاملے میں ان کی رائے بڑی صاف اور پختہ تھی۔ جہاں تک سیاسی تحریکوں میں قید ہونے والے افراد کا تعلق تھا وہ جیل خانے کو تربیت گاہ سمجھتے لیکن اخلاقی مجرموں کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ مختلف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جیل خانے مجرموں کو مزید مجرم بناتے ہیں اور یہاں اصلاح احوال کی توقع ہی عبث ہے جو خرابیاں ایک اخلاقی قیدی کو جیل خانے میں سوجھتی اور سجھائی جاتی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ایک طرف خطرناک جرم پرورش پاتے ہیں تو دوسری طرف سزا کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

قانون و سزا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر حکیمانہ تھا' وہ قانون کو حکیم سولن کے الفاظ میں مکڑی کا جالا سمجھتے جو طاقت ور سے ٹوٹ جاتا اور کم زور کو پھانس لیتا ہے ان کی نظر میں جرم سے کہیں زیادہ قانون سخت تھا اور سزا کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ محض انتقام ہے۔ اپنی قید و بند کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہ کی اور نہ کسی افسر مجاز کا گلہ کیا۔ جو صعوبتیں پیش آئیں انھیں بچشم قبول کیا۔ البتہ کبھی کبھار تقریر کا رنگ باندھنے کے لیے فرماتے۔

"جیل خانہ میری بیوی کا حق مہر نہ تھا اور نہ وہ عفیفہ خاتون اپنے جہیز میں ساتھ لائی تھی"۔

ان کے گنجلک بالوں کی سپیدی' کھلے ماتھے کی سلوٹوں اور متحرک آنکھوں کی عقبی لہروں پر اچٹتی ہوئی نظریں ڈالتے ہی قید و بند کی ایک ایسی تاریخ سامنے آجاتی تھی جس کا سرنوشت تھا۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مُرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

☆☆☆

جماعتِ احرار

شاہ جی اور احرار میں گل وبُلبُل کا رشتہ تھا' جس طرح خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور نہیں بندھتا اسی طرح شاہ جی کی نفی سے احرار کی تاریخ نصف رہ جاتی ہے دونوں میں جسم وجان کا تعلق تھا۔

تحریکِ احرار بڑے ہی گہرے تجزیہ کی مُستحق ہے' جتنا گرد وغبار تاریخ احرار پر ڈالا گیا غالباً اس دور کی کوئی اور تحریک اتنی خاک بسر نظر نہیں آتی۔ اس کے خارجی وجود بہت سے ہیں لیکن داخلی وجہ خود احرار ہیں جتنی بڑی بڑی ناانصافیاں ان لوگوں نے خود اپنے ساتھ کی ہیں' ان کا عشر عشیر بھی دوسروں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ ان پر رسوائی کی منوں مٹی ڈالی گئی وہ دب گئے۔ لیکن مٹے نہیں' انھوں نے ''قلم'' کے اس دور کو بھی ''زبان'' کا دور سمجھا' ان کا خلاصہ گفتار پر تھا کہ حال پہ جھنجلائیں' مستقبل کے خواب دیکھیں اور ماضی کے گیت گائیں' نتیجۃً ان کی سیاسی حیثیت ان مزارعین کی سی ہوگئی جو بنجر زمینوں میں ہل جوتتے انھیں کو پانی دیتے' فصل پکاتے' لیکن کٹائی کے وقت بے دخل ہو جاتے ہیں یا ان معماروں کی طرح تھے جو عمارت تو کھڑی کرتے ہیں لیکن اس میں رہ نہیں سکتے۔

جماعتِ احرار کو پرکھنے کے لیے کئی ترازوؤں کی ضرورت ہے احرار کون ہیں؟ انھوں نے کیا کیا؟ ان کے مثبت ومنفی کارنامے کیا ہیں؟ جب تک ہم سارے گرد وپیش کو معلوم نہ کر لیں اور ان حالات وواقعات پر نظر نہ رکھیں جن کا ردعمل احرار تھے اور جو احرار کے ردعمل کا نتیجہ ہیں اس

وقت تک ہم احرار پر صحیح تنقید نہیں کر سکتے اور نہ اس انصاف کو قریب لا سکتے ہیں جس کی مورخانہ حیثیت سے ہر لحظہ ضرورت ہے۔

احرار کے متعدد بڑے راہ نُماؤں کا نام ہندوستان کے ہر گوشہ تک پہنچا اور انھیں یک گونہ شہرت بھی حاصل ہوئی لیکن وہ کل ہند راہ نُما کبھی نہ بن سکے ان کا نام تو نمایاں ہی رہا مگر وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جہاں مہاتما گاندھی' قائداعظم' مولانا ابوالکلام آزاد' پنڈت جواہر لال نہرو' مولانا محمد علی جوہر اور سبھاش چندر بوس براجمان تھے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے تمام کمالات کے باوجود ہندوستان کے سیاسی راہ نُماؤں کی صف اول میں نہ تھے ان کا اثر مرحوم پنجاب تک محدود رہا۔ اس کے علاوہ وہ سرحد کے دو تین ضلعوں' ریاست بہاول پور' دہلی کے قُرب و جوار اور یو پی کے بعض بڑے شہروں میں بھی مقبول تھے لیکن ان کی تحریک یا تنظیم کے ثمرات پنجاب ہی میں تھے ان کے نام اور کام کا تذکرہ کیے بغیر پنجاب کی سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہوتی لیکن اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شہروں اور قصبوں میں وہ ایک سیاسی تحریک کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲۔ دیہات میں انھیں ایک تبلیغی جماعت کے طور پر رُسوخ حاصل تھا۔

سارا پنجاب ان سے کبھی متاثر نہیں ہوا' شمال مغربی ضلعوں کے لیے صدا بصحرا تھے۔

پنجاب کو برطانوی سلطنت میں جو مقام حاصل رہا وہ ظاہر و باہر ہے' چودھری افضل حق کے الفاظ میں ''پنجاب برطانوی مقبوضات کی شہ رگ تھا''۔ انگریزوں نے پنجابی عوام سے بڑے بڑے فوائد حاصل کیے' برطانوی سلطنت کو وسیع اور مضبوط بنانے میں اس صوبہ کے سپاہیوں نے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے۔ جتنا بہادر اور سستا سپاہی پنجاب سے ملتا رہا اس کی مثال نہیں۔ شاہ جی پنجاب کی اس ''وفاداری بہ شرط استواری'' پر ازراہِ تعریض کہا کرتے تھے کہ ''فُلاں فُلاں ضلع کی مائیں تو بچے ہی بابا فرنگی کے لیے پیدا کرتی ہیں''۔ غرض برطانوی ہندوستان کی غلامی کو برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے اس صوبہ کے بڑے بڑے خاندانوں نے سرانجام

دیے اس سے انگریزی مفاد کو بڑی تقویت پہنچی۔

انوکھی خصوصیت

انگریز ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ حریت میں جان چکے تھے کہ پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جو ہر کڑے وقت میں ان کے استعماری مقاصد کا پشتی بان ہوسکتا ہے۔ لیکن تریسٹھ برس بعد تحریکِ خلافت نے ہندو مسلم اتحاد کا جو منظر پیش کیا اس سے انگریز خوف زدہ ہو گئے۔ انھوں نے تحریک کے فوراً بعد اس اتحاد کو ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ کر ڈالا اور پنجاب میں تو وہ اس اتحاد کو مطلقاً نہ چاہتے تھے۔ یہاں ہندو مسلم اتحاد تو ایک طرف رہا انھیں مسلمانوں میں کسی آزاد خیال سیاسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود بھی گوارا نہ تھا وہ سیاستاً پنجاب کو برطانوی ہندوستان کی سرحد سمجھتے تھے۔ انھوں نے پنجاب کو فوجی صوبہ بنا ڈالا اور اس کے مختلف عوامل و عناصر کو اس طرح قابو میں رکھا کہ برطانوی مقاصد کے لیے تو وہ مختلف المذاہب ہونے کے باعث ایک تھے۔ لیکن ملکی مقاصد میں ایک دوسرے کے خلاف تھے چنانچہ اس ضمن میں چند باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔

ا۔ ہندوستان کے سیاسی رُجحانات سے پنجاب کو الگ تھلگ رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی بالخصوص مسلمانوں میں نہ تو کسی مرکزی مسلمان لیڈر شپ کا اثر بڑھنے دیا گیا اور نہ کسی صوبائی انقلابی قیادت کے لیے کام کا راستہ ہموار ہونے دیا۔

ب۔ پنجاب میں دوسرے صوبوں کی طرح صرف ہندو مسلم مسئلہ ہی پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ایک تیسرا مسئلہ سکھوں کا اٹھایا گیا جس سے فرقہ واریت کا عقدہ سہ گونہ ہو گیا۔

ج۔ ملک کے فرقہ وارانہ مسئلہ میں انگریزی اغراض کے ایما پر جو شدت پیدا ہوتی گئی اس کا سرچشمہ پنجاب تھا۔

د۔ تحریکِ خلافت کے ٹھنڈا ہوتے ہی فرقہ وارانہ مناقشات کی جو رو چلی اس کا سرآغاز کوہاٹ اور سرچشمہ دہلی تھے لیکن اس کی اصل طاقت پنجاب تھا۔

جلی قلم سے ان اغراض کی تکمیل کے لیے جو مہرے کام کر رہے تھے وہ غایت درجہ خطرناک تھے۔ مثلاً:

۱۔ پنجاب کی ہر قوم میں بڑے بڑے زمین دار التزاماً پیدا کیے گئے' ان کا اپنے دوائر میں استبدادی اثر تھا۔

۲۔ مسلمانوں پر قابو پانے کے لیے پیروں کی روایتی گدیاں نہ صرف بحال رکھی گئیں بلکہ مزید گدیاں پیدا کی گئیں۔

۳۔ بعض سرحدی اضلاع میں کئی لاکھ اور کئی کئی ہزار ایکڑ زمین کا مالک ایک سردار' ایک مہاراجا' ایک خان یا ایک نواب کو بنا دیا گیا۔

۴۔ عام لوگوں کو علم سے محروم رکھنے کے لیے بہ لطائف الحیل تعلیمی دروازے بند رکھے گئے۔

۵۔ مسلمانوں میں ان لوگوں کا اثر و رسوخ بہ طور خاص پیدا کیا جو برطانوی بساط کے دِل پسند مہرے تھے۔

۶۔ عام مذہبی پیشواؤں کو مطیع و منقاد رکھا ان کی معرفت اصل اسلام کو مجروح کیا اور چند خاص قسم کی عصبیتوں کو رواج دیا۔

۷۔ مُلّا کا دین "فی سبیل اللہ" فساد بنا دیا جس سے عام مسلمانوں میں علما و صلحا کی توقیر گھٹتی گئی اور وہ دیہات میں زمین داروں کے کمین شمار ہونے لگے۔

۸۔ مُسلمانوں میں اسلام کی بنیادی روح ختم کرنے کے لیے خانہ ساز نبوت پیدا کی گئی۔ اہلِ طریقت کو بہ لطائف الحیل اس راہ پر ڈالا کہ ان کی گدیاں مسلمانوں کے اندرونی خلفشار اور باہمی تو تکار کا مرکز بن گئیں۔

۹۔ مسلمانوں کی معیشی زندگی کو نا مسلمانوں کے تابع کر دیا گیا۔ عام مسلمانوں میں سے صرف سپاہی لیے گئے یا کلرک' جن چند خاندانوں کے افراد کو آگے لایا گیا وہ پشتینی وفادار تھے یا وہ لوگ تھے جن کا وجود قومی عزت کے منافی تھا ان لوگوں نے انگریزوں سے بڑھ کر برطانوی

سلطنت کی بقا کے لیے جاں نثاری کا ثبوت مہیا کیا۔

۱۰۔ پنجابی مسلمانوں کی بیش تر آبادیاں آبائی رسوم کا شکار تھیں، ان کے نام تک مُسلمان نہ تھے انھیں کلمہ طیبہ تو ایک طرف رہا السلام علیکم کہنا بھی نہ آتا تھا۔

۱۱۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی اور مجلسی مقاطعہ کر رکھا تھا اور وہ عملاً انھیں غیر ہندوستانی ہی سمجھتے تھے۔

۱۲۔ نیشنل کانگرس کے عام راہ نُما (مسلم لیگ کے عوامی تحریک بننے سے پہلے) مسلمانوں کو کانگرس میں شمول کی دعوت تو دیتے تھے لیکن عملاً ان پر کانگرس کے دروازے بند رکھتے تھے۔

۱۳۔ صوبہ کے عام باشندے بالخصوص مسلمان حکومت سے اتنے خوف زدہ تھے کہ ایک کانسٹیبل کو بھی حاکم مطلق سمجھتے تھے۔

۱۴۔ جن خاندانوں کو مسلمانوں کی تقدیر کا مالک بنا دیا گیا ان کی تاریخ اتنی شرم ناک اور ہول ناک تھی کہ اس تاریخ میں ملکی مقاصد سے غداری اور عوام پر جور و ستم کے سوا ایک ورق بھی قومی ہم دردی کا نہیں تھا۔

۱۵۔ مسلمانوں کے اس گروہ کا یہ شعار ہو چکا تھا کہ اس کے ارکان اسلامی ملکوں اور قومی تحریکوں کے خلاف جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

۱۶۔ مثلاً: تحریکِ لاتعاون میں جب خلافتی رضا کار علما کے فتوٰی کی کاپیاں تقسیم کرنے کے لیے سر عمر حیات خان ٹوانہ کے علاقے میں گئے تو ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ رضا کاروں کو اغوا کر کے حاشیہ برداروں میں بانٹ دیا گیا جنھوں نے ان کے ساتھ منہ کالا کیا اس صدمہ کی تاب نہ لا کر کئی ایک نوجوانوں نے خودکشی کر لی۔

ضلع میاں والی کی ایک تحصیل میں شاہ جی پہلی دفعہ تقریر کے لیے گئے تو کسی مسلمان نے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ ایک ہندو نے شب بسری کے لیے جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ تنگ آ کر بھاگ نکلا، ازاں بعد اس کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔

جس صوبہ کا حال یہ ہو اس میں کسی ایسی تحریک کی بنیاد رکھنا جس کی عنان شہر کے ادنیٰ متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہو اور جو ''اینٹی برٹش'' ذہن بھی رکھتا ہو' ایک دلیرانہ اقدام تھا جس کے عواقب و نتائج کا صحیح اندازہ غالباً خود اس گروہ کو نہ تھا۔

جماعتِ احرار کی بُنیاد

جن لوگوں نے احرار کی بنیاد رکھی ان میں مولانا ظفر علی خان' مولانا داؤد غزنوی' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' چودھری افضل حق' مولانا مظہر علی اظہر' خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پیش پیش تھے[1]۔

مولانا شوکت علی مرحوم نے ذاتی ناراضی کی بنا پر پنجاب میں خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیا تو ان پنجابی راہ نُماؤں نے ۱۹۲۸ء کے اواخر میں علیحدہ تنظیم کے امکانات پر سوچ بچار کیا اور ۲۹۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو چودھری افضل حق مرحوم کی صدارت میں جماعت احرار کی بنیاد رکھی' سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے صدر منتخب کیے گئے' دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ احرار ذہناً کانگرس کے ہم نوا تھے انھوں نے اپنی تنظیم کو ادھورا چھوڑا اور کانگرس میں شریک ہو کر سول نافرمانی میں حصہ لینے لگے' گاندھی اروِن میثاق کے تحت عفو عام کا اعلان ہو گیا تو پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے سوا سب قیدی رہا کر دیتے گئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا تو اس اجلاس میں احرار راہ نُما مندوبین کے ضلعی انتخابات کا حشر دیکھ کر شریک ہوئے تھے اور انھیں ہندو سرمایہ کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب کراچی میں بھی صورت حالات موافق نظر نہ آئی تو علیحدگی کا ذہن اور پختہ ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں کانگرس سے احرار کی علیحدگی کا سبب ورکنگ کمیٹی میں ان کے نمایندے کی عدم شرکت بیان کیا ہے

---

[1] احرار اسلام کے خطبات اور قراردادیں ص ۱۲ ماخوذ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ص ۵۴۶

لیکن چودھری افضل حق مرحوم ومغفور نے تاریخِ احرار میں اسے پنڈت جی کی "گہ مکرنی" کہا ہے۔

بہر حال جماعتِ احرار نے (جولائی ۱۹۳۱ء) اپنی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں منعقد کی' مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے' اس کانفرنس میں کانگرس کی مسلمہ روایت کے خلاف جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا......تو ہندو پریس نے آسمان سر پر اٹھالیا اور احرار کو کانگرس کا باغی قرار دے کر متہم کرنا شروع کر کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے سوال پر احرار کا ذہن پہلے کی طرح کانگرس سے قریب تھا' لیکن ہندو راہ نُماؤں اور ہندو اخباروں نے احرار کے خلاف اس شدومد سے پروپیگنڈا کیا کہ پنجابی مسلمانوں میں ان کا وجود ایک فعال عوامی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا۔ جب مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا ہمہ گیر ذہن ایک ایسی اجتماعی تحریک سے وابستہ ہو گیا جس نے جان گنتھر کے الفاظ میں مذہب کے راستہ عوام میں سیاسی رسوخ حاصل کیا تھا اور جس کا بدیہی نتیجہ مسلمانوں کا وہ جذبہ تھا' جس نے ہندوؤں کی کوتاہ نظریوں سے مشتعل اور منضبط ہو کر پاکستان کی بنیاد رکھی۔ احرار جو کچھ کہتے رہے وہ تحریک پاکستان کے خلاف تھا جو کچھ کیا وہ پاکستان کے حق میں تھا۔

تحریکِ کشمیر

احرار کی سیاسی زور آزمائیوں میں تحریکِ کشمیر کو اولیت حاصل ہے اس تحریک کے بہت سے برگ وبار تھے مثلاً تحریک کا ایک رُخ یہ تھا کہ:

۱۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانوں نے پہلی دفعہ کسی تحریک میں اس جرات سے حصہ لیا کہ چالیس پینتالیس ہزار کے قریب لوگ رضا کارانہ طور پر قید ہو گئے۔ کئی نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

۲۔ تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے اور اس تحریک کو

تحریکِ لاتعاون کا اجتماعی ذہن حاصل تھا۔ لیکن تحریک کشمیر محض مسلمانوں کے بل پر اٹھی، اس میں حصہ لینے والے ننانوے فی صد ایک ہی صوبہ کے مسلمان تھے جنھیں ابتداءً حکامِ ریاست کے علاوہ عام ہندوؤں اور نیشلسٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں برطانوی حکومت اور اس کے خود کاشتہ مسلمان اُمرا کے عناد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

۳۔ ریاست کے اندرونی راہ نماؤں بالخصوص شیخ عبداللہ وغیرہ نے کئی اسباب کی بنا پر احرار سے پہلوتہی کی لیکن بالآخر ذمہ دار حکومت کے اُسی مطالبہ پر پہنچے جس سے بارہ برس پہلے انھیں اس لیے بھی اختلاف تھا کہ اس کے مجوز احرار تھے۔

۴۔ اس تحریک نے ملک کی تمام ریاستوں کے استبدادی نظام کو ذہنی طور پر ہلا ڈالا۔ جس سے زمانہ شناس حکمرانوں نے مستقبل کے رُجحانات کا واضح طور پر اندازہ کرلیا۔ ریاستی باشندوں میں سیاسی شعور نے راہ پائی مزید برآں ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو گیا۔

۵۔ قادیانی جماعت کے سیاسی خدوخال کی صحیح وضاحت کا پہلی دفعہ سنگ بنیاد رکھا گیا۔

۶۔ عام مسلمانوں میں اس ذہن کو نشوونما حاصل ہونے لگا کہ طبقاتی شعور ہی سرمایہ دار معاشرے کے بنیادی روگوں کا صحیح علاج ہے۔

دوسرا رخ یہ تھا۔

ا۔ حکامِ ریاست نے پہلے تو احرار کو نظر انداز کیا پھر ترغیب و تحریص کا دام پھیلایا جب یہ دونوں حربے ناکام ہو گئے تو اندرونِ ریاست کے راہ نماؤں سے سمجھوتا کر کے سہ طرفہ حملہ شروع کر دیا۔

ا۔ ریاستی راہ نماؤں کو نہ صرف احرار کی ہم نوائی سے روک دیا بلکہ ان سے کنارہ کشی کا اعلان کرا ڈالا۔

ب۔ ریاست سے باہر پوری ہندو قوم کو بلاتفریق عقیدہ و خیال مخالف بنا دیا حتیٰ کہ مہاتما گاندھی نے بھی گول میز کانفرنس (لندن) میں کہہ دیا کہ تحریک کشمیر سے انگریزوں کو تقویت

پہنچنے کا امکان ہے۔

ج۔ مسلمانوں کے اُن عناصر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی جو احرار کی سیاسی ساکھ سے خار کھاتے تھے اور جنھیں احرار کا یہ عروج گوارا نہ تھا۔۲۔ انگریزوں کا منشا شروع میں کچھ اور تھا جس طرح تحریکِ خلافت کے فوراً بعد ہندو مُسلم اتحاد کو غت رُبُود کرنے کے لیے ہندو مُسلم فسادات کا تخم بو دیا گیا تھا۔ اسی طرح وہ اب ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے میثاقی خاتمہ پر چاہتے تھے کہ:

ا۔ جن چند ہزار (کانگرس کی رپورٹ کے مطابق چودہ ہزار) مسلمانوں نے تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا ہے وہ بھی اپنے آپ کو آیندہ کے لیے منقطع کر لیں یا ان کا رسوخ ضائع ہو جائے۔

ب۔ سرحد میں سرخ پوشوں کی نئی طاقت کا فروغ انگریزوں کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ قصہ خوانی بازار کے واقعہ ہائلہ سے نہ صرف مرعوب تھے بلکہ ایک سرحدی صوبہ میں اس صورتِ حالات سے خائف بھی تھے ان کے نزدیک اس کا تدارک دو قومی نظریہ کے تصادم و تکرار ہی سے ہو سکتا تھا۔

ج۔ انھی دنوں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ہو رہی تھی، گاندھی جی کو اصرار تھا کہ وہ تمام ہندوستان کے نمایندے ہیں اِدھر مسلمان نمایندے ان کے اس دعویٰ کی تغلیط کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ کشمیر کے قضیہ نے ہندو مسلم مغایرت کا واضح ثبوت مہیا کر دیا تھا۔

۳۔ ان اغراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے کوشش کی کہ وہ اپنے فرستادہ لوگوں کی معرفت کام لے چنانچہ ان عناصر نے لیپا پوتی کر کے علامہ اقبالؒ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی، برطانوی سیاست کا سب سے کامیاب مہرہ میرزا محمود احمد صدر بن بیٹھا لیکن احرار مزاحم ہو گئے، انھیں اپنی علیحدہ جماعتی زندگی کی نیو اٹھانے کے لیے سیاسی میدان چاہیے تھا جو قدرت نے مہیا کر دیا۔ علامہ اقبال نے میرزا محمود احمد اور ان کی امت کے ہتھکنڈوں کو محسوس کرتے ہوئے احرار کی استدعا پر کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ احرار اٹھے اور چھا گئے انگریزوں نے بوجوہ چُپ سادھ لی، اُمرا اشارہ پاتے ہی معاون بن بیٹھے، احرار نے غنیمت سمجھا اور

اس سے دامے سُخنے فائدہ اٹھایا لیکن تنظیم سے الگ رکھا۔ آخر ریاست نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے' وائسرائے نے آرڈی ننس نافذ کر دیا جس سے تحریک کا رخ بدل گیا۔ اُمرا واپس ہو گئے' صورت حالات کا نقشہ اس طرح ہو گیا کہ:

ا۔ انگریز چالیس پینتالیس ہزار افراد کی رضا کارانہ اسیری کو مسلمانوں میں ایک ایسے ذہن کا نمو سمجھنے لگا جس کا اس سے پہلے اسے اندازہ نہ تھا اور پنجاب میں تو اسے مطلق یہ گوارا ہی نہ تھا۔

ب۔ مسلمان اُمرا۔ کو یہ طبعاً ناپسند تھا کہ اپنی گدیاں ان لوگوں کے لیے خالی کر دیں جنھیں وہ ازراہ تعریض کنگلے کہتے آئے تھے۔

ج۔ خود مسلمان امرا نے آج تک یہ گوارا ہی نہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں ایسی کسی عوامی تحریک کو ابھرنے دیں جس کی باگ ڈور غربا کے ہاتھ میں ہو یا ان کا رسوخ بڑھے۔

د۔ نواب اسماعیل میرٹھی کی معرفت وائسرائے نے چودھری افضل حق سے ملنا چاہا تو ان اُمرا نے احتجاج کیا کہ آپ فروتر لوگوں سے مل کر اپنے مرتبہ کو گھٹانے کی غلطی نہ کیجیے۔

ہ۔ قادیانی جماعت کے لیے بدلہ چکانے کا یہ بہترین موقع تھا' نتیجہ یہ نکلا کہ احرار کو اس سارے قضیہ میں اتنی بڑی قربانی کے باوجود شکست فاش ہوئی۔ ریاست نے ہتھیار ڈال کر ہتھیار اٹھا لیے' انگریزوں نے احرار کو مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمان اُمرا نہ صرف اُلٹے پاؤں بھاگ گئے بلکہ اس سوچ میں لگ گئے کہ احرار نے پنجاب میں جو اثر پیدا کیا ہے اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے' ہندو شروع سے بیزار تھے ملک کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کانگرس نے احرار کو نافرمان سمجھ کر سیاسی اچھوت سمجھا۔ کئی مسلمان راہ نُما جو کبھی احرار کے ہم خیال یا ہم سفر رہے تھے احرار کی مقبولیت کو اپنی الگ شخصیتوں کے لیے مضر سمجھتے اور چاہتے تھے کہ احرار بہر صورت ختم ہو جائیں' غرض احرار خطرناک قسم کے سیاسی نرغے میں تھے۔

تحریکِ کپور تھلہ

احرار کا دوسرا عوامی محاذ ریاست کپور تھلہ کی کسان تحریک (۱۹۳۳ء) تھا۔ ریاست نے

خود مسلمان اُمرا کی معرفت اس تحریک کا گلا گھونٹ دیا وہاں وزیر اعظم مسلمان تھا اس نے ایک ہوشیار شاطر کی طرح صف آرا قوتوں کو چاروں شانے چت کیا۔ مگر احرار ہر حال میں ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے ایکا ایکی شہید گنج کے انہدام نے اس طاقت کو اس بُری طرح برباد کیا کہ پھر وہ سنبھالے لے تو لیتے رہے لیکن سنبھل نہ سکے۔ جس تیزی سے ابھرے تھے اُسی سرعت سے پسپا ہو گئے۔

کمیونل ایوارڈ

اواخر ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو گاندھی جی جیل میں تھے۔ اس ایوارڈ میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رکھا گیا' گاندھی جی نے اس علیحدگی کے خلاف مرن برت شروع کیا۔ گورنمنٹ نے گھبرا کر انھیں چھوڑ دیا۔ اس پر اچھوت راہ نُماؤں اور ان کے مابین پونا پیکٹ ہو گیا جو ریمزے میکڈنلڈ نے تسلیم کر لیا۔ اِدھر اس ایوارڈ میں مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں پچاس فی صد سے ایک یا دو نشستیں زائد دی گئی تھیں۔ پنجاب کے ہندوؤں نے متحد ہو کر چلّانا شروع کیا کہ اسلام راج قائم کر دیا گیا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ گوردوارہ تحریک کی کامیابی سے کچھ زیادہ ہی مَن چلے ہو گئے تھے انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اعلان جڑ دیا کہ کمیونل ایوارڈ میں مسلمان راج کے جراثیم ہیں۔ اگر اسے بدلا نہ گیا تو سکھ خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ ماسٹر جی نے سکھوں کو گورو گرنتھ پر حلف لینے کی تلقین کی ہر کہیں یہ حلف اٹھایا گیا.......... شاہ جی انھی دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ماسٹر جی کی دھمکیاں پڑھیں تو اُمرت سر کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ماسٹر جی ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے ڈرائیں نہیں' غالباً وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ہم خون کے قلزموں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں''۔

شاہ جی کمر بستہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے انھیں تحریک کشمیر کے تجربے میں ہندوؤں اور سکھوں کے اجتماعی ذہن نے پہلے ہی آزردہ کر رکھا تھا ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ کا چکر کاٹا۔

تمام صوبے میں شاہ جی کی شعلہ نوائی نے سحر کا کام کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ منقار زیر پر ہو گئے اور دوبارہ یہ لب ولہجہ کبھی استعمال نہ کیا۔

میرزائیت 1 کا تعاقب

احرار کا دوسرا بڑا محاذ میرزائیت کے خلاف تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی حکومت کی ایک خود کاشتہ طاقت کو ایک ایسی بے ڈھب جماعت سے واسطہ پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں میں اس کی تبلیغی طاقت زائل کر دی بلکہ اس کے برطانوی چہرے سے نقاب الٹ دی اس مہم کی تائید میں بعض مؤثر آوازیں اٹھیں۔ علامہ اقبال نے میرزائیت کو کھلم کھلا مسلمانوں سے الگ ایک مذہب اور فرقہ قرار دیا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جناب میرزا سر ظفر علی نے بھی میرزائیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ حیدر آباد کے ایک فاضل مولف جناب الیاس برنی نے ''قادیانی مذہب'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں میرزا غلام احمد سے لے کر میرزا محمود احمد تک کی تحریروں سے ان کے مبادی و مقاصد' مطالب و عزائم اور رجحانات و میلانات کا کچا چٹھا پیش کیا.......... اس پر مسلمانوں کی بعض تعلیمی انجمنوں کو فیصلہ کرنا پڑا کہ میرزائی ان کے اداروں کے رکن نہیں ہو سکتے۔ اس صورت حالات سے میرزائیت اور اس کے اعوان و انصار گھبرا گئے۔ میرزا محمود احمد پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنے میں یگانہ تھے انھوں نے خنجر کو آستین میں رکھا اور گھات میں بیٹھ گئے۔ ادھر پنجاب کے اُمرا کا طبقہ جن کی خصوصیتیں اوپر بیان ہو چکی ہیں احرار کی تیز روی اور قبول عامہ کو اپنے لیے مضر سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے آئندہ کے الیکشن تھے ملک کو پہلی بار صوبائی خود مختاری حاصل ہو رہی تھی۔ مسلمانوں اور نا مسلمانوں کی طاقت میں دو یا تین ووٹوں کا فرق تھا۔ اُمرا نہیں چاہتے تھے کہ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر احرار آگے بڑھیں اور اختیارات پر قابض ہو جائیں۔ خود انگریز اس معاملہ میں چوکنا تھا۔ پنجاب بہر حال اس کا قلعہ تھا اور برطانوی اقتدار کو اس کے خود کاشتہ اُمرا ہی تحفظ دے سکتے تھے۔

احرار اس سے خالی الذہن نہ تھے ان کے پیش نظر بھی انتخابات تھے اور سمجھتے تھے کہ طاقت کے بغیر کوئی تنظیم بھی مؤثر نہیں ہوتی......... عجب نہ تھا کہ وہ شہری اور قصباتی نشستوں میں سے بیس پچیس نشستیں بہ آسانی حاصل کر لیتے لیکن میاں سر فضل حسین مرحوم انھیں شہ مات دینے میں کام یاب ہو گئے۔ گو وزارت عظمیٰ کا خواب میاں صاحب کی ناگہانی موت سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے وہ احرار کو شکست دے گئے۔ سردار سکندر حیات نے ان کی جگہ لی۔ پہلے تو احرار راہ نماؤں سے دوستی گانٹھتے رہے تھے لیکن میاں صاحب کا جانشین ہوتے ہی تو تا چشم ہو گئے اور احرار کو فنا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کی تفصیلات اس کتاب کا حصہ نہیں ہیں۔

شہید گنج کا قضیہ

شہید گنج کا قضیہ نامرضیہ اس ساری داستان کا ایک فراموش شدہ مگر عبرت ناک باب ہے، شہید گنج پر ایک زمانہ سے سکھوں کا قبضہ تھا اور وہ کسی صورت میں بھی اسے مسجد تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ گوردوارہ شہید گنج کا ایک حصہ سمجھتے تھے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میر منو گورنر پنجاب نے بعض سکھوں کو یہاں قتل کرایا تھا اور یہ ان کے مقتولین کی جگہ ہے۔ جب اکالی تحریک کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا اور اس ایکٹ کے بنانے میں میاں فضل حسین مرحوم ومغفور نے بھی اعانت کی تو شہید گنج کی ملکیت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں سردار سکندر حیات کے عم زاد نواب مظفر خان بھی شریک تھے۔ نواب صاحب نے سکھوں کی ملکیت تسلیم کر لی۔ مسلمانوں نے ایک دوبار چارہ جوئی کی مگر ناکام رہے۔ ان فیصلوں اور اپنے قبضے کے باوجود سکھوں نے انہدام مسجد سے احتراز کیا۔ اب کئی سال بعد آغاز جولائی ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی مسجد گرائی جانے لگی تو مسلمان چونک اُٹھے۔ ہر طرف شور مچ گیا حتیٰ کہ دیکھتی آنکھوں شعلہ جوالہ بھڑک اٹھا۔ اس بارے میں اب کوئی راز نہیں رہا کہ:

"شہید گنج لاہور میں ہے اور لاہور پاکستان میں! جن لوگوں نے اس وقت شہید گنج کی

بازیابی کے لیے ڈراما کھیلا تھا ان میں ننانوے فی صد بقید حیات ہیں لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے کامل انخلا کے باوجود شہید گنج پر پولیس کا سنتری پہرہ دیتا ہے، کسی کو اس کے مسجد ہونے کا خیال نہیں رہا اور نہ کسی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے جہاں تک حکومت کے مصالح و مقاصد کا تعلق ہے وہ معلوم ہیں لیکن سوال ان لوگوں کا ہے جو اس وقت شہید گنج کی بازیابی کے نام پر سیاسی ناٹک کھیل رہے تھے۔"

بہرحال ان اسرار سربستہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ مسجد حکومت کے ایما اور سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب کی شہ پر گرائی گئی۔ حکومت نے کرین مہیا کی۔ جس شخص نے سب سے پہلے مسجد کے گنبد پر کدال چلائی وہ پنجاب سی آئی ڈی کا ایک سکھ سب انسپکٹر پولیس تھا۔ اس کی رپورٹ کا خلاصہ ایک مسلمان انسپکٹر پولیس کی معرفت مولانا ظفر علی خاں کے پاس پہنچا۔ وہاں سے راقم الحروف کے ہاتھ لگا۔

دو سوشلسٹ نوجوان اس الزام میں ماخوذ تھے کہ انھوں نے شہید گنج کے انہدام کا ذمہ دار حکومت کو گردانا تھا۔ ان کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے راقم الحروف کو صفائی میں طلب کیا، راقم نے عدالت میں ذاتی حفاظت کا سوال اٹھایا۔ عدالت نے حُکّامِ بالا سے مشورہ کیا۔ حکومت کے کارندوں کا ضمیر اس معاملہ میں مجرم تھا انھوں نے انکار کر دیا۔ شہادت نہ ہو سکی مگر یہ بات اپنی جگہ موجود ہے کہ انہدام مسجد میں اس وقت کے انگریز گورنر اور صوبائی بیوروکریسی کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

۲۔ سکھوں میں داخلی طور پر دو دھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا گوردوارہ پربندھک کمیٹی پر قبضہ تھا جو لوگ اندر خانے ان کے دھڑے کو شکست دینا چاہتے اور آیندہ انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیے پر تول رہے تھے۔ انھوں نے سرکاری سازش میں شریک ہو کر مسجد کے انہدام کا فیصلہ کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ کو اس وقت خبر ہوئی جب مسجد گرنے لگی۔ انھوں نے مولانا داؤد غزنوی سے صورت حالات سمجھنے کے بعد سردار منگل سنگھ کو لاہور بھیجا کہ مسجد گرانے

والوں کو روکیں۔ مگر حکام نے انھیں لنڈے بازار کی نکڑ پر روک لیا تا آنکہ مسجد ہموار ہوگئی۔ اب کوئی سکھ لیڈر بھی انہدامِ مسجد کی مذمت کر کے سکھ قوم میں اپنی شہرت کھونے کو تیار نہ تھا۔ سب اکٹھے ہو گئے اس کا فائدہ یونینسٹ پارٹی کے دست و بازو سر سندر سنگھ مجیٹھیا کو بھی پہنچا وہ اپنے بعض ساتھیوں سمیت انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ غرض پنجاب میں وزارت بنوانے کا جو نقشہ انگریزوں کے ذہن میں تھا وہ ان کی مرضی و منشا کے مطابق بن گیا۔

۳۔ سر میاں فضل حسین ہندوستان میں مسلمانوں کی جاگیردارانہ سیاست کے سب سے بڑے شاطر تھے۔ احرار نے سر ظفر اللہ خان کی مرکز میں نامزدگی پر میاں صاحب کو ہدفِ مطاعن بنا کر اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تمام خاندانی کاسہ لیس جو احرار کے قبولِ عامہ سے خائف ہو کر ان کے گرد جمع تھے شہید گنج کے انہدام پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنِ واحد میں مجلسِ عمل بن گئی۔ ایک بساط پر کئی مہرے جمع ہو گئے۔ جو لوگ مخلص تھے انھیں دھوکے میں رکھا گیا۔ ادھر احرار راہنما لاہور سے باہر تھے ان کی غیر حاضری میں سازش کا اختیاری و غیر اختیاری لائحہ عمل تکمیل پا گیا۔ چال یہ تھی کہ احرار راستہ سے ہٹ جائیں یعنی تحریک میں حصہ لیں تو مارے جائیں نہ حصہ لیں تو پٹ جائیں۔ دونوں صورتوں میں ان کے لیے کربلا کا ایک میدان تھا اور انھیں مٹانے کے لیے متضاد و متبائن عناصر اکٹھے ہو گئے تھے۔

ا۔ احرار کو شروع ہی سے نشانے پر رکھا گیا مسجد کا حصول مؤخر اور احرار پر سب و شتم مقدم ہو گئے۔

ب۔ میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا کے مکان پر بہ شمول احرار مختلف حلقہ ہائے خیال کے لوگوں کی جو میٹنگ ہوئی اس میں انہدامِ مسجد کے خلاف حکمِ امتناعی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن مولانا اختر علی خان ڈپٹی کمشنر ایس پرتاب اور سٹی مجسٹریٹ سردار تر ندر سنگھ کے جھانسے میں آ گئے۔ درخواست تحریری (؟) یا لسانی (؟) جیب میں رکھ چھوڑی، مسجد مسمار ہوگئی۔

ج۔ جن مختلف الخیال عناصر نے احتجاج کا بیڑا اٹھایا تھا وہ خرابی حالات کے خوف سے خود

تجویز کر کے نظر بند ہو گئے مگر مخلص نوجوانوں کو کئی مہروں کی انگیخت پر گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ سب سے بڑی سیاسی ضرب احرار پر پڑی ان کے خلاف مسلسل واویلا شروع ہو گیا۔ اسی دوران میں ان لوگوں کو بھی صف آرا کیا گیا جو افسروں کے جاسوس اور سرکاری ٹکسال میں ڈھلے ہوئے تھے۔ حضرت امیر ملت سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اردگرد جن لوگوں کو مامور کیا گیا ان میں سے نوے فی صد حکومت کے کارندے اور پنجاب سی آئی ڈی کے ایک سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین کے آلہ کار و خدمت گزار تھے۔

د۔ مجلسِ اتحادِ ملت پر ابتداءً ان لوگوں کا عمل دخل رہا جو سی آئی ڈی کے تنخواہ دار مخبر تھے اور حصول شہید گنج کے مقاصد کی بجائے میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ (سی آئی ڈی) اور ایس پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور کی باہمی آویزش کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نظر بندی سے رہا ہو کر لاہور تشریف لائے تو مجلس اتحاد ملت کے ڈراما کا نیا باب شروع ہو گیا...... عام انتخابات میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی احرار سے اپنا قرض چکانے کے لیے اتحاد ملت کے نقیب بن گئے۔ ادھر احرار شہید گنج کے ملبے میں بری طرح دب چکے تھے' چودھری افضل حق جن سے یونینسٹ راہ نما خوف کھاتے تھے فرضی شہیدوں کی نمائش سے ہرا دیے گئے۔ انتخاب کا پالا یونینسٹوں نے مار لیا۔ ڈاکٹر عالم شہید گنج کی اینٹوں کا نام لے کر کامیاب ہو گئے مگر جیتنے کے فوراً بعد کانگرس میں چلے گئے۔ وہاں دال نہ گلی تو لیگ کا رخ کیا۔ ملک خضر حیات اور قائداعظم میں تصادم ہو گیا تو خضر حیات کا ساتھ دیا۔ آخر ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ہار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اس انتخاب کے بعد جب احرار کی سیاسی شکست مکمل ہو گئی اور عمومی شہرت کو دھکا لگ چکا تو کسی نے شہید گنج کا نام نہ لیا۔ ملک برکت علی مرحوم نے بازیابی کے لیے مسودۂ قرارداد پیش کرنا چاہا لیکن ایک دل چسپ افتاد مانع ہو گئی۔

اب احرار نے شہید گنج کے راہ نماؤں کو للکارنا شروع کیا' مولانا مظہر علی اظہر نے سول

نافرمانی کا ڈول ڈالا۔ خود بھی قید ہو گئے اور کئی سورضا کاروں کو بھی قید کرا ڈالا۔ مگر بات نہ بنی۔ عوام کے ولولے مدت ہوئی مر چکے تھے، جو لوگ مجلس اتحاد ملت کے لیڈر تھے وہ مختلف افسروں کے ہاتھ میں تھے۔ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ شہید گنج کا حصول نہ اس وقت پیش نظر تھا نہ اب......... آخر سردار سکندر حیات نے زبان کھولی اور اعلان کیا کہ شہید گنج کا حصول بوجوہ دشوار ہے کیوں کہ اس ایک مسجد کے جبری حصول سے مسلمانوں کو وہ تمام معابد لوٹانا ہوں گے جن پر مسلمان بادشاہوں کے عہد میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے اس اعلان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا حتیٰ کہ اتحاد ملتی لیڈر بھی آمنا وصدقنا پکار اٹھے۔

یہ اعلان کوئی نیا نہیں تھا بلکہ مستعار تھا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے انہدام مسجد کے وقت جب مسلمان ابھی شہید نہیں ہوئے تھے یہی دلیل دی تھی مگر اس وقت سازشی لیڈر ماننے کو تیار نہ تھے اور سادہ دل عوام غیظ میں تھے۔ اب جانبین نے اپنا پینترا بدل لیا۔ احرار کہتے تھے آؤ مسجد لیں، دائی کہتے تھے سکندر حیات کی بات درست ہے۔

احرار کے لیے آزمائش کا یہ سب سے بُرا دور تھا۔ ایک محدود ذہن کے سوا تقریباً سب لوگ ان سے کٹ چکے تھے۔ تمام احرار راہ نُماؤں کو ایک شدید یلغار کا سامنا کرنا پڑا گو رفتہ رفتہ انھوں نے اسٹیج پر قابو پا لیا اور اپنی بات بھی کہنے لگے لیکن بہت کچھ کھو کر۔

اصلاً شہید گنج کے معاملہ میں ان سے ایک سیاسی غلطی ہو گئی اگر وہ شروع ہی میں حصہ لے کر اس کا رخ پلٹتے تو زیادہ مفید نتائج پیدا ہوتے۔ انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا جس سے مار کھا گئے۔

احرار کی اس بربادی کا سب سے زیادہ فائدہ ایک خاص دائرہ میں میرزا بشیر الدین محمود نے اٹھایا۔ اس نے شروع سے آخر تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ جہاں کہیں اور جس طرح بھی احرار کو ضعف پہنچ سکتا تھا اس نے اس میں رتی بھر کمی نہ کی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمہ میں میرزا بشیر الدین محمود کے خلاف مسٹر جی ڈی

کھوسلہ سیشن جج گورداس پور کا فیصلہ ایک دوٹوک محاکمہ تھا۔ یہ فیصلہ ۶۔ جون ۱۹۳۵ء کو سنایا گیا۔ کوئی ایک ماہ بعد شہید گنج کا سانحہ پیش آ گیا' میرزا نے احرار دشمن تھڑدلوں کی پشت پناہی کا بیڑا اٹھایا' چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس نے اس مہم میں کئی لاکھ روپیہ صرف کیا مگر ایک منفی فائدے کے سوا میرزائیت کو کوئی اثباتی فائدہ نہ پہنچا۔ عام مسلمانوں میں قادیانیت کا وجود ہمیشہ کے لیے مشتبہ ہو گیا' اس کے پیرو مسلمان عوام کے احتسابی نرغہ میں آ گئے' مذہبی اعتبار سے ان کی محرومی دائمی ہو گئی' ان کا تجزیہ و محاسبہ ایک تحریک بن گیا اور یہ سب کچھ احرار کی بالواسطہ و بلاواسطہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ اب میرزا صاحب اور ان کی مشینری کے اعضا احرار پر شہید گنج کی مسجد کا لمبا چھینکنے میں پیش پیش تھے۔

شاہ جی یار و اغیار کی ان نوازشوں سے دل برداشتہ بھی ہوئے اور صورت حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر قلباً یہ رائے قائم کر لی کہ الیکشن بہت بڑا فتنہ ہیں۔ پھر طوعاً و کرہاً الیکشن میں حصہ لیا مگر علی الاعلان فرماتے الیکشن قومی زہر ہیں۔ جماعت کو الیکشن سے باز رکھنے کی ہر دفعہ کوشش کی لیکن جماعت کے ''دماغ'' ان کی ''زبان'' کی پناہ تو لیتے مگر ان کے دماغ سے فائدہ نہ اٹھاتے نتیجہ معلوم کہ انگریزی عہد کے آخری انتخابات (۱۹۴۷ء) میں ان کے ساتھیوں نے ان کی بات نہ مان کر جوزک اٹھائی اس کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ ان پر ایک دوسری شہید گنج گر گئی...... حتیٰ کہ ان کے حقیقی کارنامے بھی انتخابات کی پے در پے شکستوں کے گرد و غبار میں دب کر سیاسی کھلنڈروں کے آوارہ قہقہے ہو گئے اور اب ۔

لختے بُرد از دل گزرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

دوسری جنگِ عظیم

ابھی شہید گنج کے زخموں کا کھرنڈ باقی تھا کہ احرار نے برطانوی حکومت کو ضربیں لگانے کا فیصلہ کیا اور آرمی بل کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ بل یورپ کے جنگی امکانات کی وجہ سے سنٹرل اسمبلی میں زیر بحث ہی تھا کہ احرار نے رائے عامہ کو اس کے خلاف منظم کرنا شروع کیا اور بمبئی سے لے کر پشاور تک ہنگامہ رچا دیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے ڈینزگ پر حملہ کر کے دوسری عالم گیر جنگ چھیڑ دی۔ احرار راہ نما اسی دن کی راہ دیکھ رہے تھے۔ چودھری افضل حق نے چھ ماہ قبل ۷۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا احرار کانفرنس کے صدارتی ایڈریس میں کہا تھا۔

''جنگ قضائے مبرم بن کر مغرب کے سروں پر کرگس کی طرح منڈلا رہی ہے۔ یہ نازک و مغلوب قوموں کو خبردار ہونے کا اشارہ ہے' برطانوی سرکار میدانِ جنگ میں پہلا گولہ گرنے سے پیش تر نیاز مندی کا نمونہ بن کر سامنے آئے گی۔ احرار شہنشاہیت کی اس مصیبت کو غلاموں کے لیے رحمت خیال کرتے اور آیندہ جنگ کو ہندوستان و دنیائے اسلام کے لیے حصولِ آزادی کا بہترین موقع سمجھتے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر برطانوی شہنشاہیت پر ضرب لگائیں''۔

چنانچہ احرار ہائی کمانڈ کا فوری اجلاس ۱۳۔ ستمبر کو امرت سر میں منعقد ہوا جس میں فوجی بھرتی کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا...... لیگ نے ابھی وقت تک حصول پاکستان کا نصب العین اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے ساڑھے چھ ماہ بعد جب بڑے بڑے احرار زعما جیل خانوں میں تھے لیگ نے لاہور کے سالانہ سیشن میں پاکستان کا ریزولیشن پاس کیا۔ اس وقت تک عامتہ المسلمین میں احرار کے جرأت مندانہ اقدام سے ہم دردی کا ذہن عام تھا' گو سول نافرمانی میں وہ اجتماعاً شریک نہ تھے لیکن ''آشیرباد'' دینے میں پیچھے بھی نہ تھے...... کانگرس نے احرار کے اس فیصلے کو عاجلانہ قرار دیا۔ سوشلسٹوں نے تعاون کی پیش کش کی اور وہ ایک متحدہ محاذ بنانے کے سوال پر گفتگو

بھی کرتے رہے لیکن فوری گرفتاریوں سے مشترکہ محاذ کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

احرار کو اپنے اس اقدام کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ مسلمان قرار داد پاکستان کے بعد انھیں بھول گئے۔ کانگرس نے نظر انداز کیا بالخصوص پنجاب کے کانگرسی زعما تو احرار کی بہ نسبت سردار سکندر حیات سے زیادہ قریب تھے۔ انگریزوں نے اپنے گماشتوں کی معرفت احرار کو طویل سے طویل سزائیں دے کر بزعم خویش خوار کیا۔ جیلوں میں احرار قیدیوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بدتر سلوک ہوتا رہا۔ گوجراں والا کے ایک ہندو مجسٹریٹ نے احرار کے ایک نوجوان کو سزا دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ احرار سے اخلاقی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے۔ اس پر بڑے بڑے دیش بھگت منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے، ایک موقع پر رائے بہادر مہر چند کھنہ نے جو آگے چل کر خان وزارت میں وزیر مالیات ہو گئے گاندھی سے یہ بیان حاصل کیا کہ احرار کلہاڑی رکھتے ہیں جو تشدد کا نشان ہے' لہٰذا ان کا کانگرس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بیان کی آڑ میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جیسے مہاپرشوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

المختصر احرار نے اس معرکہ میں سخت سے سخت اذیتیں سہیں' ہر استبداد کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ حتیٰ کہ موت وحیات کے درمیان کوئی راہ باقی نہ رہی۔ چودھری افضل حق جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر رہا ہوئے اور چند مہینوں ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا محمد گل شیر' صوفی عنایت محمد پسروری' احسن عثمانی' حکیم غوث محمد جام پوری اور راقم الحروف دو برس تک قید تنہائی میں رکھے گئے۔ تمام عرصہ چکی پیسنے کو دی گئی۔ حکیم صاحب سی کلاس کی خوراک سے دمہ کے دائمی مریض ہو گئے۔ احسن عثمانی نے بھوک ہڑتال کی تو اس کی مقعد میں نالی گھسیڑ کر اُسے نڈھال کر دیا گیا۔ آخر اس داخلی صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ رہا ہوتے ہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ راقم الحروف سے جو سلوک ہوتا رہا اس کی بہیمیت کا تذکرہ ''پس دیوارِ زنداں'' میں آ گیا ہے جو راقم کے ایامِ اسیری کی سرگزشت ہے۔

چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کا سیاسی رُخ یک سر پلٹ گیا۔ چنانچہ اگست

۱۹۴۲ء میں کانگرس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چلائی تو احرار نے حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احرار نہ کانگرس کے رہے نہ لیگ کے' دونوں کی ہم سفری وہم نوائی سے گریز کیا پھر جب حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس ہوا تو اس وقت کئی احرار راہ نُما جیل میں تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو احرار کے ہمیشہ سے صدر چلے آتے تھے ایک بے میعاد زمانہ نظر بندی دھرم سالہ جیل میں گزار رہے تھے۔

دراصل یہ احرار کے ایک ایسے ذہن کا اندازِ فکر تھا جو اینٹی برٹش ہونے کے باوجود کانگرس سے ہم آہنگ نہ تھا۔

جنگ ختم ہو گئی' اتحادیوں کو فتح ہوئی لیکن جن لوگوں کو ظالمانہ حد تک انگریز دشمن سمجھا جاتا تھا وہ ایک بڑا عرصہ پابند اور زبان بندی رہے۔ خود راقم الحروف اتحادیوں کی فتح کے ایک سال بعد تک نظر بند رہا۔

مولانا مُحمد گُل شیر کی شہادت

انھی دنوں احرار کو ایک اور وار سہنا پڑا۔ مولانا محمد گل شیر اپنے گاؤں جنڈ ضلع کیمبل پور میں رات کے وقت سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیے گئے۔ ان کے قاتلوں کا سراغ کبھی نہ ملا۔ بہرحال ان کا قتل ایک سیاسی قتل تھا اور اس کے پس منظر میں وہ تمام رجحانات ومیلانات تھے جن کا ذکر پنجاب کی خصوصیتوں کے ابتدائی ذکر میں آ چکا ہے.......... مولانا جب تک کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے اور صرف واعظ تھے اس وقت تک کیمبل پور' اٹک اور میاں والی وغیرہ میں بڑے لوگوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ وہ مدتوں احرار کی مخالفت کرتے رہے۔ جب کوئی احرار لیڈر ان علاقوں میں جاتا اس سے اگلے ہی دن اس کا اثر زائل کرنے وہاں پہنچ جاتے۔ آواز میں بلا کا سوز اور خطابت میں ایک طرح کا سحر تھا ٹھیٹھ پنجابی اس آواز پر مرتے تھے۔ ان اضلاع کے عوام میں ان کا خاصا اثر تھا۔

۱۹۳۸ء میں حج کو گئے تو وہاں مدینہ منورہ میں خواب دیکھا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں احرار سے مل کر خدمتِ خلق کرو۔ مولانا فرماتے تھے میں نے اپنی پچھلی مخالفتوں سے توبہ کی اور آتے ہی احرار میں شمول کا اعلان کر دیا۔ کوئی ایک سال بعد احرار نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو آپ بھی دو سال کے لیے قید کر دیے گئے۔ قید کا زمانہ انتہائی شجاعت اور غیرت سے بسر کیا۔ معلوم ہوتا قرن اول کا کوئی صحابی راہِ خدا میں صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔ اُدھر علاقے کے خانوں کو آپ کا احرار میں شمول ناپسند تھا۔ اِدھر آپ نے ان کے علاقوں میں احرار کی شاخیں قائم کرنا شروع کر رکھی تھیں۔ ایک دو جگہ کسانوں اور خانوں میں مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ جن خوانین نے لوگوں کو شاہ کی میزبانی سے روک دیا تھا وہ بھلا مولانا محمد گل شیر کے اس قبول عامہ اور دعوت احرار کیوں کر برداشت کرتے۔ مولانا چند مہینوں ہی میں قتل کرا دیے گئے۔ ملک خضر حیات نے بہ طور وزیر اعلیٰ قاتلوں کی تلاش کے کئی وعدے کیے لیکن سب دوشیزاؤں کی کہ مکرنیاں ثابت ہوئے۔ یا پھر پولیس افسروں کے ہلکے تبسّم میں گم ہو گئے کہ ان مسکراہٹوں میں سازشوں کی تہ بہ تہ کڑواہٹیں چھپی ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کی موت

چودھری افضل حق کی رحلت کے بعد احرار کے سیاسی فیصلے تضاد و تغلیط کا شکار ہونے لگے۔ اول تو احرار نے کتابی نظریوں کو فوقیت دی۔ دوم ان کا اینٹی برٹش ذہن اتنا پختہ نہ تھا کہ وہ سرتاپا جذباتی ہو چکے تھے۔ انھیں اس امر کا اندازہ ہی نہ تھا کہ سیاسیات میں حالات و واقعات کی رفتار دیکھ کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں وہ دل سے سوچنے کے عادی تھے ان کا جذبہ رفتہ رفتہ ضد بن چکا تھا اور اس ضد کو پروان چڑھانے میں بعض ایسے کوتاہ کار عناصر کی ایک خاص روش کا ہاتھ بھی تھا جو قربانی و ایثار' جذبہ و اعتقاد اور ایمان و اخلاص میں تو ان سے کوسوں پیچھے تھے لیکن اثر و رسوخ' دولت و ثروت اور جاہ و منصب میں منزلوں آگے تھے۔

ماضی مرحوم

احرار ۱۹۴۶ء میں بھی ۱۹۲۰ء (تحریک خلافت) کے زمانے میں گھوم رہے تھے۔ حالانکہ زمانہ چھبیس برس آگے نکل چکا اور دو قومی نظریہ پیدا ہو کر جوان ہو گیا تھا۔ ان کا اعتقاد ہنوز نظری سیاست پر تھا۔ عام مسلمان عملی سیاست میں ڈوب چکے تھے۔ انھیں تاریخ کے اس عمل سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کہ قوموں اور ملکوں کی سیاسیات میں خاص قسم کے معاشی حالات بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مسلمان اعتقادات کی باتیں تو ان سے سن کر خوش ہوتے لیکن معاملات کے وقت ان کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا جو ان کے حقوق و مراعات کا نام لیتے اور ہم سایہ قوم کی مسلمان آزادی کا ذکر چھیڑتے تھے۔ انگریز اسلام اور ملک دونوں کا دشمن تھا لیکن مسلمانوں کے ہاتھ اتنے بلند نہ تھے کہ وہ اس کی آستین سے دشنہ و خنجر نکال لیں۔ ان کی نگاہیں روزمرہ کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھ کر خشم گین ہوتی تھیں جن کا سرچشمہ ہم سایہ قوم کے لوگ تھے۔

احرار اور لیگ

احرار کو غیر شعوری زعم تھا کہ وہ صورتاً یا سیرتاً اسلام سے قریب ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن میں اس کے اثرات بھی تھے، لیکن لیگ کے راہ نما مسلمان عوام کی روزمرہ کی زندگی میں گھس چکے تھے اور ان کی طبعی خواہشات کو متشکل کر کے اس کا نام پاکستان رکھ دیا تھا۔ پاکستان ابتداءً ہندوؤں سے مسلمانوں کی اجتماعی ناراضی کا اظہار تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے اسلامی لیکن مادی تقاضوں کا مظہر ہو گیا۔ احرار پاکستان کے مجوزین کی طبقاتی سیرت اور سیاسی کردار کو زیر بحث لا کر اپنے جائز خدشات کا ''منفی طریق'' سے اظہار کرتے تھے۔ انھیں اس سے غرض نہ تھی کہ مسلمان عوام کیا چاہتے ہیں وہ صرف اس سے بحث کرتے تھے کہ جن کی معرفت چاہتے ہیں وہ کون ہیں؟ چودھری افضل حق مرحوم نے انھیں آخری ایام زندگی میں متنبہ بھی کیا تھا کہ پاکستان کی مخالفت نہ کرنا دکھی

دلوں کی فریاد ہے لیکن ان کی جذباتی سیاست نے اپنے ہی قائد کی بات کو آویزۂ گوش بنانے سے گریز کیا۔

وجہِ مُغایَرت

ضد یوں پیدا ہوئی کہ لیگ کے دولت مند اکابر ان کی غریبی پر طعن توڑتے اور انھیں ہندوؤں کا زر خرید کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک سچا دل گالیوں کی اجتماعی یلغار سے بگڑے گا۔ پھر یہ بگاڑ اس صورت میں اور بھی مضبوط ہوتا ہے جب گالی دینے والا خود گالی ہو اور الزام لگانے والا فی نفسہٖ الزام ہو۔ احرار نے کس مپرسی، غصے، جھنجھلاہٹ اور ضد میں پاکستان کے ملی موقف کی اہمیت کو نظر انداز کر کے نہ صرف لیگ کے راہ نُماؤں سے محاذِ جنگ قائم کر لیا بلکہ اس وقت انتخاب میں کود پڑے۔ جب قومی مستقبل کے سوال پر محض انتخاب ہی نہیں استصواب ہو رہا تھا۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب میں حصہ لینا احرار کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بعض اجزائے جماعت نے ضد میں آ کر یونینسٹوں کا ہاتھ بٹایا۔ جس سے احرار کے اجتماعی وقار کو سخت دھکا لگا لیکن اس میں عام احرار یا اکابر احرار کا کوئی حصہ نہ تھا۔ چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کے قائد مولانا مظہر علی اظہر تھے جن کا انفرادی ذہن احرار کا جماعتی ذہن سمجھا جاتا تھا...... چوں کہ احرار راہ نُماؤں میں سیاسی اُصولوں کے بجائے ذاتی دوستیوں کا میلان ہی غالب رہا اس لیے ایک کی بات پر سب طوعاً یا کرہاً سر جھکا دیتے تھے...... شاہ جی ''انتخابی یدھ'' میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے جب جماعت کا فیصلہ ہوا اور مولانا مظہر علی اظہر نے پہلی انتخابی تقریر کی تو شاہ جی سری نگر میں تھے۔ مولانا کی تقریر کے ایک ماہ بعد لاہور تشریف لائے تو نہ صرف انتخاب لڑنے کے فیصلے پر ناراض ہوئے بلکہ مولانا مظہر علی اظہر سے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ ''آپ نے سیاسیات میں ذاتیات کو لا کر ایک بُری مثال قائم کی ہے، براہِ کرم آئندہ اس موضوع سے پرہیز کیجیے''...... اب یہ کوشش کی گئی کہ شاہ جی بھی انتخابی مہم میں حصہ لیں۔ شاہ جی نے یونینسٹوں پر تو تبرا بھیجا لیکن اتنا بہ منت راضی ہو گئے کہ صرف آزمودہ احرار امیدواروں ہی کے حلقہ ہائے انتخاب

میں جائیں گے۔ اس زمانے میں آپ نے جو تقریریں کیں ان میں مستقبل کے خدشات بالتفصیل بیان کیے لیکن رنگینی و شیرینی کا وہ انداز ناپید ہی رہا جو زبان و دل کے متحد ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انتخاب میں احرار کو متوقع شکست ہوئی ان کا ایک امیدوار بھی کام یاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو بعض ناگفتہ بہ حقائق کا پتا چلا تو سخت دل برداشتہ ہوئے بلکہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ادھر وزارتی مشن ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ احرار راہ نُماؤں کا وہ قبیلہ جس کی دوستی قابلِ رشک سمجھی جاتی تھی اپنے اندرونی اختلافات کے باعث بٹنے اور بکھرنے لگا۔

مولانا ظفر علی خاں اور غازی عبدالرحمٰن ۱۹۳۱ء ہی میں الگ ہو گئے تھے' وہ صرف نیو اٹھانے میں شریک ہوئے تھے اور بس' تحریک شہید گنج کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بھی ذہنی علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۹۴۰ء کے وسط میں کانگرس میں چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے رہا ہوتے ہی شملہ کانفرنس کے موقع پر اعلان کر دیا کہ ان کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ احرار سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی اور بھارتی شہری ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹۴۷ء کے شروع میں احرار سے استعفٰی دے دیا اور انفرادی طور پر پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ پاکستان بنا تو شاہ جی نے جماعت کے نام ایک خط لکھا کہ احرار کو اپنی سیاسی حیثیت ختم کر دینی چاہیے۔ کچھ دنوں بعد احرار کا ایک ایسا گروہ لیگ کی طرف راجع ہونے لگا جس میں سیاسی شکست خوردگی کا احساس نمایاں تھا۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ایک کھلی کانفرنس منعقد کر کے احرار نے لیگ میں ادغام کا اعلان کیا اور جماعت تبلیغی بنا دی۔ اس تبلیغی تنظیم نے قادیانیت کی سرکوبی شروع کی۔ رفتہ رفتہ پاکستان کے سبھی علما ہم نوا ہو گئے۔ اس ہم نوائی نے

قادیانیت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کی صورت پیدا کی' فروری ۱۹۵۳ء میں "راست اقدام" کی آگ بھڑک اٹھی' حکومت کو لاہور میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا...... اواخر دسمبر ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب نے مجلسِ احرار کو خلافِ قانون قرار دے کر سامان وغیرہ پر قبضہ کر لیا دفاتر سربمہر کر دیئے' کئی سال بعد نواب مظفر علی قزلباش ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ ہوئے تو انھوں نے ۱۸۔ اگست ۱۹۵۸ء کو یہ پابندی ختم کر دی۔ لیکن احرار میں جو لوگ مذہبی اور دینی مزاج و طبیعت رکھتے تھے انھوں نے شاہ جی کی قیادت میں مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت ﷺ کی بنا ڈالی اور قادیانیت کے خلاف سرگرم ہو گئے جن کے پیش نظر شروع ہی سے امور سیاست تھے۔ وہ عوامی لیگ میں چلے گئے لیکن بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا چُوم کے چھوڑ دیا۔ اُدھر خلاف قانون ہو کر بھی احراری ذہن علیٰ حالہ قائم رہا۔ پنجاب کے شہروں میں نہ صرف اس کے مضبوط حلقے تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی ان میں ایسا استحکام اور انضباط تھا جس نے حوادث وافکار کی طویل گردشوں کے بعد ایک قبیلوی عصبیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا...... مندرجہ بالا تصریحات کا تجزیاتی خلاصہ یہ ہے۔

خلاصۂ احرار

۱۔ احرار پنجاب کے ادنیٰ متوسط طبقے کے شہریوں کی ایک ایسی تحریک تھے جس میں جوش و جذبہ وافر تھا۔ وہ لیگ کے ہمہ گیر سیاسی ذہن اور کانگرس کی ہمہ گیر تنظیم کے مقابلہ میں سیاسیات و مذہبیات کے ترکیبی عناصر کا ایک جانثار اور جان ہار مجموعہ تھے ان میں وسعت اور تنوع نہ تھا وہ زیادہ تر پنجاب تک محدود تھے اور ان کے پیروکار عموماً ادنیٰ درمیانے درجہ کے شہری لوگ تھے۔

۲۔ ان میں سیاست کی یک رنگی کے بجائے رفاقت کی ہم رنگی کا جذبہ کارفرما تھا۔

۳۔ داخلی طور پر ان میں خیالات کا ٹکراؤ بھی تھا لیکن اینٹی برٹش ذہن کی مشترکہ چھاپ نے انھیں متحد کر رکھا تھا۔

۴۔ جن طاقتوں کے خلاف صف آرا تھے ان کی مختلف الاصل جارحیت کے خلاف مذہبی

زبان میں سیاسی اثر پیدا کرتے تھے۔

۵۔ مسلم لیگ کے فروغ سے پہلے اور خلافت کمیٹی کی رحلت کے بعد ہندوستان کے شمال مغربی مسلمانوں میں مضبوط ترین عوامی جماعت تھے اُن کا واحد پروگرام انگریزی حکومت کا خاتمہ تھا۔

۶۔ ان کا جماعتی وجود کانگرس اور جمعیت العلما کے منشا کے خلاف تھا اور یہ دونوں جماعتیں احرار سے کسی حال میں بھی متفق نہ تھیں، مگر کئی احرار راہ نما کانگرس اور جمعیت العلما کے ذہن کی سفارت کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی سے یک گونہ عقیدت رکھتے اور ان کی ذات کے لیے نبرد آزما ہوتے تھے۔

۷۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی تحریک میں للہی جذبے سے بے مثال قربانیاں کیں حتیٰ کہ اپنی عمروں کا بیش تر حصہ جیلوں میں گلا دیا۔ لیکن کانگرس اور لیگ دونوں نے صرفِ نظر سے کام لیا، جب وہ برطانوی حکومت کے خلاف کانگرس کے ذہن کی تائید کرتے تو مسلمان بدکتے جب مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے تو کانگرسیوں کو ناگوار گزرتا اور جب مدح صحابہ جیسی تحریک میں راہ نمایانہ حصہ لیتے تو خرد مسلک مسلمانوں میں مذہبی دیوانگی کے سزاوار ہوتے۔ الغرض انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں اپنے دوائر میں ان کے خلاف تھے۔

۸۔ احرار کسی خاص فکری تحریک کے مظہر نہ تھے، مگر ایجی ٹیشن برپا کرنے اور پروپیگنڈا رچانے کے فن میں بے مثال تھے۔

۹۔ ان کے نظریات میں رومانی تضاد تھا مثلاً سیاست میں اینٹی برٹش ذہن کے وارث، مذہب میں حکومت الٰہیہ کے مبلغ، ثقافت میں اسلامیات کے دِل دادہ، معاشیات میں دولت کی برابر تقسیم کے داعی، غرض ان کی تقریروں کا لُبِّ لباب قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کا مرکب ہوتا اور مذہب ہی کے نام پر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے۔

۱۰۔ اُنھوں نے احتجاجی سیاسی ذہن پیدا کیا لیکن تنظیم نہیں۔ چودھری افضل حق مرحوم سے

زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا وہ تنظیم کو خدائی خدمت گار تحریک کے ہم پایہ بنا لیتے۔ لیکن ان کی موت کے بعد جماعت کا یہ پہلو کمزور ہو گیا۔ شاہ جی جوڑ توڑ کے آدمی نہیں تھے وہ ایک رواں دواں انسان تھے۔

۱۱۔ احرار نے ساری زندگی شہروں یا قصبوں کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائے رکھا۔ دیہات کا رُخ دیر بعد کیا لیکن تبلیغی حیثیت سے۔ مرزائیت کے خلاف' اصلاح الرسوم اور بدعات کی بیخ کنی کے لیے یا پھر سیرت کے جلسوں میں!

شاہ جی مدّت تک لوگوں کو اَلسّلام علیکم کہنا سکھاتے رہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج کے مسائل پر مسلسل وعظ کیے مگر لوگوں کے معاشی یا مجلسی مسائل کو تنظیمی اعتبار سے چھوا تک نہیں البتہ پنجابی مسلمانوں کو تجارت کی راہ پر لانے میں شاہ جی اور احرار نے عظیم خدمات انجام دیں۔

۱۲۔ احرار میں قربانی' احتجاج' حوصلہ اور خطابت کا جوہر وافر تھا' لیکن فکر' نظر کسوٹی اور قیادت کا تناسب مُقابلتہً کم تر تھا۔ انھوں نے زمانے کے مطابق چلنے سے ہمیشہ گریز کیا ان میں سپاہی ہی سپاہی تھے لیکن مدبر الشاذ کالمعدوم[1]...... وہ ہنگامہ کے ایک لمحہ کو مصلحت کی سوسالہ زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ میدان میں بلا کے لڑ دیئے تھے لیکن ہزارہ شیوہ سیاست دان نہیں تھے۔

۱۳۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری وسائل کا فقدان تھا جو کچھ تھے اپنے ہی اندر تھے' ان کی ''سپلائی لائنیں'' خارج میں نہ تھیں۔ وہ فقر وفاقہ اور جوش وغضب کا ہراول دستہ تھے۔

۱۴۔ انھیں اُمرا کے ذہن سے حد درجہ تنفر تھا اس تنفر ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے تحریکِ پاکستان کو عوام کی بجائے خواص کے آئینہ میں دیکھا اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ:

''جن لیگیوں اور کانگرسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مساوات سے گھن آتی ہے وہ سن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں' نہ وطنی۔ وہ لٹیروں کا ذہن رکھتے ہیں ان کا اور احرار کا ساتھ نبھ نہیں سکتا..... ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم تقسیم ہند کے قائل ہو؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے

---

[1] النادرُ کالمعدُوم

قبل سائل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم دولت کی منصفانہ تقسیم کے قائل ہو؟ اگر قائل ہو تو پھر ہندوستان ایک طرف رہا ہم شہروں کی تقسیم کے بھی قائل ہیں لیکن ہم اس کے سخت خلاف ہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دے کر کسی یزید جیسے مسلمان کے لیے تختِ سلطنت بچھایا جائے۔ ''(تاریخِ احرار صفحہ ل م) جان گنتھر کے نزدیک احرار مذہبی اعتبار سے فرقہ پسند فدائی اور سیاسی اعتبار سے انتہاپسند سیاسئین تھے (دورِ حاضر کا اسلام) لیکن ماڈرن اسلام ان انڈیا...... کے مصنف مسٹر ویلفر یڈسی سمتھ کا خیال تھا کہ احرار ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی پہلی مسلم سوشلسٹ تحریک ہیں''۔

ان محاسن ومعایب کے پس منظر میں احرار کی پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تحریک کس بے دردی سے برباد ہو گئی...... تاہم ایک مؤرخ واقعات کی چھان پھٹک کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ احرار نے جس ذہن کی آبیاری کی اس کی بہت سی شاخیں ثمر آور ہوئیں' مثلاً:-

۱۔ مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں خلافِ سامراج ذہن پیدا کیا جو پختہ ہو کر ان کی فطرت ہو گیا۔ اس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر درمیانے درجے کے مفلوک الحال لوگ تھے۔

۲۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کا ذہن مسلمان امرا کے استحصالات سے برافروختہ ہو کر طبقاتی شعور کی راہ پر آ گیا۔ اس جماعت کا وجود بازار سیاست میں خرید و فروخت سے ہمیشہ ماورا رہا۔

۳۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی جس کا عام حالات میں قحط تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں اچھے مقرروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے ذہنی انقلاب کی آبیاری میں قابلِ قدر حصہ لیا۔

۵۔ عام لوگوں کی چمڑی میں سے استحصالی گروہ کا خوف جاتا رہا' غربا میں احساس خودی

توانا ہونے لگا۔

٦۔ مسلمانوں میں پہلے کی بہ نسبت کئی سو گنا بدعات کا خاتمہ ہو گیا اور وہ بعض معاشری گُم راہیوں سے بچ نکلے۔

بعض تُھڑ دِلے سیاست دان اس طبقاتی ذہن کو احرار کا پیدا کیا ہوا ذہن تسلیم کرنے سے شاید ہچکچائیں یُوں بھی تاریخ شکست خوردہ لوگوں سے کبھی انصاف نہیں کرتی لیکن یہ ذہن (بغیر نام) بہر حال پاکستان کے مستقبل کا ذہن ہے اور دنیا کے ضمیر میں یہ ہیجان برپا ہو چکا ہے کہ سرمایہ داری کا نظام ختم ہونا چاہیے' دولت کی غلط تقسیم نے کروڑوں انسانوں کو ایک طرف مفلوج دوسری طرف مشتعل کر رکھا ہے۔

میرزائیت

پاکستان سے پہلے

مسلمانوں اور میرزائیوں میں ٹکراؤ کی جو صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں اُن کی بنیاد اس دن رکھی گئی جب ۱۸۸۰ء میں میرزا غلام احمد نے اپنے مُلہم من اللہ ہونے کا دعوٰی کیا[1]۔ اسی سال آپ نے ''براہین احمدیہ'' لکھی جس میں اپنے مجدّد ہونے کا اعلان کیا۔ یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو آپ نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کا انکشاف کیا اور ''ظلی نبی'' کی مصطلحہ ایجاد فرمائی۔ نومبر ۱۹۰۴ء میں آپ نے سیال کوٹ کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے ''مثیل کرشن'' ہونے کا دعوٰی کیا پھر فرمایا کہ آپ ہر مذہب کے اوتار ہیں۔ ۲۶۔ مئی ۱۹۰۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس اثنا میں (۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک) جن مقاصد و مصالح کی آبیاری کی گئی ان کے برگ و بار کا خلاصہ یہ ہے۔

اولاً میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں سے مناظروں کی بنا رکھ کر مسلمانوں کی ذہنی زندگی کو ایک ایسے الجھاؤ میں پھنسا دیا جس کا بدیہی نتیجہ ان حالات میں انگریزی حکومت کی

---

[1] دیکھو ریویو آف ریلیجنز بابت مئی ۱۹۰۶ء نمبر ۵ جلد ۵ صفحہ ۱۶۴۔

مصلحتوں کے لیے نفع آور تھا۔

ثانیاً آریہ سماجیوں سے تو تکار کی راہ پیدا کی چنانچہ سب سے پہلا مناظرہ آپ نے اوائل مارچ ۱۸۸۶ء میں لالہ مرلی دھر آریہ سماجی سے ہوشیار پور میں کیا وہاں پہلی دفعہ اُس دُشنام و تعریض کی بنا رکھی گئی جس نے آیندہ چل کر راجپال اور بعض دوسرے شاتمِ رسول پیدا کیے اور یہ سب میرزا صاحب کے مباہلوں کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کا فائدہ برطانوی حکومت کے تفریقی مقاصد کو پہنچتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بدگوئی کی مہم کا سبب میرزا صاحب کے یہی مباہلے اور مجادلے تھے۔ آخر علما کے ایک گروہ میں ظلی نبوت کے دعوٰی کی مزاحمت شروع ہوگئی، مولوی محمد حسین بٹالوی جو میرزا صاحب کے دعوٰی نبوّت سے پہلے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کرتے اور تنسیخِ جہاد کی جدوجہد میں آپ کے ساتھ رہے تھے ایکا ایکی فرنٹ ہو گئے۔ عام مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔

جن لوگوں کو آپ کے خدوخال کا قریبی علم تھا اُنھوں نے جوابی فتوے صادر کیے یہ فتوے پہلے پہل ۱۸۹۰ء میں جاری کیے گئے۔ سب سے پہلا فتوٰی لدھیانہ کے علما نے جاری کیا جن میں مولانا مُحمد عبداللہ اور مولانا عبدالعزیز رحمہم اللہ تعالیٰ پیش پیش تھے۔ ان کی تائید میں مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے فتوٰی صادر کیا پھر دہلی، آگرہ، حیدر آباد اور بنگال کے علما نے فتاوٰی جاری کیے تا آنکہ میرزا صاحب کی مہدویت اور نبوت مسلمانوں میں نزاع کا باعث ہو گئی دونوں طرف مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا اور وہ توجہ جو انگریزوں کی طرف تھی میرزا صاحب کی طرف منتقل ہو گئی یا اُنھوں نے اپنی طرف پھیر لی۔ میرزا صاحب نے ظلی نبوت کے جو کمالات دکھائے اس کی فصاحت و بلاغت کے نمونے آیندہ صفحات میں ضمنی مباحث کی مناسبت سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

مقدمہ بازی

ان مباحثوں اور مباہلوں کا ایک نتیجہ اور نکلا کہ نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی۔ سب سے پہلا مقدمہ پادری کلارک نے کیا اس نے الزام لگایا کہ میرزا صاحب نے اپنے کسی الہام کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایک شخص عبدالحمید کو ان کے قتل پر مامور کیا ہے۔ دوسرا مقدمہ پولیس نے ۱۸۹۸ء میں ایک پیشین گوئی کی بنا پر دائر کیا جس میں مولانا محمد حسین بٹالوی کا رشتۂ حیات منقطع کیے جانے کا اشارہ تھا۔ اسی طرح ۱۹۰۲ء کے آخر میں ایک مسلمان نے جہلم میں دو مقدمے دائر کیے۔ ہر مقدمہ میں میرزا صاحب چھوڑ دیئے گئے۔ آریوں سے مناظروں میں بدگوئی کی سزا میرزا صاحب کے بجائے اسلام کو بھگتنا پڑی چنانچہ ستیارتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۷۵ء میں راجا جے کشن داس سی ایس آئی کے زیر اہتمام بنارس میں چھپا تھا اور جس کے حقوق سوامی دیانند نے ان کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے ابتداءً بارہ ابواب پر مشتمل تھا۔ اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ میرزا صاحب کی ان تحریروں کے بعد ہوا جن میں آریوں کے نیوگ جیسے معاشرتی مسئلے کو چھیڑ کر ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کے بعض عقائد کو مضحک قرار دیا گیا تھا' سوامی دیانند ۳۰۔ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو انتقال کر گئے تو میرزا صاحب نے ان کی موت کو بھی اپنی پیش گوئیوں سے وابستہ کر لیا۔ چنانچہ ان کی رحلت کے بعد ستیارتھ پرکاش کا جو دوسرا ایڈیشن چھپا' اس میں تیرھویں اور چودھویں باب کا اضافہ تھا جن میں خدا اور رسول پر رکیک حملے کیے گئے تھے' ایک میرزائی قاسم علی نے انیسویں صدی کا مہاشی دیانند شائع کی جس میں آریہ سماج کے بانی کو چتھاڑا اُسی کا نتیجہ تھا ''رنگیلا رسول'' (خاکم بدہن) جس کے مصنف پنڈت چمپاوتی ایم اے پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور اور ناشر مہاشہ راجپال تھے[1]

غلام احمد کو ان کی زندگی ہی میں ان دعوی ہائے مہدویت اور نبوت کی بنا پر گھیرا گیا۔ گو

---

[1] مولانا مظہر علی اظہر کی کتاب ستیارتھ پرکاش اور میرزا غلام احمد میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

ان کے دعاوی کو پڑھے لکھے لوگوں میں محض مسخرے پن سے تعبیر کیا گیا مگر عام مسلمانوں نے ان دعاوی سے اجتماعاً کوئی دل چسپی نہ لی۔ ان کے تعاقب میں مولوی ثناء اللہ امرت سری نے بڑا نام پیدا کیا، لیکن میرزا صاحب کی وفات کے بعد اصل خرابی میرزا محمود احمد کے عہد میں شروع ہوئی۔ حکیم نور الدین خلیفہ اول کا انتقال ہو گیا تو میرزا محمود احمد مصلح موعود کا لبادہ اوڑھ کر بزعم خویش عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن بیٹھے۔

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸) سے لے کر دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے آغاز تک میرزائیت ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز کی طرح خود بخود کھلتی اور بکھرتی چلی گئی۔ عامۃ الناس کو رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ میرزائیت کا مافی الضمیر کیا ہے؟ اور اس کے ظاہری و باطنی وجود میں کس قدر تفاوت یا مطابقت ہے؟ حکیم نور الدین کی حیات تک عام لوگوں میں اس کا تبلیغی کردار ہی نمایاں رہا۔ لیکن میرزا محمود احمد کی خلافت نشینی نے چہرے کی تمام نقابیں اُٹھا دیں اور لوگ غالباً پہلی دفعہ پہچاننے لگے کہ اس تبلیغ کے پس منظر میں جو تنظیم قائم ہوئی ہے اسے ایک سیاسی تحریک بنانے میں کن عوامل و عناصر کا ہاتھ ہے۔

چنانچہ پہلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں بالخصوص انگریزوں کی فتح پر اس تحریک یا تنظیم نے جو کارنامے سرانجام دیے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط پر جس مسرت کا اظہار کیا اس سے مسلمانوں کے کان کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کے دینی راہ نماؤں نے پہلی دفعہ میرزائیت کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔

مولانا ظفر علی خاں کی مزاحمت

اس وقت تک میرزا غلام احمد کے بارے میں عوام و خواص کی معلومات زیادہ تر سماعی تھیں اور لوگ نظر بہ ظاہر انھیں اسلام کا ایک مبلغ و مناظر سمجھتے تھے اور ان کی جماعت کو بوجوہ ایک تبلیغی جماعت لیکن اسلامی ملکوں کی تاخت و تاراج پر میرزائیوں نے جو چراغاں کیا اس سے عام

مسلمان نہ صرف برگشتہ ہو گئے بلکہ میرزائیت کا توڑ قرآن وحدیث سے کیا جانے لگا۔ اس وقت میرزائیت کی سیاسی کارگزاریوں کو بوجوہ چیلنج نہیں کیا گیا بلکہ اس کی مذہبی عمارت کو ڈھانے کے لیے مذہب ہی کو واسطہ بنایا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مزاحمت کا جوذہن تحریک بن گیا۔ اس کے داعیٔ اوّل مولانا ظفر علی خان مدیر ''زمین دار'' تھے۔ مولانا نے میرزائیت کے خلاف جمہور المسلمین میں ہنگامہ برپا کر دیا اور میرزائیت کو شہروں سے بھاگ کر دیہات میں پناہ لینا پڑی.........مولانا نے تردید میرزائیت کے ضمن میں بعض طویل اور گراں قدر مقالے لکھے۔ جو غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں بعض فکاہی نظموں کے ساتھ ''ارمغان قادیان'' کے نام سے اشاعت پزیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے اس کتاب کی تمام جلدیں میرزائیوں نے اپنے ایجنٹوں کی معرفت خرید کر جلادیں اور مولانا اختر علی خان کو آئندہ اشاعت سے باز رکھنے کے لیے رام کر لیا' مولانا ظفر علی خان کی پیدا کی ہوئی اس عوامی تحریک کو اُسی جوش و ہیجان کے ساتھ بعض سیاسی اور دینی حلقوں نے اپنانا شروع کیا چنانچہ چودھری افضل حق مرحوم نے بعض تلخ سیاسی تجربات کی بناپر احرار رفقا کو آمادہ کیا کہ وہ اس تحریک کو ہاتھ میں لے کر قادیانیت کی اجتماعی مضرتوں کا جماعتی مقابلہ کریں۔

احرار کی جماعتی مزاحمت

شاہ جی نے میدان مبارزت کی کمان خود سنبھال لی یہ پہلا موقع تھا کہ میرزائیت کو ایک سخت جان طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا جس کی پاداش میں احرار کو صعوبتوں پر صعوبتیں سہنا پڑیں حتیٰ کہ مذہب کے اس محاذ کا خمیازہ انھوں نے سیاسی محاذ کی پے در پے ناکامیوں میں بھگتا۔ لیکن میرزائی حملوں اور برطانوی مزاحمتوں کے باوجود میرزائیت اور اس کے پیرووں کو احرار نے ایک ایسی پوزیشن میں لا کر کھڑا کیا کہ:

۱۔ عام مسلمانوں میں ان کا وجود اعتماد سے خارج ہو گیا۔

۲۔ ان کے تبلیغی دروازے بُری طرح بند ہو گئے۔

۳۔ انھیں مذہباً مسلمانوں سے خارج سمجھا جانے لگا اور سیاستاً برطانوی اقتدار کا مہرہ، جس کا اقرار خود میرزا محمود احمد نے اپنے بہت سے خطبوں میں کیا ہے، مثلاً:

''ہماری جماعت وہ ہے جسے شروع ہی سے لوگ کہتے چلے آتے ہیں کہ یہ خوشامدی اور گورنمنٹ کے پٹھو ہیں، بعض لوگ ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ کے جاسوس ہیں، پنجابی محاورہ کے مطابق ہمیں ''جھولی چک'' اور نئے زمین داری (غالباً اخبار ''زمین دار'' مراد ہے) محاورہ کے مطابق ہمیں ''ٹوڈی'' کہا جاتا ہے۔

(خطبہ میرزا محمود احمد
الفضل قادیان جلد نمبر ۲۲
نمبر ۵۸ مورخہ ۱۱۔ نومبر ۱۹۳۴ء)

۴۔ احرار کی مزاحمت سے پہلے نئی نسل کے انگریزی پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک جمعیت میرزائیوں کے تبلیغی جلسوں میں شریک ہو کر ان کی بالواسطہ تقویت کا موجب بنتی تھی اس سے ناخواندہ مسلمانوں میں میرزائیت کا مذہبی اعتبار بڑھتا تھا، احرار نے یہ سب نقشہ پلٹ ڈالا حتیٰ کہ مسلمان خواص کو بھی جمہور کی ناراضی کے پیش نظر ان کی معاونت سے دست کش ہونا پڑا۔

۵۔ مسلمانوں نے میرزائیوں کو اپنے بیش تر اداروں سے نکال باہر کیا اور عام انتخاب میں ان کے چناؤ کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

۶۔ سب سے بڑی جیت یہ ہوئی کہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلمان مفکر علامہ اقبالؒ نے قادیانی تحریک کے مالہ و ماعلیہ کا مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کیا چنانچہ میرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کے مجوز حضرت علامہ ہی تھے۔ میرزائیت سے متعلق علامہ اقبالؒ کے افکار بلاشبہ حرفِ آخر ہیں۔

(ملاحظہ ہو علامہ اقبال کا بیان مطبوعہ سٹیٹسمین، ۱۰۔ جون ۱۹۳۵ء)

۷۔ مولانا ظفر علی خان اور جماعتِ احرار کی پیدا کردہ تحریک کے درمیانی دنوں میں جامعہ

عثمانیہ حیدر آباد دکن کے صدر شعبہ معاشیات پروفیسر محمد الیاس برنی نے ''قادیانی مذہب'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کی لوح پر عبارتِ ذیل درج ہے۔

''دین وملّت کی صلاح وفلاح کا دعویٰ کر کے کس کس طرح تخریب وتفرقہ کی سازش کی گئی قادیانیت کا یہ فریب اسلام کی تاریخ میں یادگار رہے گا اور انجام بھی عبرت آموز ہوگا''۔

''قادیانی مذہب'' کی اشاعت سے نہ صرف میرزائیوں میں ہل چل مچ گئی بلکہ پڑھے لکھے لوگوں میں ان کی قلعی کھلنے لگی۔

۸۔ علامہ اقبالؒ کی ہم نوائی میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج میرزا سر ظفر علی نے بھی بہ دلائل ثابت کیا کہ قومیں نبوتوں کی بنا پر معرضِ وجود میں آتیں اور الگ الگ شمار ہوتی ہیں۔

۹۔ میرزائیت کے کاسہء سر پر سب سے کاری قانونی ضرب مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداس پور کے فیصلے سے پڑی' اس فیصلے سے میرزائی بوکھلا گئے۔ انھوں نے بعض حصّوں کو محذوف کرانے کے لیے عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا۔ غرض یہ پہلا عدالتی جائزہ تھا کہ میرزائیوں کی ''ریاست اندر ریاست'' کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا گیا اور حکومت کو بھی غالباً پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ اس کا ''خود کاشتہ[1] پودا'' خودسر بھی ہے۔

قادیانیت کا مسلک

احرار کو اصرار تھا کہ:

۱۔ محمد ﷺ کی ختم المرسلینی کے بعد اگر کوئی شخص ظلی یا بروزی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کے موجودہ زوال سے فائدہ اُٹھا کر ان کی دینی وحدت کو بھی پارہ پارہ کرتا ہے جس کے نتائج دین و دنیا دونوں کے لئے خسران کا موجب ہوں گے اور

---

[1] ملاحظہ ہو اعتراف مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم بہ عنوان درخواست بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہٗ من جانب میرزا غلام احمد مورخہ ۲۴۔ (فروری ۱۸۹۸ء)

میرزائیت فی زمانہ اسی خسران کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ میرزائی برٹش امپریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

۳۔ وہ عام مسلمانوں سے نہ صرف مذہبی علیحدگی رکھتے ہیں بلکہ پسماندہ مسلمانوں کا مجلسی و معاشی مقاطعہ بھی کرتے ہیں جس کا واحد مقصد انھیں مرعوب وخوف زدہ کر کے اپنے حلقہ بیعت میں شامل کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالم کام کرتے ہیں۔ (دیکھو تاریخ احرار صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۴)

بیّن شہادت

احرار کے ان دعاوی اور بہ الفاظ میرزا محمود احمد الزامات کی پرکھ کے لیے ضروری ہے کہ ہم میرزائیوں اور ان کے محسنوں کی مستند تحریروں سے اصل حقیقت معلوم کریں اس سے میرزائیوں کو یہ شکایت نہ ہوگی کہ انھیں کسی پرائی حکایت یا روایت پر ملزم گردانا گیا ہے۔ اس طرح احرار کے دعاوی کی اصلیت بھی معلوم ہو جائے گی کہ وہ جو کچھ بیان کرتے رہے ہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

جو لوگ پیغمبر یا رسول کہلاتے ہیں ان کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ سب سے پہلے ان کا حسب نسب دیکھا جاتا ہے جس سے عامۃ الناس جاننا چاہتے ہیں کہ مدعی خود کیا ہے؟ ...... اسی اصل کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب سے پہلے میرزا صاحب کے خاندان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

میرزا صاحب "کتاب البریہ" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

"میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹھیاں دی تھیں۔

سر لیپل گریفن نے اپنی کتاب "تاریخ رئیساں پنجاب" میں ان کا تذکرہ کیا ہے"۔

(ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجنز صفحہ ۲۱۹ بابت ماہ جون جلد ۵ نمبر ۶)

اس تذکرہ کا اردو ترجمہ سید نوازش علی شاہ مترجم دفتر لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب نے ۱۹۱۱ء میں سرکار کی خصوصی اجازت سے کیا اور نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس کے زیر اہتمام بڑے تزک واحتشام سے چھپوایا' اس کی جلد دُوم کے صفحہ ٦٦ پر میرزا غلام احمد صاحب کے خاندان کا شجرۂ نسب اور ضروری کوائف درج ہیں۔ انھی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ ہے۔

۱۔ عطا محمد (میرزا صاحب کے دادا) اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیہ اور کھنیا مسلوں (سکھ جماعتوں) سے لڑتے رہے آخرکار عطا محمد اپنی تمام جاگیر کھو کر سردار فتح سنگھ اہلو والیا کی پناہ میں بیگووال چلا گیا جہاں بارہ سال تک امن وامان سے زندگی بسر کی۔

۲۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضٰی (میرزا غلام احمد کے والد) کو واپس بلا لیا۔ اور جدی جاگیر کا بہت بڑا حصہ لوٹا دیا۔ اس پر غلام مرتضٰی اپنے بھائیوں سمیت مہاراجا کی فوج میں داخل ہوا اور کشمیر کی سرحد کے علاوہ دوسرے مقامات پر قابل قدر خدمات انجام دیں۔

۳۔ نونہال سنگھ' شیر سنگھ اور دربار لاہور کے دور دورے میں غلام مرتضٰی فوجی خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۴۱ء میں جرنیل ونطورا کے ساتھ منڈی اور کلو کی طرف بھیجا گیا پھر ۱۸۴۳ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے ''مفسدے[1]'' میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیتے۔

۴۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط ہو گئی لیکن سات سو روپیہ کی پنشن غلام مرتضٰی اور اس کے بھائیوں کو عطا کی گئی۔

۵۔ اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں بہت اچھی خدمات سرانجام دیں۔ غلام مرتضٰی نے بہت سے آدمی بھرتی کیے اس کا بیٹا غلام قادر میرزا غلام احمد کا بھائی اس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا اس نے ۴۶ نیٹو انفنٹری (سیال کوٹ) کے باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ جنرل مذکور

---

[1] حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے خلاف۔

نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں لکھا:

"کہ اِن کا خاندان قادیان ضلع گورداس پور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے۔"

اپنی اس نمک حلالی کا اقرار واعتراف خود میرزا صاحب اور ان کے جانشینوں کو رہا۔ ان کے اپنے الفاظ میں کتابوں کی پچاس الماریاں بھری پڑی تھیں جن میں انگریزوں کے قصیدے مرقوم تھے مگر سکھوں سے اپنی وفاداری کی پوری رُوداد اُسی طرح غائب کر دی جس طرح آج انگریزوں کے چلے جانے پر کاسہ لیسی کا ریکارڈ تلف کیا گیا اور تعبیر وتاویل کا دل چسپ اثاثہ فراہم کر کے اب کئی جلدوں میں تاریخِ احمدیت لکھی گئی ہے۔

میرزا صاحب کے ان خاندانی حالات سے جن واقعات کی نشان دہی ہوتی ہے ان کی تاریخی تفصیلات معلوم کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ میرزا صاحب کے اب وجد نے مغلوں کی گرتی ہوئی دیوار کے زمانے میں سکھوں کا ساتھ دیا اور سکھوں کو زوال آمادہ پایا تو انگریزوں سے رشتہ مودت استوار کیا۔ میرزا صاحب کے دادا اور پردادا نے رام گڑھیا اور کھنیا مسلوں سے جو لڑائیاں لڑیں وہ کسی اسلامی مقصد یا اپنے اقتدار کے لیے نہ تھیں بلکہ ایک مسل کے خلاف دوسری مسل کے حق میں تھیں، کیوں کہ پنجاب کا بیش تر حصہ تاخت وتاراج ہو کر سکھوں کی بارہ مسلوں کے تصرف میں تھا۔ ان میں سے چھے مسلیں دریائے ستلج کے جنوب میں اور چھے شمال میں تھیں۔ میرزا صاحب کے بزرگ ان مسلوں کی باہمی جنگوں میں رام گڑھیا اور کھنیا مسلوں کے برخلاف اہلو والیا مسل کے حلیف تھے۔ چنانچہ اہلو والیا مسل کی شکست خوردگیوں کے باعث میرزا صاحب کے دادا کو قادیان چھوڑ کر سردار فتح سنگھ اہلو والیا کی پناہ میں بیگو وال جانا پڑا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے اکال گڑھ کی فتح یابی کے بعد اہلو والیا مسل کے سردار فتح سنگھ کو رام کرنے کے لیے کپورتھلہ کا قصد کیا۔ سردار مذکور کا باپ سردار بھاگ سنگھ وفات پا چکا تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے پہلے تو ماتم پُرسی کی پھر پگڑی بدل کر اُسے کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ اس مفاہمت ہی کے نتیجہ میں آگے چل کر

میرزا عطا محمد کے خاندان کی جلاوطنی ختم ہوگئی' ۱۸۱۴ء میں خود تو فوت ہو چکا تھا لیکن اس کا بیٹا غلام مرتضٰی مہاراجا کی فوج میں ملازم ہوگیا۔

مہاراجا رنجیت سنگھ اور سردار فتح سنگھ اہلووالیا نے متحد ہو کر ڈسکا فتح کیا پھر قصور پر چڑھائی کی اور خان افتخار حسین خان ممدوٹ کے مورث اعلیٰ نظام الدین خان کو شکست دے کر قبضہ کرلیا۔ اس پر مہاراجا رنجیت سنگھ نے میرزا غلام مرتضٰی کی خدمات سے خوش ہو کر اسے قادیان کی جاگیر کا ایک حصہ واگزار کردیا۔

خدماتِ جلیلہ

غرض سر لیپل ایچ گریفن اور کرنل میسی کی روایت کے مطابق میرزا غلام مرتضٰی نے اپنے بھائیوں سمیت مہاراجا رنجیت سنگھ کی ہر تاخت میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان لڑائیوں کی تفصیلات کا یہ محل نہیں' لیکن ظاہر ہے کہ کشمیر' پشاور اور ہزارہ پر سکھوں نے جتنے حملے کیے وہ مسلمانوں ہی کے خلاف تھے ان حملوں میں میرزا غلام مرتضٰی اور اس کے بھائی سکھوں کی طرف سے سکھوں کے ہم راہ لڑتے رہے۔ اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس دور میں سکھوں سے بڑھ کر مسلمانوں کے املاک و اموال اور عزت و آبرو کا کوئی دشمن نہ تھا ان کا واحد نصب العین مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا تھا۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ دربار لاہور نے اپنے دورِ اقتدار میں جن فوجی خدمات کو سرانجام دیا ان میں ایک بڑا کارنامہ حضرت سید احمد بریلویؒ کی شہادت کا المیہ ہے اس دربار کے جو سردار حضرت سید احمد بریلویؒ اور ان کی جماعت مجاہدین سے مختلف معرکوں میں صف آرا ہوئے ان میں جنرل ونطورا' ہری سنگھ نلوا اور مہاراجا شیر سنگھ فرزند مہاراجا رنجیت سنگھ پیش پیش تھے۔ میرزا کے والد اور بھائی انہی کی معیت میں لڑتے رہے۔ غور کیجیے میرزا صاحب کے ابا اور چچا نے دربار لاہور کی حمایت میں کیا کیا کارنامے سرانجام نہیں دیے ہوں گے۔ حضرت سید احمد بریلویؒ کی

شہادت کا المیہ اصل میں اعلائے کلمہ رب العالمین اور احیائے سنت ختم المرسلین کی تحریک کے قتل کا سانحہ تھا۔

میرزا غلام احمد کے والد میرزا غلام مرتضٰی نے جو گریفن کی روایت کے مطابق سکھوں کی فوج میں تھے لازماً حضرت سید احمد علیہ الرحمۃ اور جماعتِ مجاہدین کا مقابلہ کیا ہو گا' ہزارہ اور پشاور کے معرکوں میں ان کی شرکت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ ہری سنگھ نلوا کے ہم راہ بھی گئے ہوں' بہر حال سید صاحب پر جو بیتی اس کی اَلم ناک رُوداد مولانا غلام رسول مہر کی فاضلانہ تصنیف سید احمد شہید میں بہ تفصیل درج ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ گریفن کی روایات سے جو لف ونشر مرتب ہوتا ہے' اس کے مطابق میرزا صاحب کے والد شیر سنگھ کی ماتحتی میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے لشکر سے ضرور لڑے ہوں گے اس ضمن میں اس کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سید احمد کی شہادت کے بعد ۱۸۴۲ء میں میرزا صاحب کے والد کو ایک پیادہ فوج کا کمانڈر بنا کر پشاور بھیجا گیا جو کامل اعتماد کے بغیر ناممکن تھا۔ ان معرکوں کی سرگزشت تاریخ پنجاب مصنفہ سید محمد لطیف میں بہ صراحت درج ہے۔ بعض زیر نظر مباحث کے پیش نظر قریبی اور یقینی شہادت اسی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ چوں کہ میرزا غلام مرتضٰی نے اپنی فوجی خدمات کا بیش تر حصہ شیر سنگھ کی ماتحتی میں بسر کیا تھا اس لیے شیر سنگھ کے مختصر حالات نذر قارئین ہیں۔

راجا شیر سنگھ

شیر سنگھ مہاراجا رنجیت سنگھ کا دوسرا بیٹا تھا جو اپنی بھاوج مہارانی جنداں سے کش مکش کے بعد گدی پر بیٹھ گیا۔ مہارانی جنداں کے حامیوں میں راجا گلاب سنگھ' راجا ہیرا سنگھ اور سندھانوالیہ کے سردار تھے' مہارانی جنداں اور مہاراجا شیر سنگھ کی فوجوں کے مابین لاہور میں گھمسان کا رن پڑا' شیر سنگھ کے فوجیوں نے دہلی دروازہ اور یکی دروازہ سے لاہور قلعہ تک جو دکان یا مکان نظر پڑا لوٹ

لیا۔ چھتا بازار کو آگ لگا دی۔ حضوری باغ کے چاروں طرف سخت جھڑپیں ہوئیں۔ شیر سنگھ کی سپاہ نے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو ہزار بارہ سو کے قریب طوائفوں کو شہر سے پکڑ لائے اور توپوں کے دہانے پر رسیوں سے باندھ کر کھڑا کر دیا تا کہ اس ''فصیل'' کے عقب میں اپنے آپ کو چھپالیں۔ شاہی مسجد کے چاروں میناروں پر گولہ باری کے لیے توپیں رکھ دیں۔ تمام مسجد کو فوج کی رسدگاہ بنا لیا۔ ادھر قلعہ کے محصورین نے فیصلہ کیا کہ مسجد کو بارود سے اڑا دیں لیکن اس ڈر سے مبادا آگ قلعہ کو لپیٹ لے وہ رک گئے۔ اس محاصرہ میں لاہور کی نصف دُکانیں برباد ہوگئیں، جس مکان میں شہتیر یاں اور بلیاں نظر آئیں اکھاڑ لی گئیں۔ آخر جانبین میں صلح ہو گئی۔ جو لوگ اس معرکے میں کام آئے ان کی لاشیں بے شمار زخمیوں کے ساتھ جلا دی گئیں۔ عام مجروحین نے واویلا کیا تو انھیں یہ کہہ کر آگ کے الاؤ کی بھینٹ کر دیا گیا کہ موت سے کیوں ڈرتے ہو آخر مرنا ہی ہے۔

قدرت کا انتقام ملاحظہ ہو کہ یہی شیر سنگھ جس کی کمانڈ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا سرتن سے جُدا کیا گیا تھا سندھانوالیہ کے سردار اجیت سنگھ کی بندوق کا نشانہ ہو گیا اور اس کا سر فوراً ہی دھڑ سے جُدا کر دیا گیا۔ اس کی خاکستر تک نہ رہی لیکن بالاکوٹ کا مشہد آج بھی لاکھوں انسانوں کی جلوہ گاہِ ارادت ہے۔

۱۸۵۷ء کا سانحہ

جنرل نکلسن نے ۴۶ نیٹو انفنٹری سیالکوٹ کے سپاہیوں کو جس بے دردی سے قتل کرایا وہ ایک لرزہ خیز داستان ہے، سر گریفن نے ان کی قتل گاہ تریموگھاٹ بتائی ہے جو صحیح نہیں، ان سپاہیوں کو راوی کے کنارے قتل کیا گیا اور جو ہندوستانی سپاہی ان کے قتل پر مقرر کیے گئے وہ دن بھر ایک ایک باغی کو باری باری سے گولی کا نشانہ بناتے رہے، ان میں سے بیشتر اس ہوش رُبا نظارے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ جنرل نکلسن کے مظالم اتنے بہیمانہ تھے کہ اکثر انگریز مورخوں اور وقائع نگاروں نے انھیں کو انگریز قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا قرار دیا۔

لارڈ الفنسٹن نے کہا تھا:

”ہماری فوجوں کے مظالم کا تذکرہ روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے' جہاں تک لُوٹ مار کا تعلق ہے ہم نادر شاہ ایرانی سے بھی بازی لے گئے ہیں“۔

اسی جنرل نکلسن نے میرزا غلام احمد کے والد ماجد کو سند عطا کی تھی کہ قادیان ضلع گورداس پور کے خاندانوں میں ان کا خاندان سب سے زیادہ نمک حلال رہا ہے۔

ہر پاکستانی اور ہندوستانی ۱۸۵۷ء کے دل خراش حوادث اور جاں گداز وقائع سے کما حقہ' واقف ہے۔ اب تو خیر انگریز نہیں رہا اور تاریخ کا گرد و غبار بھی بسرعت تمام دُھل گیا ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے لرزہ خیز حالات خود انگریزوں کے عہد میں سامنے آ گئے تھے اس بارے میں بربادیٔ عامہ کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کا خمیازہ تمام ہندوستانیوں کو بھگتنا پڑا۔ گو مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی لڑے تھے لیکن جو مصائب مسلمانوں پر ٹُوٹے اس کے ماتم سے تاریخ انسانی کبھی فارغ نہ ہو گی۔ ان لاکھوں مسلمانوں کو جو بہمہ وجوہ نصاریٰ کی اطاعت کے خلاف تھے اور جن کے رگ و ریشہ میں راست باز علما نے اپنی مساعیٔ پیہم سے جوشِ جہاد بھر دیا تھا وہ ایک ایک کر کے ختم کیے گئے' لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس کام کا ایک مقصد تھا کہ:

”ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان میں حکومت کریں گے“۔

چنانچہ باغیوں کی اس ”عبرت ناک سرکوبی پر لارنس نے اپنی والدہ کو ایک خط میں اظہارِ مسرت کرتے ہوئے لکھا:

”ہم پشاور سے جہلم پیدل پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے چلے آئے' باغیوں سے اسلحہ چھینا' انھیں پھانسیوں پر لٹکایا اور توپ سے باندھ کر اُڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے استعمال کیا اس سے لوگوں کے دل پر ہماری ہیبت بیٹھ گئی۔ ہر چھاؤنی میں اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے“۔

ایک پادری کی بیوہ رقم طراز ہے۔

''بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ موت کی کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو بقیۃ السیف کو توپوں سے باندھ کر اُڑایا گیا''۔

میرزا صاحب کے خاندانی ممدوح جنرل نکلسن نے مسٹر ایڈورڈ کو ایک خط میں لکھا:

''ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کو زندہ جلا سکیں یا ان کی کھالیں اُتار لیں یا گرم سلاخوں سے مدارات کریں۔ پھانسی ایک معمولی سزا ہے''۔

سر ہنری کاٹن کی یادداشتوں میں درج ہے کہ:

''میں نے اپنے سکھ اردلی کی خواہش پر ان بدبخت مسلمانوں کو عالم نزع میں دیکھا جنھیں مشکیں کس کے زمین پر برہنہ بدن لٹا دیا گیا اور ان کے تمام جسم پر گرم تانبے کی سلاخیں داغ دی گئی تھیں۔ میں نے انھیں پستول سے ختم کر دینا ہی مُناسب سمجھا۔ بدنصیب قیدیوں کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبُو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسمُوم بنا رہی تھی''۔

مسٹر ڈی لین ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا کا اقتباس ذیل...... رسل کی ڈائری کے صفحہ ۴۳ (مطبوعہ مئی ۱۸۵۸ء) سے ماخوذ ہے:

''زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی دینے سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا اور انھیں مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں یقیناً عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبّا ہے۔

نِکلسن کا ان دنوں ایک ہی نعرہ تھا' پھانسی پر لے چلو۔ چنانچہ مجنیڈی لکھتا ہے کہ:

''وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی' ہمارا زیادہ وقت ان قیدیوں کو گولی مارنے یا پھانسی دینے میں گزرا' جنھیں کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا لیکن ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار مترشح تھے، جو کسی بڑے مقصد پر جان دینے کی علامتیں تھیں''۔

جنرل نیل کا حکم تھا:

''فتح پور کے قصبے کو حراست میں لے کر تمام آبادی کو تہ تیغ کر دو اور سرغنوں کے سر عمارتوں پر لٹکا دو''۔

وہ لکھتا ہے:

''ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے اُوپر سے رسّی ڈال کر ہاتھی کو ہنکار دیا جاتا ملزم لٹک کر تڑپنے لگتا اور جان کنی کے وقت انگریزی کے ہندسے 8 کی دل چسپ شکل بن کر رہ جاتا''۔

- o عورتوں نے عصمت دری کے خوف سے خودکشیاں کر لیں۔
- o مردہ سپاہیوں کی لاشوں کو بھی درختوں پر لٹکا دیا گیا۔

دہلی اور لکھنو کے شاہی خاندانوں پر جو بیتی وہ ایک مستقل خونیں باب ہے' دہلی کا حال تو یہ تھا کہ جس شخص کے چہرے پر ڈاڑھی نظر آتی یا کسی کے پاجامہ کا پائنچہ اونچا معلوم ہوتا وہ تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا۔

اور اس سارے خونیں تماشے کا ہدایت کار کون تھا؟ بہ قول مسٹر ایڈورڈ ٹامسن ''پستہ قد نکلسن'' جس نے میرزا غلام احمد اور سردار سکندر حیات کے اسلاف کو نمک حلالی کی سندیں عطا کی تھیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ احرار نے اول الذکر کی ''نبوت'' کے خلاف دینی محاذ قائم کیا اور مؤخر الذکر کی وزارت کے خلاف سیاسی محاذ' آج دونوں کی بدولت انھیں بے شمار قوتوں کا ہدف بننا پڑا حتّٰی کہ تحقیقاتی عدالت کی سنگ دلانہ رپورٹ (مصنفہ جسٹس محمد منیر) میں ان کا گوشت چورا ہے پر لٹکا دیا گیا۔ ''غدر'' کے حادثوں اور سانحوں پر W.H. Fitcheit کی کتاب Take of the great Munity سے بہتر تبصرہ ناممکن ہے' وہ ایک پادری کو روایت سے لکھتا ہے:

''ایک دفعہ اس نے عیسائی مبلّغوں کی ایک جماعت سے کہا کہ وہ غدر پر جواب مضمون لکھیں۔ لیکن ہر طالب علم نے کچھ لکھے بغیر خالی کاغذ واپس کر دیے جس کا مطلب خاموش متفقہ

اور نا قابلِ عفو انکار تھا۔[1]

ٹیپوؔ سے ظفرؔ تک

القصہ سُلطان ٹیپو کی شہادت (۱۶۹۹ء) سے جس المیہ کا آغاز ہوا تھا وہ ایک سو اٹھاون برس کی مدت میں بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی (۱۸۵۷ء) پر ایک نئے دَور میں داخل ہو گیا۔

سلطان ٹیپوؔ کی شہادت پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں جن میں ''شمشیرِ گُم شُدہ'' (تلوار گم ہو گئی) الہامی ہے' آخر ۱۸۵۷ء میں قطع ید ہو گیا۔ اب مسلمان سارے ہندوستان میں جسمانی طور پر مغلوب تھے اور صرف دماغوں کا قتلِ عمد باقی تھا۔ اس خاکستر میں جو چنگاریاں رہ گئی تھیں اور جنھیں حضرت سید احمد شہیدؒ کے باقیات الصالحات کہنا صحیح ہو گا وہ اپنے ماضی کے پشتی بان تھے۔ حضرت سید احمد کا جہاد صرف سکھوں ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کا اصل نشانہ انگریز تھے' گوالیار کے فرماں روا دولت راؤ سندھیا کے برادرِ نسبتی ہندو راؤ گھوٹکے کے نام سید احمد ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''وہ غیر جن کا وطن بہت دُور ہے بادشاہ بن گئے جو تاجر سامان بیچ رہے تھے اُنھوں نے سلطنت قائم کر لی''۔

اور ان کے بارے میں ان کا عزم کیا تھا۔ شاہ محمود درانی والئ ہرات کے فرزند شاہ زادہ کامران کو لکھتے ہیں:

''پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں گا' میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے''۔

مومن خان مومن کے ایک نعتیہ قصیدے کے دعائیہ اشعار سے بھی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نزدیک جہاد کی علی التواتر تلقین و ترغیب کا مقصد ہندوستان

---

[1] (غدر کے متعلق مندرجہ بالا حوالے ''انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ'' سے ماخوذ ہیں)

سے انگریزوں کا اخراج تھا۔

(ملاحظہ ہو جماعت مجاہدین مصنفہ غلام رسول مہر صفحہ ۱۱ تا ۱۶)

مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرنے والے سر سید احمد خان ہیں۔

(دیکھو سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۵۲ عنوان افسانہ طرازیاں)

جہادِ کا خوف

انگریزوں نے ہندوستان تو فتح کر لیا لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں جہاد کا جو عقیدہ راسخ تھا وہ اس کی عالمی روح سے غافل نہ تھے' اور اس کا تجربہ انھیں مسلمان ملکوں میں خصوصیت سے ہو رہا تھا بلکہ صلیبی جنگوں کا ایک پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ لائیڈ جارج نے گو بہت بعد میں کہا لیکن انگریزوں کے تحت الشعور میں یہ خیال ہمیشہ جاگزیں رہا کہ قرآن ہمارے راستے کی بہت بڑی روک ہے۔

اپنی اس کھلی ہار (۱۸۵۷ء) کے بعد علما نے پینترا بدلا اور زور دینا شروع کیا کہ ہندوستان دارالسلام سے دارالحرب ہو گیا ہے۔ اس ذہنی صف بندی کی یک گونہ تفصیلات ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ان علمائے کرام کے فتاویٰ بھی درج ہیں جو جسمانی امن کے بعد انگریزی حکومت کے پرستاروں اور گماشتوں کی معرفت حاصل کیے گئے...... مثلاً شمالی ہند کے دورام پوری اور سات لکھنوی علما کا فتویٰ جو سید امیر حسین شاہ اسٹنٹ کمشنر بھاگل پور کے استفتا پر جاری کیا گیا اس پر ۱۷۔ جولائی ۱۸۷۰ء کی تاریخ ثبت ہے "ہندوستان میں جہاد جائز ہے یا نہیں؟" کا جواب دیتے ہوئے ان علمائے کرام کا ارشاد ہے کہ:

"مسلمان رعایا کے پاس نہ اپنے حاکموں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہے نہ ان کے

پاس ہتھیار ہیں، برخلاف اس کے اگر لڑائی شروع کر دی جائے تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا جہاد واجب نہیں۔ ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے"۔

اسی کتاب میں ایک اور فتوی محمڈن سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے مرقوم ہے جس میں جہاد کو بغاوت سے تعبیر کیا گیا اور مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ بغاوت کی صورت میں اپنے حاکموں کا ساتھ دیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت مجاہدین کا قافلہ شمال مغربی سرحدی علاقوں میں سرگرم تھا اور انگریزوں نے ان پر لگاتار چڑھائیاں کر رکھی تھیں...... اس جذبے کو مدھم کرنے کے لیے جمال دین ابن عبداللہ، شیخ عمر، حنفی مفتی مکہ معظمہ، احمد بن ذنبی شافعی مفتی مکہ معظمہ اور حسین بن ابراہیم مالکی مفتی مکہ معظمہ سے اس مطلب کے فتوے حاصل کیے گئے کہ ہندوستان دار السلام ہے۔

علما کے خلاف مقدمات

انگریزوں نے جنگ امبیلہ (سرحد) ۱۸۶۳ء کے بعد اُن مجاہدین و معاونین پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیے جو ہندوستان کو دار الحرب کہتے اور جہاد و غزا کے علَم بردار تھے، ایک پٹھان غزن خان کی مخبری پر مجاہدین کے تمام مددگار پکڑے گئے اور مندرجہ تحت پانچ مقدمہ ہائے سازش کی بنا رکھی گئی۔

۱۔ مقدمۂ سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) میں گیارہ ملزم تھے، مولانا یحییٰ علی صادق پوری ان کے امیر تھے بہ قولِ راونشا مولانا کو "امیر الواعظین" کا خطاب حاصل تھا۔ سر ہربرٹ نے انھیں سزائے موت سناتے ہوئے فیصلہ میں لکھا۔

"یہ شخص اسلام کے قابلِ نفرت اصولوں (جہاد وغیرہ) کی اشاعت کرتا رہا اور اپنی

سازشوں سے برطانوی ہند کو ایک خطرناک سرحدی جنگ میں دھکیل دیا' اس کا تعلق ایک موروثی باغی جہادی خاندان سے ہے"۔

مولانا یحییٰ علی کی سزائے موت اس دلیل سے عمر قید بہ عبور دریائے شور میں بدل دی گئی کہ ڈپٹی کمشنر پھانسی گھر پہنچا اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پانے کو بہت دوست رکھتے اور شہادت سمجھتے ہو لہٰذا سرکار تمھاری چہیتی سزا تمھیں نہیں دے گی تمھاری سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی ہے۔ مولانا کی ڈاڑھی کے بال بہ جبر کتر دیئے گئے تو آپ کترے ہوئے بالوں کو اُٹھا اُٹھا کر کہتے' افسوس نہ کر' تو اللہ کی راہ میں پکڑی گئی اس واسطے کتری گئی[1] اور مجھ سے بازی لے گئی۔ (تواریخ عجیب صفحہ ۴۴)

ان کے علاوہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری اور میاں عبدالغفار کو بھی عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ دونوں نے ۲۸' ۲۸ برس جزیرہ انڈیمان میں بسر کیئے' ان میں قاضی میاں جان جیل ہی میں وفات پا گئے۔

۲۔ مقدمہ سازشِ پٹنہ (۱۸۶۵ء) میں سید صاحب کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری کو موت کی سزا دی گئی جو عمر قید میں تبدیل ہو گئی لیکن کالے پانی ہی میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

۳۔ مقدمہ سازش راج محل (۱۸۷۰ء) ابراہیم منڈل کو عمر قید بہ عبور دریائے شور کے علاوہ ضبطیٔ جائداد کی سزا دی گئی۔

۴۔ مقدمہ سازش مالوہ (۱۸۷۰ء) مولوی امیر الدین کے خلاف الزام یہ تھا کہ روپیہ اور آدمی سرحد کو بھیجتے تھے' عمر قید کی سزا پائی۔

۵۔ مقدمہ سازشِ پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے سات ملزم تھے۔ جج نے ایک کروڑ پتی ملزم امیر خان کی بابت لکھا کہ یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق جہاد سے ثابت کیا جائے۔ وہ فیاض ضرور ہے' جہادی نہیں لیکن امیر خان سمیت پانچ ملزموں کو اس مقدمہ میں حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور

---

[1] ان تفصیلات کے لئے دیکھو' ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک' مؤلفہ مسعود عالم ندوی صفحہ ۱۰۶ تا ۱۸۱۔

کی سزا ملی۔

ان پانچ مقدمات سازش کے علاوہ ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک بے شمار لوگ ظلم وستم کا نشانہ بنے رہے' تفصیلات زیر نظر کتاب کا حصہ نہیں فی الجملہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان اپنی تمام وسعتوں کے باوجود مسلمانوں کے لیے خرابۂ حشر تھا۔

انگریزوں نے پنجاب فتح کرنے کے بعد سرتوڑ کوشش کی کہ قبائلی علاقے کو مطیع ومنقاد بنالیں اور افغانستان پر قبضہ جمائیں۔ اس غرض سے ان کی پالیسی یہ تھی کہ جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کریں لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ کرزن نے اس پالیسی کو بدل ڈالا' قبائلی خوانین کے وظیفے مقرر کیے' افغان ملیشیا قائم کیا اور آخر کار پنجاب کے سرحدی اضلاع کو الگ کر کے ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کی بنا ڈالی۔

اس سے پہلے ۱۸۹۲ء میں سر مار ٹیمر ڈیورینڈ کی معرفت افغانستان اور ہندوستان کی جنوبی اور مشرقی سرحد طے پا چکی تھی جس کا نام "ڈیورنڈ لائن" رکھا گیا۔

الغرض بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں میں جہاد کا ذہن اتنا قوی تھا کہ انگریز اپنے لاؤلشکر سمیت حملہ پہ حملہ کرتے رہے لیکن انھیں حسرت رہی کہ مسلمانوں کو صحیح طور پر کچل نہ سکے۔ بعض سرکاری خطوط سے اس حسرت کا سراغ ملتا ہے مثلاً:

"پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہوگئی لیکن ہندوستان کے مذہبی مجنوں نکالے نہ جا سکے اور نہ ہم انھیں مطیع کر کے ان کے گھروں میں واپس لا سکے"۔

(مسلمانانِ ہند' ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۴۲)

یا پھر مسٹر ای سی بیلی سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے الفاظ میں:

"مسلمانوں کی مذہبی دیوانگی جس کے لیے قرآن سے کافی سند مل سکتی ہے۔ بہت بھڑکا دی گئی ہے۔۔۔ اندیشہ ہے کہ عامۃ المسلمین بہت جلد باغی ہو جائیں گے جن میں ناراض مذہبی دیوانے اور تنگ نظر علما بھی شامل ہوں گے جو حکومت سے ناجائز طور پر ناراض ہیں اور جاہل

مسلمانوں پر بے حد اثر رکھتے ہیں"۔

(مُسلمانانِ ہند۔ ہنٹر صفحہ ۱۵۱)

ڈاکٹر ہنٹر نے مزید لکھا۔

"سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے مسلمان علما نے حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا اس کے بعد مسلمانانِ بنگال نے اسی مضمون پر ایک رسالہ جاری کیا اور شیعہ جو تعداد میں تھوڑے ہیں وہ بھی اپنے خیالات کی اشاعت سے رُک نہ سکے"۔ (مُسلمانانِ ہند۔ صفحہ ۱۸)

علی گڑھ کی تحریک

دوسری طرف انگریزوں نے علی گڑھ کی تحریک کو غنیمت سمجھا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی' کالج کے بانی سر سید احمد خان (علیہ الرحمۃ) پر پیش آمدہ حالات کی سنگینی کا ایک خاص اثر تھا اور وہ مسلمانوں کو ان کی گرتی ہوئی دیوار سے بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ تعلیمی' مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کا ایک سرچشمہ پھوٹنے لگا۔ جہاں تک قرآن مجید کی جدید تفسیروں اور اسلام سے عیسائیت کے اختلافات کی فروعی بحثوں کا تعلق تھا ان کا فائدہ ارادی طور پر نہ سہی غیر ارادی طور پر انگریزوں ہی کو پہنچا۔ کیوں کہ اصل مقصد مسلمانوں کے فکر و نظر میں سوچ بچار کی تبدیلیاں لانا اور ان میں دو ایسی جماعتیں تیار کرنا تھا جو نہ صرف باہم دگر شرعی اختلافات کا شکار ہوں بلکہ ان کے الجھاؤ سے مسلمانوں کی مذہبی وحدت میں دراڑ واقع ہو۔ چنانچہ ان حصوں میں جہاں ۱۸۵۷ء کے حالات کا بلاواسطہ اثر تھا اور انگریزوں کے خلاف جذبات شدت پر تھے ایک خاص کوشش سے اُصولِ مفاسد اور فروغ مفاسد کی بنیادیں قائم کی گئیں...... ابراہیم بن العذری عندبیقی نے ان تین جملوں میں ان مفاسد کی تعریف بیان کی ہے تاویل الجاہلین وتحریف الغافلین وانتحال المطلبین۔

سر ولیم میور یوپی کا گورنر تھا۔ اسی نے علی گڑھ کالج کی پہلی عمارت ایم اے او سکول کا

سنگِ بنیاد رکھا۔ اسے کو مسلمانوں سے اس قدر عناد تھا کہ آج تک اسلام اور بانی اسلام کے خلاف جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں سب سے بدتر کتاب اسی بدبخت کی ہے۔ اس کی کتاب کا خلاصہ اسی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمد ﷺ کی تلوار اور محمد ﷺ کا قرآن ہیں (نعوذ باللہ)

(دیکھو موجِ کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۶۳)

جن لوگوں نے حوادث کے اس زمانے میں فسخِ جہاد کی تاویلوں کے علاوہ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء:۴:۵۹) میں اولی الامر کا مصداق انگریزوں کو ٹھہرایا۔ ان میں مشہور انشا پرداز ڈپٹی نذیر احمد کا نام بھی ہے جو ایک شیوا بیان مقرر ہونے کے علاوہ مایہ ناز ادیب اور بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کے ترجمے میں انگریزوں کو پہلی دفعہ اولوالامر قرار دیا اور ان کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سے مستلزم۔ اپنے اس ترجمہ کی کاپی سر ولیم میور کو انگلستان بھجوائی تو اس کی سفارش سے ''شمس العلما'' کا خطاب پایا اور اسی ترجمہ پر ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

(دیکھو داستانِ تاریخِ اُردو مصنفہ حامد حُسین قادری صفحہ ۴۹۸)

پنجاب میں ''تاویل الجاہلین وتحریف الغافلین وانتحال المبطلین کے صحیح مظہر میرزا غلام احمد ثابت ہوئے۔ میرزا صاحب نے اپنے والد میرزا غلام مرتضیٰ کی وفات (۱۸۷۶ء) کے عرصہ بعد ۱۸۹۱ء میں مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ میرزا صاحب پہلے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی عدالت میں اہل کار تھے۔ وہاں سے الگ ہو کر تنسیخ جہاد کی تلقین وترغیب کا دھندا شروع کیا اور انگریزوں کی غلامی کا مذہبی جواز پیدا کرنے لگے۔ اس جواز کی بنیاد الہامات پر رکھی اور وہ تمام خصوصیتیں جو اسلامی اعتقادات کا طرۂ امتیاز تھیں اپنی ذات میں مرتکز کرنا شروع کیں۔ ان کے ان عجیب وغریب دعادی اور افغانی علاقے میں جہاد وغزا کا زمانہ ایک ہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر دہلی تک کا علاقہ تو دیوبند اور علی گڑھ کے ذہنی تصادمات میں مبتلا تھا۔

دہلی سے اٹک تک کے علاقہ میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ظلی اور بروزی نبوت۔

علما و مشائخ نے ''جہاد'' کے ساتھ ''نبوت'' جاتے دیکھی تو اس فتنے کی سرکوبی میں لگ گئے۔ جس سے انگریزی حکومت کو فوری فائدہ پہنچا کہ اسلام کا جو خطرہ اسے درپیش تھا وہ اس مسئلہ کی نذر ہو گیا۔

میرزا صاحب نے نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی عیسائی مشنریوں سے مناظرے کیے، بعض ماڈرن لوگوں نے ان مناظروں کو میرزا صاحب کی اسلامی خدمات پر محمول کیا اور غیر شعوری طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میرزا صاحب کی نبوت میں انگریزی حکومت کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ہاتھ نہیں۔ حالانکہ اس بارے میں ایک بات بالکل صاف تھی کہ جو انگریز اس کوشش میں تھے کہ محمد ﷺ اور قرآن کو مسلمانوں کے سینے سے خارج کر دیں وہ کسی ایسے آدمی کو کیوں کر برداشت کر سکتے تھے جو نبوت کا مدعی ہو، اسلام کی تجدید چاہے اور احیائے دین کا داعی بنے پھر ایسے صوبے میں جو جماعت مجاہدین کی پناہ گاہوں کے دہانے پر واقع تھا اور جس کے سرحدی صوبے میں لڑائیوں یا جھڑپوں کا غیر مختتم سلسلہ جاری تھا۔

میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں سے جو مجادلے کیے ملکہ وکٹوریہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ مناظرے یا مجادلے صرف اس لیے کرتا ہوں کہ:

''تنسیخِ جہاد کے متعلق میں نے جو اَن تھک مساعی سرانجام دی ہیں اور برطانیہ کی وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کو جس تسلسل سے رام کیا ہے اس کے پیش نظر انھیں یہ شبہ نہ رہے کہ سرکار کی طرف سے اس کام پر مامور ہوں۔ مشنریوں سے مناظرہ کرتا ہوں تو مسلمانوں میں تنسیخ جہاد کا اعتبار پیدا ہوتا ہے''۔

اپنی کہانی اپنی زبانی

اس طویل پس منظر کے بعد میرزائیت کی حقیقی غایت خود بخود اُبھر آتی ہے۔اب ذرا یہ کہانی کسی دوسرے کی زبانی نہیں بلکہ خود مسیح موعود اور مہدی موعود کی ''زبان الہام ترجمان'' سے سماعت فرمایئے۔

ا۔ ''ہمارا جاں نثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے' ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا''

(لیکن اللہ کی راہ میں جہاد حرام ہے' مؤلف)

(تلخیص از درخواست بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر من جانب خاکسار غلام احمد ۲۴۔فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم مولفہ میر قاسم علی صاحب)

۲۔ ''غرض یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ' نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے''۔ (درخواست مذکور)

۳۔ ''مسیح موعود فرماتے ہیں میں مہدی ہوں اور برطانوی حکومت میری تلوار! پھر ہمیں احمدیوں کو فتحِ بغداد سے کیوں خوشی نہ ہو؟ عراق' عرب ہو یا شام ہو ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں''۔ (اخبار الفضل جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۷۔دسمبر ۱۹۱۸ء)

۵۔ بعض احمق سوال کیا کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ ان کا سوال نہایت حماقت کا ہے کیوں کہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا؟ میں سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی آدمی کا کام ہے''۔

(شہادت القرآن مصنفہ میرزا غلام احمد کا تتمہ منقول از ''الفضل'' جلد ۲۷۔مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

۶۔ ''ہمارے سر پر سلطنت برطانیہ کے بہت احسان ہیں' وہ مسلمان سخت جاہل' سخت نادان اور سخت نالائق ہے جو اس گورنمنٹ سے کینہ رکھے اگر ہم اس کا شکرادا نہ کریں تو پھر خدا تعالیٰ کے بھی ناشکر گزار ہوں گے۔ اس سے زیادہ بے ایمان شخص کون ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا مسیح تو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کام یابی کے لیے دعا کرنی چاہیے اور یہ کہتا ہے کہ دعا کی کیا ضرورت ہے' انگریزوں کو شکست ہو تو زیادہ بہتر ہے''۔

(الفضل مورخہ ۵۔ جون ۱۹۴۰ء میاں محمود احمد کا خطبہ)

۷۔ ''حضرت مسیح موعود نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹ عالیہ کی اطاعت اور وفاداری کو جزو مذہب قرار دے کر ہمیں ان منافق طبع مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جو ابھی تک اس انتظار میں ہیں کہ خونی مہدی ایک جرار لشکر لے کر آب دار تلواروں اور سیاہ سرخ پرچموں کے ساتھ کہیں ظاہر ہو گا اور سب عیسائی سلطنتوں کو مٹا کر ان نام کے مسلمانوں کو حکمران بنا دے گا''۔

(الفضل جلد ۴ نمبر ۸۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۱۷ء)

۸۔ ''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مُرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیوں کہ مجھ کو مسیح اور مہدی جان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے''۔

(اشتہار میرزا صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

۹۔ ''مَیں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض ہے اور جہاد حرام ہے''۔

(اشتہار مورخہ ۱۰۔ دسمبر ۱۸۹۴ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد سوم صفحہ ۳۰۰)

۱۰۔ ''میں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا''۔ (تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۲۶)

۱۱۔ ''میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات

شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب' مصر' شام' کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کا جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ پھر کیوں کر کہ ممکن تھا کہ میں اس سلطنت کا بدخواہ ہوتا یا کوئی ناجائز باغیانہ منصوبے اپنی جماعت میں پھیلاتا جب کہ میں بیس برس تک یہی تعلیم اطاعت گورنمنٹ انگریزی کی دیتا رہا اور اپنے مُریدوں میں یہی ہدایتیں جاری کرتا رہا تو کیوں کر ممکن تھا کہ ان تمام ہدایتوں کے برخلاف کسی بغاوت کے منصوبے کی میں تعلیم کروں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے نہ مدینہ میں اور نہ سلطنت روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں۔ پھر مَیں خود اپنے آرام کا دشمن بنوں؟ اگر اس سلطنت کے بارے میں کوئی باغیانہ منصوبہ دل میں مخفی رکھوں اور جو لوگ مسلمانوں میں سے ایسے بدخیال جہاد اور بغاوت کو دلوں میں مخفی رکھتے ہیں میں انھیں کو سخت نادان' بدقسمت اور ظالم سمجھتا ہوں کیوں کہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ اسلام کی دوبارہ زندگی انگریزی سلطنت کے امن بخش سایہ سے پیدا ہوئی ہے' تم چاہو دل میں مجھے کچھ کہو' گالیاں نکالو یا پہلے کی طرح کافر کا فتویٰ لکھو مگر میرا اصول یہی ہے کہ ایسی سلطنت سے دل میں بغاوت کے خیالات رکھنا یا ایسے خیال جن سے بغاوت کا احتمال ہو سکے سخت بدذاتی اور خدا تعالیٰ کا گناہ ہے''۔

(منقول تریاق القلوب صفحہ ۲۸۔۲۷ مصنفہ میرزا غلام احمد مطبوعہ بک ڈپو قادیان ۱۹۲۴ء)

۱۲۔ میں نے قرینِ مصلحت سمجھ کر مخالفت جہاد کو عام ملکوں میں پھیلانے کے لیے عربی اور فارسی کتابیں تالیف کیں اور وہ تمام کتابیں عرب' شام' روم' مصر' بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں میں یقین کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت ان کا اثر ہوگا''۔ (غلام احمد از تبلیغِ رسالت جلد ۸ صفحہ ۶۲)

۱۳۔ ''رسول اللہ ﷺ کے دو نام تھے' ایک محمد (ﷺ) جو جلالی تھا دوسرا احمد جو جمالی تھا چوں کہ فرقہ احمدیہ نام رکھنے میں اصل غرض اس امر کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ زمانہ جہاد اور خوں ریزی کا نہیں اس لیے احمدیہ نام اختیار کیا گیا''۔

(تلخیص از سلسلہ احمدیہ کے مختصر حالات اور عقائد'' از ریویو آف ریلیجنز۔ بحوالہ افسر مردم شماری بمبئی صفحہ ۱۵۱ مئی ۱۹۰۶ء)

۱۴۔ ''مجھے تین باتوں نے گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی میں اول درجہ پر بنا دیا ہے۔

۱۔ والد مرحوم کے اثر نے۔

۲۔ اس گورنمنٹ عالیہ کے احسانوں نے

۳۔ خدا تعالیٰ کے الہام نے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۳۱۰۔۳۰۹)

۱۵۔ ''میرے پانچ اصول ہیں' جن میں دو حرمت جہاد اور اطاعت برطانیہ بھی ہیں''۔

(تلخیص از تبلیغ رسالت صفحہ ۱۰۷)

۱۶۔ ''یہ عاجز گورنمنٹ کے اس قدیم خاندان میں سے ہے جس کی خیر خواہی کا گورنمنٹ کے عالی مرتبت حکام نے اعتراف کیا اور اپنی چٹھیوں سے گواہی دی ہے۔۔۔۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ گورنمنٹ محسنہ کے ناشکر گزار نہ بنیں اور نمک حرامی سے خدا کے گناہ گار نہ ٹھہریں کیوں کہ یہ گورنمنٹ ہمارے مال و خون کی محافظ ہے''۔

۱۷۔ ''مجھے عیسائی رسالہ ''نور افشاں'' میں نبی ﷺ کے خلاف توہین آمیز الفاظ پڑھ کر اندیشہ ہوا مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کو دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں بدامنی پیدا نہ ہو۔ میرے کانشنس نے مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود

ہیں ان کے غیظ وغضب کی آگ بجھانے کی لیے یہ طریق کافی ہوگا''۔

''مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمتِ عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا''۔

(عریضہ خاک سار بحضور گورنمنٹ عالیہ میرزا غلام احمد از قادیان' المرقوم ۲۷۔ دسمبر ۱۸۹۹ء مندرجہ تریاق القلوب صفحہ ۳۰۶)

۱۸۔ میرزا صاحب کے خاندان کی وفاداری کا اعتراف سرکار عالی مدار کے علاوہ جناب چیف کمشنر صاحب بہادر پنجاب نے اپنے ایک خط مجریہ ۱۰۔ اگست ۱۸۵۸ء (بحوالہ ۵۷۶) میں کیا اور دو سو روپیہ صلہ خدمت دیا گیا' دوسرا خط میرزا غلام قادر (برادرِ میرزا غلام احمد) کے نام سر رابرٹ ایجرٹن فنانشل کمشنر نے لکھا ہے' تیسرا خط جناب ولسن صاحب کمشنر بہادر لاہور کا ہے' جو میرزا غلام مرتضیٰ کو لکھا گیا ان سب خطوں میں خاندان کی وفاداری کا اقرار ہے۔ ان خطوط کا حوالہ دینے کے بعد میرزا صاحب فرماتے ہیں۔

''تمام فرقوں میں ہمارا فرقہ ہی گورنمنٹ کا وفادار اور جاں نثار ہے' سرکار تجربہ کے وقت ہمارے آدمیوں کو اول درجہ کا خیر خواہ پائے گی''۔

''ہمارے خاندان نے سرکار کی راہ میں خون بہانے اور جان دینے سے کبھی فرق نہیں کیا''۔

(خاک سار میرزا غلام احمد ۲۴۔ فروری ۱۸۹۸ء ماخوذ از تبلیغ رسالت جلد ۷)

۱۹۔ ''سلسلہ احمدیہ کا گورنمنٹ برطانیہ سے جو تعلق ہے وہ باقی تمام جماعتوں سے نرالا ہے ہمارے فوائد ایک ہو گئے ہیں اگر خدانخواستہ اسے کوئی نقصان پہنچا تو اس صدمہ سے ہم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے''۔ (تبلیغ قادیان کا اعلان مندرجہ الفضل ۲۷۔ جولائی ۱۹۱۸ء)

میرزا صاحب کی ایک دوسری درخواست بحضور گورنر جنرل بہادر کمشنر ہند مجریہ یکم جنوری ۱۸۹۶ء ''تبلیغ رسالت'' میں درج ہے۔ میرزا صاحب نے اس درخواست میں اپنے کاسہ لیسانہ خیالات کا اعادہ کیا اور ان لوگوں کا ایک خانہ دار نقشہ دیا ہے جو حکومت کے غیر وفادار

ہیں اور نماز صرف اس لیے نہیں پڑھتے کہ یہاں کوئی خلیفہ موجود نہیں۔ ہندوستان اُن کے نزدیک دارالحرب ہے۔

ان ارشادات کی تائیدو تکمیل کے لیے میرزا صاحب کا طرز مخاطبت یہ ہے کہ:

۱۔ ہم رسول اور نبی ہیں۔ (اخبار بدر ۵۔ مارچ ۱۸۹۸ء)

۲۔ سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔ (دافع البلا صفحہ ۱۱)

۳۔ خدا نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ میں اس کی طرف سے ہوں مجھے اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبیوں پر بھی تقسیم کیے جائیں تو ان سے ان کی نبوت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ (چشمہء معرفت صفحہ ۳۱۷)

۴۔ جو وحی و نبوت کا جام ہر نبی کو ملا وہ مجھے بھی ملا ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۹۹)

اور جو ان کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے ان کے حق میں ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ کُل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کی ہے مگر کنجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۴۷)

۲۔ جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے۔

(تبلیغِ رسالت جلد ۹ صفحہ ۲۷)

۳۔ جو شخص ہماری فتح کا قائل نہیں ہو گا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اسے ولد الحرام بننے کا شوق ہے، حرام زادوں کی یہی نشانی ہے۔ (انوارُ السلام صفحہ ۳۰)

۴۔ ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں۔

(دُرِثمین عربی صفحہ ۲۴۹)

۵۔ کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انھوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر ہیں۔ (آئینہء صداقت ۳۵)

عام مسلمانوں سے سُلُوک

۱۔ ''حضرت مسیح موعود نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں جائز نہیں جائز نہیں''۔ (انوار خلافت صفحہ ۸۹ از میرزا محمود احمد)

۲۔ ''ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیوں کہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے نبی کے منکر ہیں''۔ (انوارِ خلافت ۹۰)

۳۔ ''اگر کوئی غیر احمدی کا چھوٹا بچہ مر جائے تو اس کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے وہ تو مسیح موعود کا منکر نہیں؟ میں یہ سوال کرنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھنا چاہیے''۔ (انوار خلافت ۹۳)

۴۔ حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اسے یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اول نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا۔ جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودے کہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔ (انوارِ خلافت ۹۴۔۹۳)

۵۔ حضرت مسیح موعود نے غیر احمدیوں کے ساتھ صرف وہی سُلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریم نے عیسائیوں کے ساتھ روا رکھا تھا' غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں انھیں لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا' ان کا جنازہ پڑھنے سے روکا گیا اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں دینی اور دنیوی' دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے' اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ اور ناتا ہے سو یہ دونوں ہمارے

لیے حرام قرار دیئے گئے اگر کہو کہ ہمیں ان کی لڑکیاں لینے کی اجازت ہے تو میں کہتا ہوں کہ نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں کو سلام کیوں کہا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض اوقات نبی کریم نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔ (کلمہ الفضل مندرجہ ریویو آف ریلیجنز صفحہ ۶۹)

میرزا صاحب کی نبوت اور ان کے فرزند ارجمند کی خلافت کے نگار خانہ کی مزید جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔ افسوس کہ عام مسلمانوں کو ان سے آگاہی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیحؑ یا چند اور مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات رسول کریم ﷺ کا وجود قرآن' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ غرض کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ (جلد ۱۹ نمبر ۱۳۔ اخبار الفضل)

۲۔ تم اپنے امتیازی نشانوں کو کیوں چھوڑتے ہو۔ تم ایک برگزیدہ نبی کو مانتے ہو اور تمھارے مخالف اس کا انکار کرتے ہیں۔ حضرت کے زمانہ میں ایک تجویز ہوئی کہ احمدی غیر احمدی مل کر تبلیغ کریں مگر حضرت نے فرمایا کہ تم کون سا اسلام پیش کرو گے۔ کیا خدا نے جو نشان تمھیں دیے اور جو انعام خدا نے تم پر کیا وہ چھپاؤ گے۔ (آئینہ صداقت صفحہ ۵۳)

۳۔ ہندوستان سے باہر ہر ایک ملک میں ہم اپنے واعظ بھیجیں مگر میں اس بات کے کہنے سے نہیں ڈرتا کہ اس تبلیغ سے ہماری غرض سلسلہ احمدیہ کی صورت میں اسلام کی تبلیغ ہو میرا یہی مذہب ہے کہ اسلام کی تبلیغ' یہی میری تبلیغ ہے پس اس اسلام کی تبلیغ کرو جو مسیح موعود لایا۔

(منصب خلافت تقریر صفحہ ۲۰۰)

۴۔ جب کوئی مصلح آیا تو اس کے ماننے والوں کو نہ ماننے والوں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اگر تمام انبیا ماسبق کا یہ فعل قابل ملامت نہیں اور ہرگز نہیں تو میرزا غلام احمد کو الزام دینے والے انصاف کریں کہ اس مقدس ذات پر الزام کس لیے؟ پس جس طرح حضرت موسیٰ کے وقت میں

موسیٰ کی آواز اسلام کی آواز تھی اور حضرت عیسیٰ کے وقت میں عیسیٰ کی آواز اسلام کی آواز تھی، پھر سیدنا و مولانا حضرت محمد ﷺ کی آواز اسلام کا صور تھا اسی طرح آج قادیان سے بلند ہونے والی آواز اسلام کی آواز ہے۔ (جلد ۷ نمبر ۹۰۔ الفضل)

۵۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب کی تجویز پر ۱۹۰۵ء میں ایڈیٹر صاحب اخبارِ وطن نے ایک فنڈ اس غرض سے شروع کیا کہ اس سے ریویو آف ریلیجنز کی کاپیاں بیرونی ممالک میں بھیجی جائیں بشرطیکہ اس میں حضرت مسیح موعود کا نام نہ ہو، مگر حضرت اقدس نے اس تجویز کو اس بنا پر رد کر دیا کہ مجھے کو چھوڑ کر کیا مردہ اسلام پیش کرو گے، اس پر ایڈیٹر وطن نے اس چندہ کے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

(جلد ۱۶ نمبر ۲-۳۲۔ الفضل)

۶۔ کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہود سے الگ نہیں کیا؟ کیا وہ انبیا جن کی سوانح کا علم ہم تک پہنچا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں اُنھوں نے اپنی ان جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کر دیا۔ ہر ایک شخص کو ماننا پڑے گا آخر شک کیا ہے اگر حضرت میرزا صاحب نے بھی جو کہ نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاج نبوت کے مطابق غیروں سے الگ کر دیا تو نئی اور انوکھی بات کون سی ہے؟ (جلد نمبر ۵ نمبر ۰۷-۶۹۔ الفضل)

۷۔ چودھری صاحب کی بحث تو صرف یہ تھی کہ ہم احمدی مسلمان ہیں۔ ہمیں کو کافر قرار دینا غلطی ہے باقی غیر احمدی کافر ہیں یا نہیں اس کے متعلق عدالت ماتحت میں بھی احمدیوں کا یہی جواب تھا کہ ہم انھیں کو کافر کہتے ہیں اور ہائی کورٹ میں بھی چودھری صاحب نے اسی کی تائید کی۔

(جلد نمبر ۲۱۔ الفضل)

۸۔ کیا غیر احمدیوں کے ساتھ سیدنا حضرت مسیح موعود کا عمل درآمد کسی پر مخفی ہے، آپ اپنی ساری زندگی میں نہ غیروں کی کسی انجمن کے ممبر ہوئے اور نہ ان میں سے کسی کو اپنی انجمن کا ممبر بنایا اور نہ کبھی انھیں کو چندہ دیا اور نہ کبھی ان سے چندہ مانگا۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ علی گڑھ میں قرآن مجید کی

اشاعت کی غرض سے ایک انجمن بنائی گئی اور وہاں کے جناب سیکرٹری صاحب نے ایک خاص خط بھیجا کہ چوں کہ آپ لوگ خادم اور ماہر قرآن مجید ہو لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اس انجمن میں آپ صاحبان میں سے کچھ شریک ہوں مگر باوجود جناب مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کی کوشش کے حضور نے انکار ہی فرمایا۔ پھر سرسید صاحب کے چندہ مدرسہ مانگنے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے یہاں تک کہ وہ ایک روپیہ تک بھی مانگتے رہے لیکن حضور نے شرکت سے انکار فرمایا حالانکہ مدرسہ انگریزوں کا جاری کیا ہوا تھا۔ (کشف الاختلاف صفحہ ۲۲ از سرور شاہ)

۹۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ انگریزوں کی سلطنت کی حفاظت اور ان کی کام یابی کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیوں دعائیں کیں حضور بھی ان کی کام یابی کے لیے دعا کرتے ہیں اور اپنی جماعت کے لوگوں کو جنگ میں مدد دینے کے لیے بھرتی ہونے کا ارشاد فرماتے ہیں حالانکہ انگریز مسلمان نہیں۔ اس کے جواب میں حضور نے جو ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے' فرمایا اس سوال کا جواب قرآن مجید میں موجود ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نظارے دکھائے گئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ایک گری ہوئی دیوار بنا دی گئی جس کی وجہ بعد میں یہ بیان کی گئی کہ اس کے نیچے خزانہ تھا۔ جس کے مالک چھوٹے بچے تھے' دیوار اس لیے بنادی گئی کہ ان لڑکوں کے بڑے ہونے تک خزانہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگے' اور ان کے لیے محفوظ رہے۔ یہ دراصل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت کے متعلق پیش گوئی ہے جب تک جماعت احمدیہ نظام حکومت سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتی اس وقت تک ضروری ہے کہ اس دیوار کو قائم رکھا جائے تاکہ یہ نظام کسی ایسی طاقت کے قبضہ میں نہ چلا جائے جو احمدیت کے مفادات کے لیے زیادہ مضر اور نقصان رساں ہو۔ جب جماعت میں قابلیت پیدا ہو جائے گی اور وقت نظام اس کے ہاتھ میں آجائے گا یہ وجہ ہے انگریزوں کی حکومت کے لیے دعا کرنے اور انھیں کو فتح حاصل کرنے میں مدد دینے کی۔ (جلد ۳۳ نمبر ۱۲ الفضل قادیان)

۱۰۔ حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں کہ میں مہدی موعود ہوں اور گورنمنٹ برطانیہ میری وہ

تلوار ہے جس کے مقابلہ میں ان علما کی کچھ پیش نہیں جاتی، اب غور کرنے کا مقام ہے کہ پھر ہم احمدیوں کو اس فتح سے کیوں خوشی نہ ہو۔ عراق عرب ہو یا شام ہو ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔ (سقوط بغداد) منقول از اخبار الفضل جلد ۴ نمبر ۴۲ صفحہ ۹

۱۱۔ مکہ اور مدینہ کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا ہے۔ (حقیقۃ الرویا مصنفہ خلیفہ ربوہ)

۱۲۔ قادیان وہ مقام ہے جسے کو خدا تعالیٰ نے تمام دنیا کے لیے ناف کے طور پر بنایا ہے اور اسے تمام جہاں کے لیے اُم قرار دیا ہے کہ ہر ایک فیض دنیا کو اس مقام مقدس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ (الفضل ۳۔ جنوری ۱۹۲۵ء)

۱۳۔ ہم ان لوگوں سے متفق نہیں جو کہتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی حرمین پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ پر بھی چڑھائی ہو سکتی ہے۔ (الفضل ۱۲۔ ستمبر ۱۹۳۵ء)

۱۴۔ یہاں قادیان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والی برکات نازل ہوتی ہیں۔ قادیان کا سالانہ جلسہ ظلی حج ہے۔ یہ نفل اب فرض بن گیا ہے۔ (الفضل ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۲ء)

میرزا صاحب کے یہ عجوبے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ۱۸۵۷ء کے خوف اور خون کی وجہ سے سہہ لیے گئے اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں علما کے تبلیغی محاسبہ تک محدود رہے لیکن ہندوستان کی کاملاً بیداری اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ان کا احتساب ناگزیر ہو گیا۔ مسلمانوں نے مزاحمت شروع کی۔ احرار نے اپنی طبعی اُفتاد کے باعث مزاحمت کے فرائض اپنے ذمے لے لیے تو یہ ان سیاسی اور دینی مضمرات کا قدرتی نتیجہ تھا۔ جن دینی و سیاسی خصوصیات کا مظہر احرار تھے۔ احرار اگر مزاحمت نہ کرتے تو ایک سانحہ ہوتا۔ احرار نے مزاحمت کر کے ایک ایسی جماعت یا اُمت کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا جس کا وجود علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں نہ صرف مسلمانوں کی دینی وحدت کے لیے خطرے کا موجب تھا بلکہ اپنے اندر یہودیت کے وظائف کی خصوصیتیں رکھتا تھا۔ میرزا غلام احمد کی نبوت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیادیں فراہم کرنا تھا۔

فسادات پنجاب (۱۹۵۳ء) کی تحقیقاتی عدالت نے اس ''قضیۂ نامرضیہ'' کو عجیب و غریب

حالات میں چھیڑا اور عجیب وغریب نتائج سے سمیٹا۔ جن اطلاعات پر عدالتی رپورٹ لکھی گئی ان کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر مترشح ہوتی ہیں۔

اولاً: جماعتوں میں احرار سب سے زیادہ گردن زدنی قرار دیئے گئے۔

ثانیاً: افراد میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری' خفیہ پولیس کے قلم کی خرافاتی زد میں رہے۔

ان حالات میں اس رپورٹ کے مندرجات کا تجزیاتی مطالعہ زیرنظر مباحث میں زیادہ مفید ثابت ہوگا' ایک تو اس رپورٹ کی حیثیت ایک ''تاریخی دستاویز'' کی سی ہے' دوسرے اس پر نقد و بحث کے بغیر میرزائیت سے متعلق شاہ جی کے سوانح مکمل نہیں ہوتے' تیسرے قادیانی نبوت کی عشوہ طرازیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ شاہ جی کے سفر زندگی میں قادیانیت کی سرکوبی کا مسئلہ ان کے سوانح حیات کا نصف ہے۔

میرزائیت

پاکستان کے بعد

احرار کے نزدیک لیگ کا موقف ہندوستانی مسلمانوں کے قومی مسئلے کا سیاسی حل نہ تھا لیکن وہ اس کی مخالفت مذہب کے واسطے سے کرتے تھے۔ اس کے برعکس قادیانی قیام پاکستان کو اپنے مذہب کی موت سمجھتے لیکن سیاستاً گومگو کی حالت میں تھے۔ میرزا محمود احمد کی بعض تحریروں سے پاکستان کی مخالفت کا نمایاں سراغ ملتا ہے اور منیر انکوائری رپورٹ (صفحہ ۱۱۷) نے بھی اس کی نشان دہی کی ہے۔

مثلاً میرزا بشیر الدین محمود نے ایک تقریر میں فرمایا اور یہ تقریر ان کے سرکاری ترجمان روزنامہ ''الفضل'' میں چھپ چکی ہے کہ موجودہ ملکی تقسیم غلط ہوئی ہے' وہ تقسیم ختم کرانے اور دونوں ملکوں کے باہمی افتراق دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح

ختم کیا ہی جائے گا اور ہندوستان و پاکستان کو پھر سے اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا۔

احرار چوں کہ مسلمان عوام سے مخاطب تھے اور ان کا نقطۂ نگاہ مشروط طور پر کانگرس کا نقطۂ نگاہ تھا۔ اس لیے ان کی مخالفت کا چرچا ہو گیا اور میرزا محمود احمد کی مخالفت کا چرچا یا شہرت اس لیے نہ ہو سکی کہ وہ نہ تو لیگ کے مقابلہ میں صف آرا تھے اور نہ ان کا رویہ مزاحمانہ تھا۔ لیکن وہ جس خلافت کو قائم کیے ہوئے تھے اس کی بقا یا استحکام کے لیے قیامِ پاکستان سے خائف تھے۔ انھیں جائز طور پر یہ اندیشہ تھا کہ پاکستان میں "خود کاشتہ پودا" پروان نہیں چڑھے گا اور تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں اعتزال و تفریق کی حوصلہ افزائی نہیں ہو گی۔

چنانچہ احرار کے لیے انگریزوں کا نکل جانا سال ہا سال کی جدوجہد کا خوش آئند نتیجہ تھا اور قادیانوں کے لیے انگریزوں کا نکالا جانا ہوش رُبا سانحہ..... لیکن دونوں کو اپنے افکار و کوائف کے باعث ایک ایسی منفی صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کا صحیح آئینہ فساداتِ پنجاب (۱۹۵۳ء) کی عدالتی رپورٹ ہے۔

جسٹس محمد منیر اور جسٹس محمد رُستم کیانی اس رپورٹ کے مرتبین تھے۔ گورنر پنجاب کے آرڈی ننس نمبر ۳ (۱۹۵۲ء) کی ہدایات و شرائط کے مطابق یہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ فاضل جج صاحبان کی تجویز کی ہوئی بعض ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب تحقیقاتِ عامہ (۱۹۵۲ء ایکٹ بن گیا اور یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کُل ۱۱۷۔ اجلاس منعقد کیے گئے جن میں ۱۱۲۔ اجلاس شہادتوں کے لیے مخصوص رہے۔ ۲۸۔ فروری ۱۹۵۴ء کو کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا۔ فاضل ججوں نے ۳۸۷ صفحات پر مشتمل انگریزی میں ایک رپورٹ لکھی جس کا اردو ترجمہ سرکاری اہتمام میں کرایا گیا اور محکمہ تعلقات عامہ (پنجاب) نے شائع کیا اس ترجمہ کے ۴۳۵ صفحات ہیں۔

جتنی جماعتیں اس معرکے میں ماخوذ تھیں ان میں سے لیگ اور احرار کے سوا تقریباً سب نے اپنے جوابی تبصرے کتابی شکل میں شائع کیے۔ لیگ نے اس سارے قضیے کو خواجہ ناظم الدین اور میاں محمد ممتاز دولتانہ کی ذمہ داری پر محمول کیا اور وہ دونوں وزارتوں سے سبک دوشی کے بعد لیگ کی

مرکزی اور صوبائی صدارتوں سے بھی علیحدہ ہو چکے تھے۔

احرار کی جوابی راہ میں بظاہر تین رکاوٹیں تھیں۔

اولاً مجلسِ احرار کو خلاف قانون تنظیم قرار دیا گیا۔

ثانیاً: وہ قلم کے نہیں زبان کے دھنی تھے یعنی تحریر کے بجائے تقریر کے آدمی تھے۔

ثالثاً: رپورٹ میں جس بُرے انداز سے ان کا ذکر کیا گیا شاید اس کے پیش نظر وہ اپنے سر صفائی کی تہمت لینے کو تیار نہ تھے۔

بہر حال رپورٹ کا غالب حصہ جانب دارانہ آلائشوں کا حامل ہے اور کسی لحاظ سے بھی اس رپورٹ کو کسی جج کا تجزیہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر چہ اس کے مصنف جج تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال نے اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو اسلام کے خلاف خود مسلمان ججوں کے قلم سے نکلی ہے اس کی اشاعت روک لی جائے بلکہ اس کتاب کو ضبط ہونا چاہیے"۔ دنیائے اسلام میں آج تک نفس اسلام کے خلاف ایسی دستاویز شائع نہیں ہوئی۔ یہ سب سے بڑی تحریر ہے جس میں دو مسلمان ججوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کی رسوائی کا سامان کیا گیا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ رپورٹ مر چکی ہے۔ جسٹس کیانی نے راقم سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے پریشان و پشیمان ہیں اور جو حصہ اس میں اسلام کے خلاف ہے وہ جسٹس منیر کے قلم سے ہے۔

تمام خرابی اُن واقعات کی بوقلمونی میں ہے جنھیں رپورٹ میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ مولانا مرتضیٰ احمد میکش نے اس بوقلمونی ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے محاسبہ (جوابی تبصرہ) کا سر آغاز اس طرح کیا ہے کہ:

"رپورٹ کی مثال اُس ہاتھی کی ہے جس کے مختلف اعضا کو چھے اندھوں نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا اور اپنی حس لامسہ کی مدد سے ہاتھی کے متعلق ہر ایک نے اپنا جُداجُدا مخصوص تصور قائم کر لیا۔ ایک نے کہا ہاتھی ایسا تھا جیسے عمارت کا ستون۔ دوسرا بولا ایک بہت بڑا چھاج۔

تیسرے نے کہا موٹا سا اژدہا۔ چوتھے نے کہا کہ ہاتھ بھر کی موٹی رسی۔ پانچویں نے کہا ناہموار سا چبوترا۔ چھٹے نے ارشاد فرمایا وہ ایک دیوار سی تھی اور بس۔ اس رپورٹ نے بعینہٖ اس قسم کی کیفیت عامۃ الناس میں پیدا کی ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اس کے متعلق اپنا خیال اور تصور قائم کر چکا ہے یا کر رہا ہے۔

اس خرابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تحقیقات کا دائرہ غیر ضروری حد تک پھیلا دیا گیا۔ خود حکومت کا اس بارے میں کوئی نقطہ نگاہ نہ تھا۔ محولہ اختیارات کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۵ میں بہ صراحت درج تھا کہ عدالت مجموعہ ضابطہ فوج داری کی شرائط و قیود کی پابند نہ ہوگی۔ بنا بریں عدالت نے قانونِ شہادت کی پابندی سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ رپورٹ کی ابتدا میں اس کا ذکر موجود ہے لیکن عدالت نے اپنے اجلاسوں میں جو طرز عمل اختیار کیا وہ اپنے متعلق عدالتی لیکن ماخوذین کے متعلق غیر عدالتی تھا۔

خفی اور جلی پہلو

بہر حال رپورٹ کے بہت سے خفی اور جلی پہلو ہیں:

ا۔ اس رپورٹ کو علما کے برخلاف ایک اجتماعی مقدمہ Collective Trial کی خصوصیت حاصل ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں اس نوعیت کا کوئی مقدمہ نہیں۔ میاں فضل حسین نے ۱۹۳۶ء کے اواخر میں احرار سے قادیانی محاذ چھیننا چاہا تو مولانا ظفر علی خاں کو ڈلہوزی بلا کر ترغیب دی کہ وہ عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کر کے قادیانی جماعت کے نامسلمان ہونے کا فیصلہ حاصل کریں۔ مولانا مقدمہ دائر کرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس ساز باز کی اطلاع میاں صاحب مرحوم کے ایک معتمد نے راتوں رات چودھری افضل حق کو پہنچا دی۔ جس صبح ''زمین دار'' میں اس تجویز کا اعلان کیا گیا اسی صبح چودھری صاحب نے اپنے اخبار ''مجاہد'' میں بھانڈا پھوڑ دیا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تجویز پر پانی پھر گیا۔

گو اس مقدمہ کی تجویز اور اس رپورٹ کی نوعیت میں لفظاً و معناً فرق ہے لیکن اساس و بُنیاد دونوں کی یکساں ہے۔ ایک گروہ جو مُلا کی رجعت خواہی سے بیزار ہے اس اجتماعی مقدمہ کو علما کی شکست فاش سمجھ کر خوش ہوتا رہا۔ دُوسرا گروہ جو انکوائری کے ماخوذین پر مشتمل تھا اپنے اپنے معتوبین یا ملزمین کی رُسوائی پر خوش تھا۔ بعض تحریک اور اس کے نتائج کی ذمہ داری سے بچنا چاہتے تھے۔ تیسرا گروہ فسادات کے اسباب و علل کی کُنہ تک پہنچنے کو تو درست سمجھتا تھا لیکن بعض علمی، عملی، شرعی اور نظری مباحث کے لیے عدالت کی عاجلانہ فضا کو ناموزوں خیال کرتا تھا۔ چوتھا گروہ ان عناصر پر مشتمل تھا جن کے جذبات کا خلاصہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس زمانہ میں مشرقی پاکستان کے حالات کی تجزیاتی رپورٹ میں بہ الفاظ ذیل پیش کیا تھا۔

''اسلام کے خلاف وسیع پروپیگنڈے کی پشت پر ہندو اور کمیونسٹ دماغ ہیں جو اسلام کو ناکام مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس کی ساری تاریخ کو گھناؤنی اور قابلِ نفرت شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کے نظامِ زندگی کو ناکارہ، نقصان رساں اور فرسُودہ و جاہلانہ نظریات کا مجموعہ بتاتے رہے ہیں اور اس کام میں اُنھیں کو سب سے زیادہ مدد منیر رپورٹ سے ملی ہے جسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی دوسری دستاویز موجود نہیں ہے جو مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کا موجب ثابت ہوئی ہو۔ (صفحہ ۱۸،۱۷)

۲۔ تمام رپورٹ میں ضروری شہادت کا مدار زیادہ تر سی آئی ڈی کی رپورٹوں پر ہے اور ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سی آئی ڈی سے زیادہ ناکارہ عنصر ملک بھر میں شاید ہی ہو۔ ان رپورٹوں کا لب و لہجہ غایت درجہ معاندانہ بلکہ بڑی حد تک احمقانہ تھا۔ بسا اوقات خیال ہوتا ہے کہ سی آئی ڈی کے حُکام قادیانی اُمت کے ساتھ مل کر اپنی رپورٹیں لکھتے لکھاتے اور تجزیہ و تبصرہ کرتے تھے۔

احرار کے خلاف محاذ

تمام رپورٹ کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ:

(الف) سی آئی ڈی نے احرار کو شروع ہی سے ہدف مطاعن بنائے رکھا۔ اس نے اصل نزاع کو سمجھنے کی بجائے صرف احرار کو ملزم گردانے کی کوشش کی' اس کا طریق فکر ایک ایسے ناول نگار کا ہے جو ایک خاص قسم کی ذہنی فضا تخلیق کر کے اچھے بُرے کردار پیدا کرتا اور اچھے زور بیان کی نمائش کرتا ہے۔ احرار کے باب میں سی آئی ڈی کا قلم جراح کا نشتر نہیں حلال و حرام سے بے نیاز قصاب کا چھرا تھا۔ اس نے فوٹو گرافی کے بجائے مصوری کے فرائض اپنے اوپر تھوپ لیے تھے اور جس طرح چاہا ویسی تصویر بنا کر بزعم خویش اپنے قلم کی داد حاصل کی۔

(ب) اس نے بظاہر قانون و انتظام کے مسئلے کو سامنے رکھا لیکن جو کچھ لکھا اس پر سیاست و انتقام کا رنگ غالب رہا۔ قادیانیت کی پوری تاریخ کو نظر انداز کر دیا اور غالباً سی آئی ڈی کے دانش وروں کو اسے کا شعور ہی نہ تھا لیکن ماضی مرحوم میں احرار کی سیاسی شکستوں کے پیش نظر جو بھی ثقہ و غیر ثقہ روایت مل گئی اس کو اس مفروضہ پر جوڑ بٹور لیا کہ تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں احرار سے لیگ کی ناراضی کا اجتماعی ذہن اس کی توثیق و تسلیم کے لیے کافی ہوگا۔

(ج) ایک چیز جو ان رپورٹوں میں شروع سے آخر تک موجود ہے وہ ارباب انتظام بالخصوص پولیس کے افسران مجاز کا طرز عمل ہے کہ وہ نصف صدی سے زائد کی اس کش مکش کو بار بار ''احمدی احرار نزاع'' کا نام دیتے رہے۔

نظر بہ ظاہر اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ قادیانی حکومت کے مختلف صیغوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور افسرانِ مجاز ان کے شعوری یا غیر شعوری احترام یا خوف میں محصُور تھے۔ دوسری طرف احرار سیاست میں ایک شکست کھائی ہوئی جماعت تھے۔ ان کے لیے لیگ کا سیاست خانہ اپنی ہی فراہم کی ہوئی نارسائیوں کے باعث اجنبی تھا۔ بیوروکریسی کی عادت

مستمرہ ہے کہ وہ کسی مسئلے اور اس کی نوعیت کو نہیں دیکھتی بلکہ جو لوگ پیش کر رہے ہوں ان کے اجزائے نسب اور اعضائے حسب کی جانچ میں منفی ذہن سے کام کرتی ہے عوام یا حکومت کے خزانۂ عامرہ سے لاکھوں روپیہ بطور تنخواہ وصول کرنے کے بعد جو شاہ کار تصنیف کرتی ہے اس کے نادر نمونے سی آئی ڈی کی ان زیر بحث یادداشتوں میں بکثرت موجود ہیں۔

نادر نمونے

ان یادداشتوں میں افسران مجاز شروع سے آخر تک اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ:

احرار احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کی مسلسل مہم چلا رہے ہیں۔

(صفحہ ۱۵ محررہ ۳۱۔ اگست ۱۹۵۰ء)

احرار مقرروں نے میرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی اور چودھری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کیے انھیں مسلمان قوم کا غدار بتایا۔ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کیں۔ (صفحہ ۱۷)

مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہے اب اس نے دانستہ اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر دی ہے۔

احرار برصغیر کی تقسیم کے خلاف تھے ان پر کانگرس اعتبار کرتی تھی اور وہ ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلا ملا رکھتے تھے۔ (صفحہ ۱۹ محررہ ۱۹۔ جون ۱۹۵۰ء)

احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مُرتکز کر دی اور نہایت شرم ناک دشنام طرازی کا آغاز کیا۔ میرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کیے جا رہے اور انھیں توڑ موڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

میرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زنا کار اور خلاف وضع فطرت حرکات کا مرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔ (صفحہ ۲۰)

احرار شائستگی کے حُدُود سے تجاوز کر چکے اور احمدیوں کے خلاف بے باک حملے کرتے رہے ہیں۔ (صفحہ ۴۴ یادداشت محررہ یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء)

بخاری ہرگز باز نہیں آئے گا کیوں کہ اس کا اس کے سوا اور کوئی وصف ہی نہیں کہ وہ احمدیوں کو گالیاں دیتا رہے ضدی اور ہٹیلا آدمی ہے۔ (صفحہ ۳۸ محررہ ۱۴۔ نومبر ۱۹۵۱ء)

احرار احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۸ یکم دسمبر ۱۹۵۱ء)

اس میں شک نہیں کہ احراری لیڈر اور کارکن ہماری مملکت کی سلامتی اور اس کے امن و امان کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں' ان کے خلیفہ اور سر ظفر اللہ خان کو بدنام کرنا ہے لیکن ان کا اندرونی مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بدنظمی اور لاقانونی پیدا کریں۔

(صفحہ ۴۲ محررہ ۲۸۔ مارچ ۱۹۵۱ء)

احرار بجائے خود ایک مسئلہ ہیں۔ (لیکن قادیانی؟ مولف)

(صفحہ ۵۰ محررہ ۵۔ اپریل ۱۹۵۲)

(قادیانی) اگر دوسرے اسلامی فرقوں کے افراد کو اپنے رسوم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے یا غیر احمدی مسلمانوں کے ساتھ نماز یا دوسرے دینی وظائف میں شریک ہونے سے پورا اجتناب کرتے ہیں تو یہ خالصًا ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ (صفحہ ۵۰ محررہ ۳۰۔ مئی ۱۹۵۲ء)

بدقسمتی سے (لفظ بدقسمتی پر غور فرمایئے' مولف) عام مسلمانوں کا ذہنی رجحان احمدیوں کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۵۳ محررہ ۳۰۔ مئی ۱۹۵۲ء)

آج کل جماعت احرار کا کام صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پروپگینڈا کیا جائے۔

(صفحہ ۵۶)

احرار عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے اب تین نعرے استعمال کر رہے ہیں۔

۱۔ مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت۔

۲۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان۔

۳۔ چودھری ظفر اللہ خان کی موقوفی۔

جہاں تک نمبر ۱ کا تعلق ہے مرکزی حکومت واضح طور پر بتائے کہ ہمیں کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ جسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان ردِ میرزائیت کہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان سرگرمیوں کی اجازت دینی چاہیے یا ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی جماعت کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے۔ احمدیوں کی جماعت مسلمہ عقائد پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقائد رنگارنگ ہیں۔ اگرچہ آخر الذکر کو احمدیوں کے خلاف جوش و خروش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو کیا احمدیوں کو بھی یہ حق دیا جائے گا کہ وہ منبر اور پلیٹ فارم سے صرف اپنے عقائد کو صحیح اور دوسرے تمام عقائد کو کفر قرار دیں۔ اگر ہم یہ حق جمہور کے کسی ایک طبقے کو دے دیں تو کیا ہم عیسائیوں کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار ہوں گے کہ وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کریں؟ (حضور ﷺ کی ختم المرسلینی اور غلام احمد کی ظلی نبوت کو ایک دوسرے سے بریکٹ کرنا انتظامیہ ہی کے فکر رسا کی بوالعجبی ہو سکتی ہے۔ راقم) اور آیا ہم شیعوں کو بعض نامور ترین صحابہ کرام کے متعلق اپنے جذبات کے عام مظاہرے کا موقع دینے پر آمادہ ہوں گے؟ کیا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کو متخاصم گروہوں اور مذہبوں کا میدان جنگ بنا دیا جائے تاکہ جو لوگ شکست کھا جائیں وہ تباہ ہو جائیں یا مذہب بدلنے پر مجبور کر دیے جائیں۔ جس اژدہا کو احرار منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں اسے کو اس کے خروج سے پہلے ہی ہلاک کر دینا چاہیے ورنہ وہ ہماری آزادی اور ہمارے تمام مالوفات و محبوبات کو نگل جائے گا۔ (صفحہ ۲، محررہ ۴۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

ارکانِ مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ احرار جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے ہیں اب پاکستان کو ختم کرنے کے لیے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے آیا وہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے۔ مرکز کو جو کچھ بھی فیصلہ ہو اس سے حتی الامکان جلد از جلد ہر شخص کو مطلع کر دینا چاہیے۔ (یادداشت مذکورہ صفحہ ۲۳)

منٹگمری کا ایک رسوائے عام احراری (زبان ملاحظہ ہو مؤلف) کارکن جو حبیب الرحمٰن

لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا بہتر ہی ہے اس کا ذکر نہ کیا جائے اس کا ذکر قابلِ اعتراض ہے۔ (صفحہ ۱۲۱)

محمد علی جالندھری ایک بدآہنگ سیاسی مقرر ہے۔ (صفحہ ۱۲۲ محررہ ۲۴۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے ان کے ذہن میں گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔

(صفحہ ۳۳۱)

احرار مقررین کو چودھری ظفر اللہ خان اور بانیٔ جماعت احمدیہ کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں میرزا غلام احمد کو دجال کذاب اور زانی اور چودھری ظفر اللہ خان کو غدار اور دشمنِ پاکستان کہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۵)

احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)

ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے اپنی یادداشتوں میں کئی دفعہ اس بات پر اظہارِ خفگی کیا کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کا ذکر قابل اعتراض طریق سے کرتے ہیں مگر یادداشتوں میں اس سیاق وسباق کا ذکر قطعاً مفقود ہے جس کے تحت ملکہ وکٹوریہ کا ذکر کیا جاتا رہا۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو بہرحال اصرار تھا کہ ملکہ معظمہ کی توہین کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کی ایک یادداشت میں ڈی آئی جی میرزا غلام احمد کے ایک رویا:

''حضرت فاطمہؓ نے کشفی حالت میں اپنی ران پر میرا سر رکھا''۔[1]

(ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۸)

---

[1] سید الانبیا ﷺ فرماتے ہیں قیامت کے دن عرش سے منادی خدا کرے گا کہ اے اہل محشر اپنے سروں کو نیچے جھکا دو اور اپنی آنکھیں بند کر لو فاطمہ بنت محمد ﷺ پل صراط سے گزر جائے۔ اس وقت حضرت سیدۃ النسأ کے ہم راہ ۷۰ ہزار حوریں بجلی کی طرح پل صراط سے گزر جائیں گی۔

کی توضیح کا فریضہ اپنے ذمے لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ اس میں میرزا صاحب نے دختر رسول کا ذکر بالکل اس طرح کیا تھا جیسے کوئی ماں کا ذکر کرے"۔

افسر مجاز کو میرزا غلام احمد، میاں محمود احمد اور چودھری ظفر اللہ خان وغیرہ کے بارے میں احرار کے لب ولہجہ پر سخت اعتراض تھا لیکن اپنی یادداشتوں میں جو گندے الفاظ احرار بالخصوص سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق استعمال کیے اور ان میں ٹکسالی زبان کے جو نوادر ڈھالے ان کے بارے میں غالباً کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

جماعتِ اسلامی کی رائے

ایسے ہی لولوئے لالا کی چمک دمک پر جماعت اسلامی کے تبصرہ نگاروں جناب نعیم صدیقی اور جناب سعید احمد ملک نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی جوابی تصریحات میں لکھا کہ:

وہ محرکان جو قادیانیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کے لیے مختلف جماعتوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیوروکریسی کی پست ذہنیت کا ایک معمولی سا نمونہ ہے' یہ لوگ ہمیشہ اس مفروضہ پر اپنے خیالات اور احکام کی بنا رکھتے ہیں کہ جو شخص یا گروہ بھی سرکار عالی کے منشا کے خلاف کچھ کہتا ہے وہ بددیانتی اور گھٹیا درجے کے خودغرضانہ محرکات ہی کی بنا پر کہتا ہے۔ ایماندارانہ رائے صرف سرکاری دفتروں کے کرسی نشینوں کا اجارہ ہے جو لوگ اپنی خدمات کے صلے میں بڑے بڑے عہدوں پر ترقیاں پاتے ہوں وہ تو ہیں کمال درجہ نیک نیت اور جنھیں اپنے مشن کی راہ میں قدم قدم پر جان و مال کے نقصانات سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب کچھ خودغرضی اور بدنیتی کی بنا پر کرتے ہیں"۔ (تبصرہ صفحہ ۷۱ ناشر مکتبہ جماعت اسلامی لاہور)

۴۔ غرض تمام رپورٹ میں دل چسپ تضادات اور غلط اطلاعات کے نمونے عام ہیں۔ احرار کے سوا تقریباً سبھی جماعتوں نے اس کی نشان دہی کر دی تھی۔

مشق ستم

چوں کہ احرار تحریکِ پاکستان میں عدم شرکت کی وجہ سے تختہ مشق ستم تھے اس لیے ان کے متعلق گفتنی وناگفتنی سبھی باتیں جمع کی گئیں۔

سی آئی ڈی کا اُصول ہے (پاکستان بن جانے کے بعد بھی) کہ وہ اپنے مخبر کا اتا پتا اپنی اطلاعات سے بھی زیادہ صیغہ راز میں رکھتی ہے لیکن اس رپورٹ سے دونوں بھرم کھل گئے۔ اولاً مندرجہ معلومات کی سطح اتنی پست تھی کہ مخبروں کی قابلیت اور عداوت کا چہرہ مُہرہ سامنے آ گیا۔ ثانیاً ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے ماسٹر تاج الدینؒ صدر احرار سے بھی اپنی معلومات کے ''حصول'' کا ذکر کیا۔ فاضل جج صاحبان کی رائے میں:

''اگر ماسٹر تاج الدین اپنی جماعت ہی کی جاسوسی کر رہے تھے تو وہ اور بات ہے ورنہ ہمیں تو یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ان کی دی ہوئی اطلاع پر ذریعہ اطلاع ظاہر کیے بغیر اس قدر اعتبار کیا جائے کہ اسے کو رپورٹ میں درج کر لیا جائے۔۔۔۔ ہم نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ فائلوں سے نقل کیا اسے کو مسٹر انور علی کے بیان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس سے یہ رائے قائم کرنے کے لیے خاصا مواد مہیا ہو جاتا ہے کہ ماسٹر تاج الدین مسٹر انور علی کو سیدھے راستے سے منحرف کرنے میں کام یاب ہو گئے۔''[1]

واضح غلطیاں

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چند معلوماتی غلطیوں ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کا سانچا ناقص تھا؟ یا محض احرار ہی کے بارے میں غلط بیانیوں سے کام لیا گیا؟

---

[1] چودھری افضل حق مرحوم نے تاریخ احرار میں (صفحہ ۱۳۰) ماسٹر جی کو خراج ذیل ادا کیا ہے۔

''ماسٹر تاج الدین ہماری جماعت میں بڑے جوڑ توڑ کے آدمی ہیں۔ میں نے انھیں کام کے لحاظ سے مختتی چیونٹی اور تدبر کے اعتبار سے دشمن کو تاروں میں اُلجھا کر مارنے والی مکڑی پایا ہے''۔

ا۔ رپورٹ کے تیرھویں صفحہ کی چوتھی سطر میں جماعت احرار کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

''اس کے دو لیڈروں یعنی مولوی عبدالغنی ڈار اور مولانا حبیب الرحمٰن نے بھارت میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا''۔

جن لوگوں کو پنجاب مرحوم کے رجال سیاست سے تھوڑی سی شناسائی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولوی عبدالغنی ڈار کبھی احرار کے جماعتی دوست نہ تھے بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن کے برخلاف لدھیانہ کانگرس کی روح و رواں تھے' انھیں احرار راہ نماؤں سے ہمیشہ شخصی اور جماعتی اختلاف رہا۔ جن عناصر نے احرار کو کانگرس سے دور کرنے یا دور رکھنے میں بیش از بیش حصہ لیا' ان میں مولوی عبدالغنی ڈار بھی ایک تھے۔

ب۔ ارشاد ہوتا ہے (صفحہ ۳۷) جو تنبیہ ایک دفعہ صدر مجلس احرار ماسٹر تاج الدین انصاری اور پھر مولوی مظہر علی اظہر سیکرٹری کو دی گئی تھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا مظہر علی اظہر قیامِ پاکستان سے ڈیڑھ برس پہلے مجلس احرار کو چھوڑ چکے اور لیگ سے باہر رہ کر قیام پاکستان کے حق میں تھے۔ انھوں نے پاکستان بن جانے کے بعد تحریک میرزائیت میں نام کو بھی حصہ نہ لیا۔ اور نہ دوبارہ مجلسِ احرار میں شامل ہوئے۔ خدا معلوم انھیں کہاں اور کیوں کر تنبیہ ہوگئی۔ وہ خود اس لطیفہ کے سرزد ہونے پر حیران تھے۔

ج۔ احراری لیڈر تقسیم کے فوراً بعد ''آئی این اے'' کے (جنرل) شاہ نواز سے ساز باز میں مصروف تھے جو بعد میں بھارت چلا گیا۔ (صفحہ ۵۷)

اس گستاخانہ الزام کی حقیقت سے نقاب سرکانا فی الحال مناسب نہیں لیکن خدا علیم و خبیر ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں' وقت بتائے گا کہ شاہ نواز نے ساز باز کی تھی یا خدمت[1]؟

---

[1] میں اپنے سوانح حیات جلد دوم میں اس کا مفصل ذکر کروں گا۔

انھی موقعوں پر کہتے ہیں۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طِفلاں تمام خواہد شُد ٭

د۔ مولانا محمد علی جالندھری صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے ملتان میں پابند تھے۔ایک روز اُنھیں ڈپٹی کمشنر نے طلب کیا اور کہا کہ فُلاں ضلع میں آپ نے جو تقریر کی ہے وہ حکومت کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔مولانا نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے حکم سے یہاں پابند ہوں میری تقریر یہاں وہاں کیوں کر ہوگئی؟ تو وہ خود اس فرضی رپورٹ پر ششدر رہ گیا۔

ہ۔ جن اخباروں کی مندرجہ رُودادوں کو احرار کے خلاف شہادت کی دستاویز بنایا گیا ان میں سے ننانوے فی صد کی بہتان آرائیوں اور قلم فروشیوں کا رخ رپورٹ ہی کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دولت مدار سے اُنھوں نے کتنی رقم حاصل کی۔

۵۔ فاضل عدالت نے جو رویّہ اختیار کیا اور اپنے تجربے کی بنیادیں جس اصل پر قائم کیں وہ تمام تر فریقین کی مہیا کردہ تھیں۔ایک سوال میں بہت سے سوال مدغم ہوتے گئے۔اگر مسئلہ محض مسئلہ کی حیثیت سے سامنے آتا تو یقینی تھا کہ تجربے کی صورت مختلف ہوتی لیکن تحقیقات کا دائرہ پھیلتا گیا اور ''ملزموں'' کی فہرست بڑھتی گئی۔مولانا مرتضیٰ احمد میکش نے محاسبہ میں ایسے تمام ''ملزموں'' کی فہرست دی ہے جو فاضل جج صاحبان کے ریمارکس کا تختۂ مشق بنے لیکن صفائی میں اپنے حسب منشا گواہ یا وکیل پیش نہ کر سکے۔ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مسلم و مومن کی تعریف۔

۲۔ مسئلہ قتلِ مُرتد۔

۳۔ مسئلہ جہاد۔

۴۔ مسئلہ مالِ غنیمت و خُمس۔

۵۔ جُمہوریّت۔

۶۔ نمایندہ حکومت اور نفاذ قانون و استحفاظ آئین۔

۷۔ لہو ولعب اور اسلام۔

۸۔ آرٹ اور اسلام

۹۔ اسلامی ریاست۔

۱۰۔ بین الاقوامی قوانین و مجالس اور اسلام۔

۱۱۔ احادیث و سُنَن۔

۱۲۔ کنونشن کے مُطالبات

۶۔ احرار کی جماعتی دستار میں اس قسم کے موتی ٹانک دیئے گئے کہ:

الف۔ انھوں نے احمدیوں کے خلاف نہایت پست قسم کی دشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ ان کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اُصول یہ ہے کہ وہ کسی کے ماتحت ہو کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے ماتحت وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انھوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دُم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ (ججوں کی زبان ملاحظہ ہو۔ مؤلف)

ب۔ انھوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا مسلسل استعمال کیا۔ انھوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی تو وہ بھی مذہب ہی کی بنا پر۔

ج۔ ان کی نیتوں کو مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔

(اللہ اکبر)

ان کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا۔۔۔۔ کوئی احمق ہی ان کے دعوٰی مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے انھیں کو دشمنِ پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔[1]

---

[1] پاکستان کی سیاسی تاریخ فیصلہ کرے گی دشمن پاکستان احرار تھے یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر محمد منیر۔

د۔ جو پارٹی پاکستان مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالف اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی اس کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی۔

(صفحہ ۲۷۲ تا ۲۷۸)

محولہ الفاظ سرکاری افسروں کی بے ضمیری کا منطقی نتیجہ تھے ستم یہ تھا کہ:

الف۔ احرار اپنا مقدمہ کماحقہٗ پیش کرنے سے قاصر رہے۔

ب۔ ان کے ایڈووکیٹ مظہر علی اظہر قائداعظم کے بارے میں خود ایک مسئلہ بن گئے۔

ج۔ چوں کہ حکومت کا سارا نزلہ احرار پر گر رہا تھا اس لیے مارشل لا وغیرہ کی مسئولیت سے بچنے کے لیے ہر فرد اور ہر جماعت نے مشترکہ ڈیفنس سے گریز کیا۔

د۔ مسئلہ، نزاع اور فساد اس طرح اکٹھے کیے گئے کہ مسئلہ دب گیا۔ نزاع پر مباحث ہوتے رہے اور فساد کے برگ و بار کو ملحوظ رکھتے ہوئے رپورٹ کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے تو تعریفاً احراری ہونا بدقسمتی سے تعبیر کیا لیکن حقیقتاً احراری اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عظیم قربانیوں کے باوجود بدقسمت ہی تھے ان کی مثال بدقسمت جرمن قوم کی سی تھی کہ جاں نثاری کے باوجود ہر معرکہ میں ہاران کا نوشتہ تقدیر رہی۔

تحریکِ خلافت میں احرار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کے طول و عرض کو گرمایا لیکن کھویا سب کچھ، پایا کچھ بھی نہیں۔ بہ قول اقبال۔

چو مہ از گردش خود کاستم من

کانگرس کے دوش بدوش غیر ملکی حکومت سے لڑتے رہے۔ بارہا آگے نکلنے کی کوشش کی مگر۔

سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا

تحریکِ کشمیر کی نیو اُٹھائی اور حاصل۔

ابر کی برق باریاں نہ گئیں

تین حادثے

غرض احرار کے لیے تین حادثے جان گسل ثابت ہوئے' پہلی بار شہید گنج کے جھگڑے میں آ گئے اور خواص کے ہاتھوں پٹنا پڑا۔ دوسری دفعہ تحریکِ پاکستان میں عوام کی شدید ناراضی نے سیاسی طور پر گور کنارے پہنچا دیا۔ تیسری بار قادیانیوں کے مقابلے میں اربابِ اختیار کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے۔ اولاً شہرت کھوئی' ثانیاً قیادت' ثالثاً جماعت گویا ؎

تھی اس خیال پہ بنیاد آشیانے کی
کہ تجلیوں کو تمنا ہے مسکرانے کی

احمدیوں سے مسلمانوں کے اختلافات

بہرکیف فاضل ججوں نے رپورٹ میں تسلیم کیا:

۱۔ عامۃ المسلمین سے احمدیوں کے اختلافات کی عمر نصف صدی سے بھی زیادہ ہے۔

۲۔ (ملک کی) تقسیم سے پہلے وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پروپیگنڈے اور تبلیغی سرگرمیوں مین مصروف تھے۔ قیامِ پاکستان سے صورت حالات بدل گئی اب احمدی یہ سمجھتے تھے کہ نقطہ نگاہ یا نقطہ کار کی تبدیلی کے بغیر بھی عوام میں' ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہو گی اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا تو گویا وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

ان کی سرگرمیوں اور جارحانہ نشر و اشاعت' میں بدلے ہوئے حالات کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں۔

میرزا محمود احمد کی کوئٹہ کی تقریر نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے اور صوبے کو مزید جدّ و جہد کے مرکز کی حیثیت سے استعمال کرنے کی علی الاعلان حمایت کی اسی طرح

جب انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کی کہ تبلیغِ احمدیت کے پروپیگنڈے کو تیز کریں تاکہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کے آغوش میں آجائے تو گویا مسلمانوں کو تبدیلئ مذہب کے متعلق سرگرمیوں کا کُھلا نوٹس دے دیا۔ احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں ازسرتاپا مصروف ہو جانا اپنا فریضہ خیال کیا۔ (تلخیصات از صفحہ ۲۷۹ تا ۲۸۰۔ اُردو ترجمہ)

۴۔ قادیانی اپنی مطبوعات میں مسلمانوں کی مقدس مصطلحات مثلاً امیر المومنین اُم المومنین سیدۃ النسا اور صحابہ کرامؓ کو نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں ان کے استعمال پر فاضل جج تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارا وظیفہ یہ نہیں کہ ہم اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا یہ نام صحیح طور پر استعمال کیے گئے یا نہیں؟ لیکن ان اصطلاحات کے استعمال سے مسلمانوں کے احساسات پر جو اثر ہوتا ہے اس کے متعلق ہمیں ذرہ بھر شک نہیں کہ یہ اصطلاحات اپنے مخصوص اور محدود استعمال کی وجہ سے مقدس بن چکی ہیں اور تاریخ اسلام کی بعض اعلیٰ ہستیوں کی یاد سے مختص ہوگئی ہیں۔ احمدیوں کے لٹریچر میں حضرت رسول اکرم ﷺ کے خاندان (اہل بیت) کی بعض خواتین کے متعلق جو ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں بھی ہماری رائے یہی ہے۔ اگرچہ اس شکایت کی ایک مثال غالباً زیادہ بے ہُودہ صورت میں قلائد الجواہر میں بھی موجود ہے۔ بلاشُبہ حضرت رسول اکرم ﷺ اور کسی دوسرے زندہ یا مردہ شخص کے درمیان کسی قسم کا موازنہ ہر مومن کے لیے دل آزاری کا مُوجب ہے''۔

(رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۷)

۵۔ جب مسلمانوں کے لیے ایک جُداگانہ وطن کے امکانات اُفق پر نمودار ہونے لگے تو آنے والے واقعات کا سایہ احمدیوں کو فکرمند بنانے لگا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے آغاز تک احمدیوں کی بعض تحریرات منکشف کرتی ہیں کہ وہ برطانیہ کا جانشین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن جب پاکستان کا دُھندلا سا خواب ایک آنے والی حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا تو وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے لیے اپنے آپ کو ایک نئی مملکت کے تصور پر راضی کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، وہ

ضرور اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصے میں مبتلا محسوس کرتے ہوں گے کیوں کہ وہ نہ تو ایک ہندو دنیوی حکومت یعنی ہندوستان کو اپنے لیے پسند کر سکتے تھے نہ پاکستان کو منتخب کر سکتے تھے۔ جہاں اس امر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اعتزال وتفریق کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ ان کی بعض تحریرات ظاہر کرتی ہیں کہ وہ تقسیم ملکی کے خلاف تھے لیکن اگر تقسیم معرض عمل میں آ جائے تو وہ ملک کو از سر نو متحد کرنے کے لیے کوشاں رہیں گے۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۶)

۶۔ ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے سابق اعلانات دیکھے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہمارے نزدیک یہ اعلانات اس کے سوا اور کسی تشریح کے حامل نہیں کہ جو لوگ میرزا غلام احمد پر ایمان نہیں رکھتے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو مسلمان حضرت رسول اقدس واطہر (ﷺ) کے بعد کسی مامور من اللہ کے دعوے کو قبول نہ کرے وہ اللہ اور رسول کا منکر نہیں لہٰذا وہ اُمت میں داخل ہے یہ توجیہ ان کے سابقہ اعلانات سے مختلف نہیں کہ دوسرے مسلمان کافر ہیں۔ حقیقتاً یہ الفاظ ان کے سابقہ اعتقاد کی بالواسطہ از سر نو تصدیق کرتے ہیں کہ ایسے لوگ صرف اسی معنی میں مسلمان ہیں کہ وہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی امت میں سے ہیں اور اس لحاظ سے ایسے سلوک کے مستحق ہیں جو مسلمانوں کے معاشرے کے افراد سے ہونا چاہیے یہ بات یہ کہنے سے بہت مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں کافر نہیں''۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۹)

۷۔ جب ۱۹۱۸ء میں انگریزوں نے بغداد فتح کیا تو قادیان میں جشن فتح منایا گیا۔ اس بات نے مسلمانوں کے قلوب میں سخت رنج اور تلخی پیدا کر دی اور وہ احمدیت کو برطانیہ کی لونڈی خیال کرنے لگے۔ (رپورٹ انگریزی صفحہ ۱۹۶)

عدالت کے ریمارکس

ہمارا منصب یہ نہیں کہ ہم اس بات کا فیصلہ کریں کہ آیا احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں۔ ہم اس امر کا فیصلہ غیر احمدیوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ احمدیوں کی اس نئی پوزیشن کے بعد کہ

میرزا غلام احمد نہ کوئی شریعت لایا نہ اصلی شریعت منسوخ کی اور وہ صرف ان معنوں میں نبی تھا کہ خدا نے اسے الہام میں اسی طرح ظاہر کیا تھا اور کوئی شخص میرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا"۔ (تلخیص احمدیوں کو مسلمان سمجھیں[1] یا نہ سمجھیں[2]؟)

عُلما کی شکست کا سبب

اس میدان "مجادلہ" میں علما کو جو شکست ہوئی اس کی وجہ مذہب نہیں بلکہ خاص سیاست تھی جس کے پس منظر میں نصف صدی پرانی تاریخ تھی اس کے علاوہ رپورٹ کے بین السطور میں دو متصادم مدرسہ ہائے فکر کی آویزش صاف طور پر جھلکتی ہے۔

اولاً: ملائیت جو اسلامی معاشرے میں زوال بغداد کے بعد ایک نا کارہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہے جس نے قران کی قوتِ محرکہ اپنے انجماد سے منسلک کر لیا اور جس کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کو محیط ہے۔

ثانیاً جدیدیت جس کی عمر مسلمانوں میں سو برس سے زائد نہیں اور جس کا دماغ یورپی فلسفے کے ان عقلی سانچوں میں ڈھلا ہے جو مذہب و سیاست کو دو مختلف خانوں میں رکھتے اور بسا اوقات ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالتے نظر آتے ہیں ان کے نزدیک مذہب محض عقیدہ ہے اور عقیدہ انسان کا انفرادی معاملہ۔ اس دل چسپ تکرار ہی کا نتیجہ تھا کہ علما نے اپنے کہن سال نظریوں سے باہر جھانکنا گوارا نہ کیا اور فضلا (جدید تعلیم یافتہ) نے ان کی سیاسی نامرادیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے فکر و نظر کی توضیحات قبول نہ کیں۔

علامہ اقبالؒ کے نظریات

علامہ اقبال (علیہ الرحمہ) کی بالغ نظری کو جدید و قدیم کی اس چپقلش کا تا زیست احساس رہا۔ آپ نے احمدیت کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے ان میں کئی جگہ اس عُقدہ کو اپنے ناخنِ فکر سے کھولا ہے۔ فرماتے ہیں:

''نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ختم نبوت ﷺ کے عقیدے کی پوری سمجھ نہیں۔ انھوں نے ختم نبوت ﷺ کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظ نفس کے جذبے ہی سے عاری کر دیا ہے''۔ (حرف اقبال صفحہ ۱۵۴)

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ:

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے اس کی روشنی ہی میں احمدیت کے اصل مظروف سمجھے جا سکتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۶۹۹ء کا سال بے حد اہم ہے اسی سال ٹیپو کو شکست ہوئی' اسی سال جنگ نوارینو وقوع پزیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑا تباہ ہو گیا۔ سلطان ٹیپو علیہ الرحمۃ کے مزار پر مندرجہ تاریخ شہادت کندہ ہے۔

ذہب عز الروم والہند کلہا

ترجمہ: ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہو گئی۔

۲۔ سلطان شہید کی شکست اور مغربی شہنشاہیت کی ایشیا میں آمد کے بعد اسلامی ہندوستان میں چند اہم سوال پیدا ہو گئے مثلاً:۔

الف۔ کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ ہندوستانی مسلمان اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں' ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں [1]

ب۔ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار السلام؟

ج۔ اسلام میں نظریہ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

د۔ قرآن کی آیت ''اولی الامر منکم'' میں منکم کا مفہوم کیا ہے؟

ی۔ احادیث میں مہدی کے ورود کی پیشین گوئی کیا نوعیت رکھتی ہے؟

---

[1] لارڈ مورنگٹن گورنر جنرل ہندوستان نے مسٹر اسپنسر برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کی وساطت سے خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم ثالث والئی روم سے ایک سفارشی خط ٹیپو کے نام حاصل کیا جس میں انگریزوں کو دوست قرار دے کر ان سے صلح کر لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کو لکھا کہ آج کل چوں کہ انگریز ہم سے لڑ رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں پر ان سے جہاد فرض ہے۔

اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف ہندوستانی مسلمانوں سے تھا اور ان سوالات سے جو منافقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا افسوس ناک باب تھے۔

۳۔ چوں کہ مسلمان عوام کو صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے لہٰذا غیر ملکی شہنشاہیت کی خدمت گزاری کے لیے ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی جسے کو احمدیت نے فراہم کیا۔

مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی سیاسی غلامی کے حق میں الہامی بنیاد فراہم کرنا تھا۔

۴۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں جہاں دیگر اقطاع ہند کے مقابلے میں پیر پرستی زیادہ مسلّط ہے تحریکِ احمدیت سیاسی دینیات کا درجہ رکھتی ہے بالخصوص پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اُس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم وستم کا شکار رہے۔

غرض احمدیت دوسرے اسباب کے علاوہ لوگوں کے روحانی اِفلاس کی پیداوار ہے۔

چنانچہ جن مباحث کو انکوائری رپورٹ میں فاضل جج صاحبان نے استفہامی علامت کے طور پر پیش کیا حضرت علامہ نے ان پر پچیس برس پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور روزنامہ ''اسٹیٹس مین'' دہلی کی تحریروں کے جواب میں قلم اٹھایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کُھلے خط میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کریں[1]۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ تھا۔ علامہ فرماتے ہیں۔

۱۔ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ قادیانی تحریک کے بانی ہی کا نفسیاتی

---

[1] علامہ اقبالؒ نے اپنے مضامین میں اسے قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع قرار دیا ہے لیکن سی آئی ڈی کے افسران مجاز اسے کو احرار اور احمدی نزاع سے تعبیر کرتے ہیں۔

۱۔ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ قادیانی تحریک کے بانی ہی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

۲۔ مُسلمان ان تحریکوں کے معاملے میں زیادہ حسّاس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہوں چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنائی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

۳۔ انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تخیل غالباً سب سے انوکھا تخیل ہے جس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے مُوبدانہ تمدن کی تاریخ ہی سے ہوسکتا ہے۔

۴۔ بہائیت' قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیوں کہ وہ کُھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخرالذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔

۵۔ قادیانی جماعت کی تمام تاویلیں (ختم نبوت سے متعلق) محض اس غرض سے ہیں کہ اس کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تا کہ اسے سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

۶۔ ختمِ نبوت (دوسری خصوصیتوں کے علاوہ) ایک اجتماعی اور سیاسی لیکن مکمل اور ابدی تنظیم ہے جسے عرفاً اسلام کہتے ہیں۔ محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو جو شخص ایسے الہام کا دعوٰی کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی ایسے ہی الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالمِ اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔

۷۔ جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعوٰی نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی

تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کرتا ہے اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم النبینی پر متصرف ہو جاتا ہے۔

۸۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول پر کہ "ایک مسلمان ولی کے لیے اپنے روحانی ارتقا کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعور نبوت سے مختص ہو"۔ علامہ فرماتے ہیں اگر شیخ کو اپنے کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنھیں تصوف کا شوق ہے ان کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں پیغمبر اسلام کی ختم المرسلینی سے انکار کر دیں گے تو وہ یقیناً علمائے ہند سے بھی پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غداران اسلام سے متنبہ کر دیتے۔

۹۔ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے ان لوگوں کی قوت ارادی پر غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ایسے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈراما میں حصہ لیا ہے زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

۱۰۔ قادیانی اور نہرو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ قادیانی بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے سخت مضطرب ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہندوستان کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبرِ کی ایک نئی اُمت تیار کریں۔[1]

---

[1] میرزا محمود احمد اپنے خطبہ مندرجہ "الفضل" قادیان جلد ۲۲ نمبر ۲۸۷ مورخہ ۱۱۔ جون ۱۹۳۶ء میں فرماتے ہیں۔

الف۔ "اگر پنڈت جواہر لال نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو ان کا استقبال بے غیرتی ہوتا۔ (قادیانیوں نے ۲۹۔ مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور ریلوے سٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا استقبال کیا تھا) لیکن انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ان مضامین کا رد لکھا جو ڈاکٹر صاحب نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دینے کے لیے سپرد قلم کیے تھے اور جن میں نہایت عمدگی سے ثابت کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض نامعقول ہیں"۔

ب۔ ڈاکٹر شنکر داس نے لالہ لاجپت رائے کے اخبار "بندے ماترم" میں لکھا تھا "مسلمانوں میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلام اِزم کا خاتمہ کر سکتی ہے تو وہ یہی احمدی تحریک ہے۔ جب کوئی مسلمان احمدی ہوتا ہے تو حضرت محمد ﷺ سے اس کی عقیدت کم ہو جاتی ہے اور نگاہیں مکے کے بجائے قادیان پر اٹھتی ہیں"۔

۱۱۔ احمدیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی لیکن اس قوتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے جسے اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

۱۲۔ میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آں حضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا ہے۔

۱۳۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وحدت اسلامی اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس وقت' جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جاسکتی ہے اور بس۔

رواداری کا مفہوم

بعض دوسرے دل فریب مغالطوں طرح رواداری بھی انسانیت کے نام پر ایک خوش کن مغالطہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسپینوزا کی ''جماعت بدری'' پر ڈیورنٹ کی وضاحت کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

''جب کسی قوم کی سیاسی وحدت منتشر ہو تو مذہبی وحدت ہی اس کے وجود کو باقی رکھتی ہے اگر مذہبی وحدت میں انتشار پیدا ہونے کا امکان ہو تو الحاد' غداری اور رواداری خودکشی بن جاتے ہیں۔ اس قسم کے معاملے میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل ہی نہیں سمجھتے۔ رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نقطہ ہائے نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبّر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر نوعی فکر و عمل

کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ایک رواداری کم زور آدمی کی ہے جو محض کم زوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیایا اشخاص پر کی جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے۔غرض رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے جو لوگ اس طرزِ عمل کو غلطی سے اخلاقی کم تری خیال کرتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اس طرز عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمانوں کے دینی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو بھی ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے' اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔اس کا اعتراف پروفیسر ہرگراونج نے بھی کیا ہے۔اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے اور جس شخص کو اصل جماعت میں تلعب بالدین کرتے پائے اس کی مزاحمت کے لیے تیار ہو پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرے میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔

علیحدگی کا مطالبہ

۱۔ اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطہ نظر سے باغی ہے اور حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اسے کو خدمات کا صلہ دینے کے لیے پوری طرح مجاز ہے لیکن وہ جماعت اگر ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں تو یہ ایک عبث توقع ہے۔

۲۔ میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ

جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۴۔ اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان' انبیا پر ایمان اور رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلمان اور نامسلمان کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اُصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔

۵۔ ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ اور اپنے پیروؤں کو تازہ دودھ سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا بنیادی اصولوں سے انکار اپنی جماعت کا نیا نام' جمہور المسلمین سے اجتناب' ان کی نمازوں سے قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملوں میں مقاطعہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیائے اسلام کافر ہے، مسلمانوں سے ان کی علیحدگی پر دال ہے۔

۶۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟

۷۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے

اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے؟

۸۔ قادیانیت مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملّی کے لیے اسپنوزا کی اس مابعد الطبیعیات سے زیادہ خطرناک ہے جس سے یہود کو خطرہ تھا۔

۹۔ جب کوئی شخص اپنے اُن مُلحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظامِ اجتماعی خطرے میں پڑ جائے تو ایک آزاد اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔

اسلامی ریاست کا طرزِ عمل

لیکن آزاد اسلامی ریاست (پاکستان) نے اس بارے میں جس طرزِ عمل کو پسند کیا وہ انگریزوں سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس اغماض کے نتائج کا اسے احساس ہی نہیں کہ اس قسم کی رواداری سے یہاں کوئی سا مذہبی سٹے باز بھی اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے نہ کہ عقائد کی ہے[1] (دیکھو حرفِ اقبال)

اب اگر ان قاطع دلائل اور واضح براہین کے بعد بھی (جن کے مصنف پاکستان کے نقاش علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ہیں) احرار پر یہ تہمت لگی رہے کہ انھوں نے سیاسی اغراض[2] کے تحت تحریکِ ختمِ نبوت کو جنم دیا اور ان کے پیشِ نظر پاکستان کی بربادی کے مقاصد تھے تو اسے کم از کم پولیس کی ایک مصنوعی ضمنی ہی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اب رہا یہ ارشاد جیسا کہ فاضل جج صاحبان نے رپورٹ کے اواخر میں لکھا ہے کہ احراریوں سے ایسا برتاؤ کیا گیا گویا وہ خاندان کے افراد ہیں اور احمدیوں کو اجنبی سمجھا گیا۔

(صفحہ ۴۲۲)

تو اس کی ایک بالواسطہ بنیاد تحریک پاکستان کے بالکل ابتدائی دور میں مل جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی سے منسوب ایک تقریر پر کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" ایک جوابی مضمون (مطبوعہ روزنامہ احسان ۹۔ مارچ ۔ ۱۹۳۸ء) میں لکھا تھا کہ:

"مولانا حسین احمد مدنی یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا نظریہ۔ بظاہر نظریۂ وطنیّت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانیِ انکار خاتمیت الہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا تعلق ہے"۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اعلان فرمایا کہ مجھ سے جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ اس پر حضرت علامہؒ نے معذرت کر لی لیکن یار لوگوں نے علامہ کے طنزیہ "اشعار" تو ان کی رحلت کے بعد "ارمغانِ حجاز" میں شریک کر لیے مگر معذرت کو بالا رادہ غائب کر دیا حد یہ کہ جس شدّت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کی جماعت کے خلاف سیاسی پلیٹ فارم سے پروپیگنڈا کیا گیا' میرزا غلام احمد اور قادیانی جماعت کے خلاف اس کا سوواں حصہ بھی ان حلقوں میں مفقود تھا اور ہے۔ خود اقبال کے مدرسہ فکر نے اسے کو چھوا تک نہیں۔ اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ چنانچہ اس کا صحیح اشارہ ہمیں ایک غیر سیاسی لیکن مشہور طنز نگار ادیب جناب رشید احمد صدیقی پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاں ملتا ہے وہ اپنے ایک مقالہ "نیا ادب میری نظر میں" میں لکھتے ہیں۔

۱۔ علامہ اقبالؒ کے تمام اقتباسات ان مضامین سے ماخوذ ہیں جو اسلام اور قادیانیت کے موضوع پر آپ نے وقتاً فوقتاً سپرد قلم کیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "حرف اقبال" از صفحہ ۱۲۱ تا ۱۷۶۔

۲۔ رپورٹ میں احرار کے سیاسی اغراض کا بار بار ڈھنڈورا پیٹا گیا حالانکہ یہ ایک مہمل اصطلاح تھی شاہ جی اغراض تو ایک طرف رہے سیاسیات ہی سے بے نیاز تھے۔ برعظیم کی تقسیم کے بعد احرار میں جو دو چار سیاسی کارکن رہ گئے تھے بالفرض وہ کوئی سیاسی غرض رکھتے تھے تو ان میں صف دوم کا سیاست دان بھی کوئی نہ تھا اور نہ ان کی ذہنی سطح اتنی بلند تھی کہ وہ کوئی "سوانگ" رچا کر اغراض حاصل کرتے اور اگر اغراض ہی اُن کا مقصود تھے تو وہ سیاسیات کی راہ سے بھی حاصل ہو سکتے تھے۔

''ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں مذہب کی وہ اہمیت و عظمت نہیں جو اہمیت وعظمت سیاسی لیڈروں کی ہے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں خالصًا سیاسی ادارے ہیں اور سیاسی توازن یا تفوق ہی کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ان کا مذہب و اخلاق سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک مذہب کے اِحیا کا تعلق ہے نہ ہندو سرفروشی کے لیے آمادہ ہیں نہ مسلمان اور نہ کوئی اور قوم، البتہ مذہب کے نام اور قوم کی حیثیت سے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے سخت بیزار ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب سے وہ شغف نہیں جو وارفتگی ہندوؤں کو مہاتما گاندھی اور مسلمانوں کو قائداعظم محمد علی جناح سے ہے''۔

''(نیا ادب میری نظر میں'' صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳، مرتبہ آغا سرخوش قزلباش)

غرض شاہ جی کے خلاف رپورٹ میں جو کچھ لکھا گیا وہ جسٹس منیر کا خبث باطن تھا۔ اس نزاع کے پس منظر میں ''احراری احمدی مسئلہ'' کے بجائے بعض دوسرے رجحانات کارفرما تھے۔ جسٹس منیر جیسے بے سروپا انسان سے کوئی دوسری توقع ہی نہ تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جسٹس منیر شاہ جی کے معاملہ میں کبھی مخلص نہ تھے اور اس کی وجہ، جسٹس منیر کے مذاق لہو و لعب پر اکثر و بیشتر شاہ جی کا طنز تھا۔ بہر حال شاہ جی نے سال ہا سال کی ان تھک جدّ و جہد سے کام لے کر مسلمانوں کے دل و دماغ سے قادیانیوں کو نہ صرف خارج کیا بلکہ انھیں ایک مذہبی سارق کے درجے میں لا کھڑا کیا[1] اور اب سیاسی حیثیت سے وہ ایک غیر سرکاری اقلیت ہیں کیوں کہ انھیں مسلمانوں کے کسی

[1] ''احرار نے ہمارے خلاف جو شورش پیدا کی ہے اس سے ڈر کر سارے مسلمانوں نے ہم کو علیحدہ کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ چودھری ظفر اللہ خان سے گورنر پنجاب نے کہا تھا کہ آپ کے مخالف صرف احراری ہی نہیں بلکہ سب قوموں اور فرقوں کے لوگ میرے پاس آ آ کر شکایتیں کرتے ہیں''۔

(خطبہ خلیفہ قادیان مطبوعہ ''الفضل'' ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء)

ایک مقبرہ دوست کی ثقہ روایت ہے کہ احرار کی قادیان پر یلغار کو رکوانے کے لیے چودھری ظفر اللہ خان کی والدہ محترمہ نے بذاتِ خود لارڈ ولنگڈن سے شکایت کی اور گورنر پنجاب کو ڈانٹ پلوا کر حدودِ قادیان میں احرار کانفرنس کو بند کرایا تھا۔

حلقہ انتخاب میں بھی انتخابی قوت حاصل نہیں۔ البتہ پاکستان کی ہر حکمران جماعت ان کی پشت پناہ رہی ہے۔ وجہ معلوم کی گئی تو کہا گیا کہ مغرب کی استعماری طاقتیں ان کی پشت پناہی کرتی ہیں اور ان کے بغیر پاکستان کو امریکا وغیرہ سے امداد ملنا مشکل ہو جاتی ہے۔

بہر حال احرار کی سیاسی شکستوں کے پہلو بہ پہلو ان کی ذہنی فتح مندیوں کے نقش و نگار اُجاگر ہوتے ہیں تو علامہ اقبالؒ کی یہ بات زیادہ صاف ہو کر سمجھ میں آتی ہے کہ:

''جو لوگ اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے میدانِ عمل میں کود پڑتے ہیں ان سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں لیکن تاریخ اقوام بتلاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہیں کیوں کہ ان کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کرتی ہے۔

لاثانی خطیب

شاہ جی اور خطابت یارِ غار تھے۔ پچھلی چار دہائیوں میں اُردو زبان نے اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا کہ جہاں بڑے بڑے زبان آوروں کی متاعِ سخن ختم ہو جاتی، وہاں سے ان کی خطابت شروع ہوتی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''سرودِ زندگی'' کی ''تقریب'' میں شاعری کو اکائی فرض کر کے لکھا ہے کہ ان کا کلام نصف شاعری ہے۔ اس خیال مستعار کے حوالے سے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شاہ جی کی خطابت نصف خطابت تھی۔ جس طرح قلم کا تصور بغیر تحریر بے کار ہے اسی طرح شاہ جی کے بغیر خطابت اور خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور بے رنگ تھا۔ دونوں آپس میں لازم وملزوم تھے۔ اس برِ عظیم کی ایک تہائی صدی ان کی آوازوں سے معمور رہی۔ جس فیاضی سے انھوں نے مرحوم ہندوستان میں اپنی خطابت کے موتی بکھیرے، کوئی دوسرا مقرر اس میدان میں ان کا ہم پایہ نہیں۔ کلکتہ سے لے کر خیبر تک اور سری نگر سے لے کر راس کماری تک انھوں نے اپنے بادۂ صافی کے خم پر خم لنڈھائے۔ شاذ ہی کسی مے خوار کو شکایت ہو کہ عالمِ نشہ وسرور کی ان رعنائیوں میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا۔

سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے رمضان کے تیس یا انتیس دن اور عید وبقر عید وغیرہ کے ایام چھوڑ کر باقی تین سو دن ضرور ایسے تھے جو انھوں نے چالیس برس تک خطابت کی

دشت پیمائی میں بسر کیے۔ اس میں سے قید کے نو یا دس سال نکال دیں تو ان تیس بتیس برس میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کئی دفتر مرتب ہو سکتے ہیں۔

چراغ، خونِ جگر سے جلائے ہیں ہم نے

خطابت کا آغاز

اُردو خطابت کا صحیح آغاز دیو بند اور علی گڑھ کی تحریکوں کے ابتدائی دور سے ہوا۔ مدت العمر خطابت کا تصور تحریری رہا۔ ڈپٹی نذیر احمد اس میدان کے یکّا تاز تھے۔ خطابت کا سیاسی عوامی تصور تحریکِ خلافت اور تحریکِ لا تعاون کے تقاضوں کی بدولت پیدا ہوا اور مقرروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کا اس سے پہلے کوئی وجود نہ تھا اور اگر کہیں کوئی وجود تھا تو وہ مقرر نہیں واعظ تھے۔ اسی طرح عوامی خطابت کا تصور اصلاً سیاسی تحریکوں اور جمہوری اداروں کے نشو و نما کا نتیجہ ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے عالمی معاشرے کی ایک بہت بڑی عمارت کو ہلا ڈالا جس سے نہ صرف مسلمانوں کی جذباتی وابستگیوں کے بہت سے قلعے ڈھے گئے بلکہ انھیں بعض سخت قسم کی حیرانیوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن دنیا کے ساتھ، ہندوستان نے بھی تبدیلیاں قبول کیں جن سے سارا ملک حالات کی ایک نئی گرفت میں آ گیا۔ ہندوستان نہ صرف سیاسی تحریکوں کی خصوصیتوں سے آگاہ ہوا بلکہ انھیں اس تیزی سے اپنایا کہ امزجہ طبائع کا سراپا ہی بدل گیا۔ کئی رنگارنگ خیال پیدا ہونے لگے جن سے جوش و ہیجان کے وہ ادارے سامنے آ گئے جنھیں عوامی زبان میں جلسہ، جلوس، مظاہرے اور مجاہرے کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تحریک ایک تقاضے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تقاضا نتیجہ ہوتا ہے خاص قسم کے حالات و جذبات کا۔ ان حالات و جذبات نے ہندوستان میں خطابت کے ایک ایسے سکول کی بنیاد رکھی جس نے نہ صرف مقرروں کی ایک بڑی جماعت پیدا کی بلکہ اپنے خصائص و محاسن سے عوامی غور و فکر کی راہیں ہی بدل ڈالیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا ان میں کئی راہ نُماؤں نے نام پیدا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کو ان کے علم و نظر کی وسعتوں اور مولانا محمد علی

جوہرؔ کو ان کی قائدانہ صلاحیتوں نے صفِ اول کے چند نامور مقرروں میں لا کھڑا کیا لیکن شاہ سواری کا سہرا اصلاً شاہ جی ہی کے سر رہا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے زیادہ تر تخلیہ کی زندگی بسر کی اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ دماغی خلوتوں سے باہر قدم رکھا۔ انھوں نے اپنی خطابت کا ایک دبدبہ اور احترام تو قائم کر لیا۔ لیکن اپنے آپ کو عوام کی سطح پر کبھی نہ لا سکے۔ مولانا اس معاملے میں ایک ایسے شکاری رہے جس کا نشانہ شاہینوں اور کبوتروں پر یکساں بیٹھتا ہے۔

محمد علی جوہر انگریزی اور اُردو میں یکساں دست گاہ رکھتے تھے۔ اُن کی طلاقتِ لسانی میں جلال و جمال دونوں تھے مگر علم و نظر کا وہ بہاؤ نہ تھا جو مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ہاں وافر رہا۔ ان دونوں کے برعکس شاہ جی کے ہاں خطابت کے سوا دوسری تمام خصوصیتیں ثانوی تھیں۔ بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خطابت ہی کی پیداوار تھیں۔ جس طرح ہر بڑے آدمی کی خصوصیت اس کا نام لیتے ہی حافظے کی لوح پر آ جاتی ہے۔ مثلاً غالب کا نام لیتے ہی ایک عظیم شاعر کا تصور بندھتا ہے اسی طرح شاہ جی کی ذات خطابت سے مختص ہو گئی۔ وہ سراپا خطابت تھے۔

شاعروں کی طرح خطیب بھی قدرت سے انعام لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ کسی اختیاری سانچے میں نہیں ڈھلتے۔ ان کا ملکہ بھی ہوتا ہے ان کی دماغی بناوٹ میں خطابت کے خصائص از خود منضبط ہوتے ہیں پھر اس جوہرِ ذاتی کو مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ پروان چڑھاتا ہے۔ شاہ جی پیدائشی خطیب تھے انھوں نے خطابت کو اختیار نہیں کیا بلکہ خطابت نے انھیں اختیار کیا تھا۔ وہ تمام محاسن و محامد جن سے خطابت اُستوار ہوتی ہے، قدرت نے ان میں بکمال و تمام ودیعت کیے تھے وہ اپنی اسی فنی عظمت کے باعث دنیا کے اُن بڑے مقرروں میں سے تھے جن کا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت ہے۔

صحیح تصویر

ارسطو نے ایک خطیب کے محاسن بیان کیے اور ان سے علامہ ابن رشد نے جو تلخیص مرتب کی اور اس تلخیص پر فارابی اور ابن سینا نے جو مضامین حوالہ قلم کیے اور اب ڈیماستھینز

(۳۲۲ق م) اور سسرو (۱۰۶ـق م) وغیرہ کے سوانحی خطوط سے خطابت کے جو اصول معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایڈمنڈ برک صہبان ابن غزال اور سعد زغلول وغیرہ کے مطالعے سے خطابت کی جن راہوں پر قدم اُٹھتے ہیں اس گئے گزرے دور میں شاہ جی ان کی صحیح تصویر تھے۔ انھوں نے اس میدان میں ہر جہت سے ملک وقوم کی خدمت کی۔ علامہ ابن رشد کے متعلق روایت ہے کہ ان کی زندگی میں صرف دو راتیں ایسی تھیں جو مطالعہ سے خالی رہ گئیں۔ پہلی شادی کی رات دوسری جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔

شاہ جی نے سی سالہ خطابی زندگی کی ننانوے فی صد راتیں عوام سے مخاطبت میں بسر کیں۔ انھوں نے مذہب' سیاست' زبان تینوں کی خدمت کی۔ اگر وہ روایتی تبلیغی زندگی بسر کرتے تو سارا ہندوستان ان کے قدموں پر ہوتا۔ خود مسلمان قوم ان کی مورتی تراش لیتی لیکن انھوں نے سال ہا سال مذہب کے نام پر تراشے گئے بُت توڑے۔ اس مہم میں انھیں ایسی ایسی جگہ جانا پڑا جہاں مسلمان کہلانے والے تو موجود تھے لیکن ان کے نام تک مسلمان نہ تھے۔ اسی پنجاب میں بے شمار آبادیاں ایسی تھیں جہاں مسلمانوں کو کلمہ شہادت ایک طرف رہا السلام علیکم کہنا نہ آتا تھا۔ ان میں ہندومت کے زمانہ زوال کی رسمیں عقیدہ کے طور پر مروج تھیں۔ لوگوں میں مذہب' ایک آبائی ورثہ رہ گیا تھا کئی علاقوں میں صورت حال کا نقشہ یہ تھا کہ غیر اللہ کی پرستش ہی کو اصل اسلام سمجھا جاتا............ شاہ جی نے ان دُور افتادہ علاقوں کا قصد کیا تو ان کی راہ میں بیسیوں سفری موانعات تھے۔ ایک حصہ ریل میں طے کیا دوسرا لاری میں تیسرا گھوڑے کی پیٹھ پر چوتھا پیدل' پھر کئی دفعہ میلوں پیدل ہی چلتے گئے جس علاقے میں جاتے وہاں عام لوگ ان کی زبان نہ سمجھتے کچھ دن وہاں رہ کر مقامی لفظوں کا ایک ذخیرہ فراہم کرتے۔ تب ایک دل چسپ خطابی تگ و دو کے بعد اُن کے دل و دماغ کو راضی کرتے۔ غرض اس باب میں ان کے کارنامے بڑے ہی قابلِ قدر تھے۔ مثلاً:

(جو دلکش صورت کہ تجھے نظر آتی ہے ایک دن تیری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ جاؤ دل اس کے ساتھ لگاؤ کہ جس کا وجود ہمیشہ سے تھا۔ اور ہمیشہ لگا رہے گا یعنی ذاتِ حق باری تعالیٰ)

رفت آنکہ بقبلۂ دل رو آرم حرف غمِ شاں بلوحِ دل بنگارم
آہنگ جمالِ جاودانی دارم حسنے کہ نہ جاوداں ازو بے زارم

(گئی وہ چیزیں جن کو میرا دل قبلۂ مقصود بناتا تھا اور جن کا غم میرے دل کو کھائے جاتا تھا۔ اب میرے دل میں فقط جمال جاودانی کی ہوس ہے۔ اور حسنِ فانی سے سخت بے زار ہوں)

چیزے کہ نہ روئے دربقا باشی ازو آخر ہدف تیر بلا باشی ازو
از ہرچہ بمردگی جدا خواہی شد آں بہ کہ بہ زندگی جدا باشی ازو

(جس مقصد حیات سے تجھے بقا نصیب نہیں ہوئی وہ بالآخر تیرے لئے بلائے جان ثابت ہوگی۔ جس مطلوب سے تجھے موت کے وقت جدا ہونا ہے۔ اس سے زندگی میں جدا ہو جائے تو بہتر ہے)

اے خواجہ اگر مال واگر فرزند است پیدا ست کہ مدتِ بقایش چند است
خوش آنکہ دلش بہ دلبرے در بند است کش بادل وجان اہل دل پیوند است

(اے عزیز! اگرچہ تجھے نعمتِ مال و فرزند حاصل ہے لیکن ظاہر ہے اس کو بقا نہیں۔ خوش نصیب وہ ہے کہ جس کا دل ایسے دلبر کے ساتھ لگا ہے جس پر تمام اہل دل فریفتہ و قربان ہیں)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مال و اولاد کو ترک کر دیا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دلبر حقیقی کو چھوڑ کر ان محبوبانِ مجازی کو محبوب حقیقی کا درجہ نہ دیا جائے۔

رباعیات

رفتم بہ تماشائے گل آں شمع طراز   چوں دید میانِ گلشنم گفت بہ ناز

منِ اصلم وگلہائے چمن فرعِ من اند   از اصل چرا بہ فرع مے آئی باز

(جب میں باغ کی سیر کو گیا تو اس شمع (محبوب) نے کہا کہ میں اصل ہوں اور پھول میری صفات ہیں۔ اصل کو چھوڑ کر فروعات (صفات) میں کیوں مبتلا ہوتے ہو)

شرح: حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں

لا آدم فی الکونِ ولا ابلیس   لا ملک سلیمان و لا بلقیس

فالکلّ عبارت° وانت المعنی   یامن ھوللقلوب مقناطیس

(نہ کوئی آدم ہے اور نہ ابلیس، نہ ملکِ سلیمان ہے اور نہ بلقیس۔ یہ سب الفاظ ہیں اور ان کا معنی تُو ہے یعنی وہ کہ جو قلوبِ عشاق کے لئے مقناطیس ہے)

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اس شعر کی خوب ذوق وشوق سے رٹ لگا رہا تھا۔

زرویت   روئے   خوباں   آفریدند

زقدّت   سروبستان   آفریدند

(تیرے حسین چہرہ سے حسینانِ جہان پیدا ہوئے ہیں اور تیرے قدِ رعنا سے سروچمن پیدا ہوا ہے۔ اوپر سے آواز آئی کہ "سرو" اور "خوبان" اور "حسینانِ" یہ الفاظ ہیں اور ہم ان کے معنی ہیں)

از لُطفِ قد و صباحت خد چہ کنی   وز سلسلۂ زلفِ مجعّد چہ کنی

از ہر طرفے جمالِ مطلق تاباں!   اے بے خبر از حسنِ مقیّد چہ کنی

(محبوبانِ مجازی کے حسن و جمال اور خدوخال اور ان کی پیچ در پیچ زلفوں کو کیا کروگے۔ جب سارے جہان میں جمالِ مطلق (حق تعالیٰ کا حسن و جمال) بکھرا ہوا ہے تو حُسنِ مقید کو کیا کروگے)

لائحہ پنجم (5)

کائنات میں ہر کمال، کمالِ حق سبحانہٗ ہے

متن: جمیل علی الاطلاق حضرتِ ذوالجلال والافضال است، ہر جمال وکمال کہ در جمیع مراتب ظاہر است پرتوِ جمال کمال اوست۔ کہ آنجا تافتہ، والا باب مراتب بداں سمت جمال وصف کمال یافتہ، ہر کرا دانائے دانی اثر دانائی اوست، وہر کجا بینائی بینی ثمرۂ بینائی اوست، وبالجملہ ہمہ صفات اوست کہ ازواج کلیت واطلاق تنزل فرمودو در حفیض جزویت وتقید تجلی نمودہ، تاتو از جزو تا بہ کل راہ بری، واز تقید بہ اطلاق روآوری، نہ آنکہ جزورا از کل ممتاز دانی، وبہ مقید از مطلق باز مانی۔

ترجمہ: جمیل مطلق (حقیقی محبوب) وہی ذات بابرکات وستودہ صفات ہے، دنیا میں جہاں کہیں جمال اور کمال نظر آتا ہے دراصل اسی کے جمال کا عکس ہے کہ اہل کمال پر جلوہ گر ہوا۔ دنیا میں جو دانا نظر آتا ہے۔ اسی ذاتِ مطلق کی دانائی کا اثر ہے اور جو بینا دکھائی دیتا ہے، اسی ذاتِ بینا کا ثمرہ ہے۔ کائنات میں جس قدر صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ کلیت کی بلندیوں سے اتری ہیں اور جزویت کی پستیوں میں مقید ہو کر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ تاکہ تو جز کو زینہ بنا کر کُل تک پہنچ سکے اور تقید سے آزاد ہو کر اطلاق میں جا پہنچے لیکن خبردار! جز وکُل کا غیر نہ سمجھنا اور نہ کُل سے محروم ہو کر جز میں پھنس جانا۔

شرح: قرآن حکیم میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی دنیا میں جو صفات پائی جاتی ہیں مثلاً سورج کی روشنی، شہد میں مٹھاس، پھول میں خوشبو، سب اللہ عزّ وجل کی صفات ہیں۔ اس لئے مولانا جامیؒ فرماتے ہیں کہ جمال وکمال جہاں کہیں بھی نظر آتا ہے، اس جمیلِ حقیقی کے جمال وکمال کا پرتو (عکس) ہے۔ اگرچہ مولانا نے اس لائحہ میں اشیائے عالم کو جز اور ذاتِ حق کو کُل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ تشبیہ بھی صحیح نہیں اور آگے چل کر مولانا خود اس مثال کو ناقص قرار دے کر کہتے ہیں کہ اشیائے کائنات کا تعلق، ذات حق سے وہ تعلق نہیں ہے، جو جز وکا کُل سے ہے بلکہ یہ تعلق صفت وموصوف کا ہے۔ مکمل تشریح آگے آ رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ حُسنِ مجازی میں بہت کشش ہے لیکن حُسنِ محبوب حقیقی اور جمال مطلق میں جو جاذبیت ہے۔ اس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ حُسنِ حقیقی کی محویت اور استغراق کو وہی جانتے ہیں جن کو یہ دولت نصیب ہے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
تھی زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

یہ تو حُسنِ یوسف کا کرشمہ ہے۔ خالق حُسنِ یوسف کے کیا کہنے۔

لائحہ ششم (6)

قوّتِ خیال

متن: آدمی اگرچہ بسبب جسمانیت درغایت کثافت است، امّا بحسب روحانیت درنہایت لطافت بہر چہ روئے آرد حکم آں گیرد، وبہر چہ توجہ کند رنگ آں پذیرد، ولہٰذا حکما گفتہ اند چوں، ناطقہ بصور مطابق حقائق متجلّی شو وباحکام صادقہ آں متحقق گردوصارت کانہا الوجود کلہا وایضاً عموم خلائق بواسطہ شدت اتصال بدیں صورت جسمانی وکمالِ اشتغال بدین پیکر ہولانی چناں شدہ اند کہ خودرا ازاں بازنمید انند وممتازنمی توانند ونی مثنوی مولوی ماافاد۔

مثنوی

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ ماقبی تو استخواں وریشۂ

گر گل است اندیشۂ تو گلشنے در بود خاری تو ہمہ گلخنے

ترجمہ: اگرچہ آدمی جسمانیت کے اعتبار سے کثیف ہے۔ تاہم اپنی روحانیت کے اعتبار سے بے حد لطف ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے اس سے اثر پذیر ہوتا ہے اور جدھر توجہ کرتا ہے وہی رنگ اختیار کرتا ہے۔ اس لئے حکماء کا قول ہے کہ جب انسان کی روح پر حقائق (ذات وصفات) جلوہ گر ہوتے ہیں اور جب وہ ان حقائق سے متحقق ہوجاتا ہے، تو وہ خود وجود مطلق میں گم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح عام لوگ اپنی جسمانیت سے شدید لگاؤ اور حد درجہ محبت کی وجہ سے ایسے مادی پیکر بن گئے ہیں کہ اپنی حقیقت پہچاننے سے قاصر ہیں جیسے کہ مولانا رومؒ نے مثنوی میں فرمایا۔

(اے عزیز! تیری ہستی کیا ہے۔ فقط خیال ہی خیال ہے یا پھر رگ وریشہ ہے۔ اگر اپنے آپ کو گلاب تصور کرتا ہے تو گلشن بن جائے گا اور اگر خار یا خس وخاشاک سمجھے گا تو تنور کا ایندھن بنے گا۔ گلخن بمعنی تنور)

متن: پس می باید کہ بہ کوشی وخودرا از نظرِ خود بپوشی وبرذاتے اقبال کنی حقیقتے اشتغال نمائی کہ درجات موجودات ہمہ مجالی جمالِ اوبند ومراتب کائنات مرائی کمال اوبریں نسبت

چنداں مداومت نمائی کہ باجان تو خود تعبیر کنی از و تعبیر کردہ باشی مقید مطلق شود انا الحق ہو الحق گردد۔

ترجمہ: پس کوشش کر کے اپنے آپ کو گم کر دے۔ اور شغلِ ذات حق میں منہمک ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ موجودات عالم کے جملہ درجات، ذاتِ حق کے جمال کا مظہر ہیں اور تمام مراتب کائنات اسی ذات کے عکوس ہیں۔ اس تصور پر اس قدر مداومت کرے کہ ذاتِ حق کے ساتھ ایک ہو جائے اور اس کی ہستی اس کی نظروں سے غائب ہو جائے۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنے اوپر نظر کرے تو اس کو دیکھے اور جب وہ اپنی طرف توجہ کرے تو حق کی طرف توجہ ہو جائے۔ بالفاظ دیگر مقید (انسان) مطلق (ذات لا انتہا) ہو جائے اور انا الحق ہو الحق بن جائے۔

شرح: یاد رہے کہ یہ جو کچھ مولانا فرما رہے ہیں کسی عامی کو مخاطب نہیں کر رہے، جو ان باتوں کو سن کر ہکا بکا رہ جاتا ہے بلکہ آپ کا روئے سخن خواص یعنی سالکین راہ حقیقت کی طرف ہے۔ آپ نے پہلے انسان کی قوت متخیلہ کے کرشمے بیان فرمائے ہیں اور مراقبات کی قوت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر اس قوت کو بروئے کار لانے پر زور دیا ہے تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ لیکن یہ کام راہبر کامل کی راہنمائی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مولانا روم نے فرمایا

ہیچ آہن خود بخود تیغے نہ شد
ہیچ مردے خود بخود شیخے نہ شد

نیز فرمایا ہے۔

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو!

جب مولانا رومؒ جیسے عالم بے نظیر اور دانشور بے مثال، ہدایت شیخ کے محتاج ہیں تو کون ہے جو یہ راستہ اپنی قابلیت اور خواست سے طے کرنے کا دم بھر سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کیا کریں۔ مرد کامل نہیں ملتا۔ لیکن یہ عذر لنگ ہے۔ خالص دودھ، خالص آٹا حاصل کرنے اور اپنے جسم کو پالنے کی خاطر لوگ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ انسان کامل کی تلاش میں ایک قدم نہیں لیتے بلکہ چاہتے ہیں کہ وہ خود بخود ان کے درِ دولت پر حاضر ہو جائیں۔ یہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک جسم خاکی کی حیات و بقا، روح لافانی کی نشو و نما سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ مولانا رومؒ اپنی کتاب فیہ مافیہ میں فرماتے ہیں کہ اے انسان! اے

اشرف المخلوقات! افسوس ہے کہ تو نے اپنے لئے وہی خوراک منتخب کی ہے جو تیرا گدھا کھاتا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ تیرا مرتبہ تیرے گدھے سے زیادہ بلند ہے اور تیری غذا بھی اس کی غذا سے زیادہ لطیف ہے۔ تیری خوراک مشاہدہُ حق ہے۔

مولانا جامیؒ نے اس مختصر مگر جامع رسالہ میں خواص کو سلوک الی اللہ طے کرنے اور ذاتِ حق کا قرب اور معرفت حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ سلوک الی اللہ ایک باقاعدہ سائنس ہے اور اسی پر عمل کرنے سے وہی نتائج حاصل ہوتے ہیں جو جملہ اولیاء اللہ کو حاصل ہوئے ہیں۔ یہ ایک شاہراہ ہے جس پر چل کر ہزاروں لاکھوں لوگ منزل مقصود تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ منزل مقصود کیا ہے؟ ذاتِ حق ہے۔

مولانا جامیؒ کا کمال یہ ہے کہ بڑے مطالب اور عظیم مقاصد کو سادہ اور مختصر الفاظ میں بیان کر کے مضمون کی مناسبت سے اشعار بھی فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں۔ تاکہ قلوب متاثر ہوں اور انسان عمل پر کمر بستہ ہو جائے۔ مثلاً

رباعیات

گر در دل تو گل گذرو گل باشی : در بلبل بے قرار بلبل باشی

تو جزوی حق کل است گر روزے چند : اندیشۂ کل کنی کل باشی

(اگر تیرے دل میں گلاب کی محبت ہے تو تُو گلاب بن جائے گا اور اگر بلبل بے قرار کی محبت ہے تو بلبل ہو جائے گا۔ یاد رکھو کہ تم جز ہو اور حق تعالیٰ کُل ہے۔ (جب تم مراقبۂ ذات کرو گے) یعنی خود کو نیست کرو گے تو کُل یعنی حق میں گم ہو جاؤ گے)

شرح : یاد رہے کہ انسان حق نہیں بن جاتا بلکہ خود نہیں رہتا اور حق باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے اصل الاصول فنا۔ انا الحق کا مطلب یہی ہے کہ منصور کے اندر حق کہہ رہا تھا کہ میں حق ہوں نہ کہ منصور کہہ رہا تھا کہ میں حق ہوں۔

حضرت سید علی ہجویری قدس سرہٗ نے بھی کشف المحجوب میں انا الحق کی یہی توجیہہ فرمائی ہے۔

زآمیزش جان وتن توئی مقصودم   وز مردن وزیستن توئی مقصودم

تو دیر بہ زی کہ من رفتم زمیان   گرمن گویم زمن توئی مقصود م

ترجمہ وشرح: آمیزش جان وتن یعنی میری زندگی کا مقصود، اے محبوب حقیقی تُو ہے اور تیرے لئے ہی میں زندہ ہوں اور جان دیتا ہوں۔ اے محبوب! تو سلامت رہے! میں تو آنی جانی چیز ہوں۔ جب میرے منہ سے ''مَیں'' کا لفظ نکلتا ہے تو اس سے مقصود تُو ہی ہے اور میں کچھ بھی نہیں ہوں، نیست مطلق ہوں، ہست تیری ذات ہے:

کے باشد و کے لباس ہستی شدہ شق   تاباں گشتہ جمال وجہہ مطلق

دل در سطوات نور او مستہلک   جاں در غلبات شوقِ او مستغرق۔

ترجمہ وشرح: یارب میرا لباس ہستی (بشری زندگی) کب پھٹے گا اور مجھ پر جمال روئے حق جلوہ گر ہوگا۔ میرا دل تو نور ذات میں ڈوبا جاتا ہے اور میری جان غلبۂ شوق میں مستغرق ہو رہی ہے۔ خدا کرے جلد از جلد قید بشریت سے نکل کر محبوب حقیقی کا قرب ووصال حاصل کروں۔

لائحہ ہفتم (7)

مراقبہء حضوری

متن: ورزش ایں نسبت شریفہ مے باید کرد وجہے کہ ہیچ وقتے از اوقات و ہیچ حالے از حالات ازاں نسبت خالی نباشی، چہ در آمدن و رفتن وچہ درخوردن و خفتن، وچہ در شنیدن و گفتن، و بالجملہ در جمیع حرکات و سکنات حاضر وقت مے باید بود تا بہ بطالت نہ گذرد، بلکہ واقفِ نفس تا بفضلت بر نیاید۔

ترجمہ: اس نسبت شریفہ (مندرجہ بالا مراقبہ) کی ایسی ورزش کرنی چاہئے کہ کوئی وقت اور کوئی حال اس سے خالی نہ ہو۔ آتے جاتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، بولتے سنتے، غرضیکہ تمام حرکات و سکنات میں اس حضوریء قلب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے تاکہ یہ اہم فریضہ بے توجہی اور لاپرواہی کا شکار نہ ہو جائے اور تیرا کوئی سانس غفلت سے نہ نکلے۔

شرح: اس لائحہ میں لائحہ ششم کے مراقبہ پر علی الدوام قائم رہنے اور جم جانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس مراقبہ کو تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ ذات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی ذات باری تعالیٰ کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اپنی ذات کی بھی نفی کر دے۔ اور پھر اس بات پر جم جائے کہ سب کچھ وہی ہے لیکن یاد رہے کہ یہ کام ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکتا بلکہ شیخ کامل کے احکام کے تحت بجا لا سکتا ہے۔ کیونکہ مراقبہء ذات سے پہلے زمین ہموار کرنے یعنی تزکیہء نفس حاصل کرنے کی خاطر ذکر جہری یا ذکر خفی کی مشقیں کی جاتی ہیں اور جب قلب میں کافی صفائی اور روح میں خاصی لطافت پیدا ہو جاتی ہے تو مراقبہء ذات آسان ہو جاتا ہے۔

رباعی

رخ گرچہ نمے نمائی تو مرا سالہا سال   حاشا کہ بود مہر ترا بیم زوال!

دارم ہمہ جا باہمہ کس درہمہ خیال   در دل زتو آرزو و در دیدہ خیال

(اے محبوب خواہ تم مجھے سالہا سال دیدار نہ کرائے تو ہرگز تیری محبت کو جو میرے دل میں ہے کوئی زوال نہیں آتا۔ ہر جگہ، ہر وقت اور ہر حال میں میرے دل میں یہی آرزو ہے اور آنکھوں میں تیرا تصور ہے)

لائحہ ہشتم (8)

مراقبۂ ذات کا طریقہ

متن: ہم چنانکہ امتداد نسبتِ مذکورہ بحسب شمول جمیع اوقات واز مان واجب است ہمچنیں از و یاد کیفیت آں بسبب تعری از ملابسۂ اکوان و تبری از ملاحظہ صور امکان اہم مطالب است و آں جز بجہدی بلیغ وجدی تمام در نفی خواطر و اوہام میسر نہ گردد، ہر چند خواطر منتفی تر وساوس مختفی در آں بستِ قوی تر کوشش می باید گردد، تا خواطر متفرقہ از ساحتِ سینہ خیمہ بیرون زند و نور ہستی حق سبحانہٗ و تعالیٰ بر باطن پرتو افگند ترا از بسیار واز مزاحمتِ اغیار رہا ندنہ شعور بخودت ماند و نہ شعور بعدم شعور بخود بل لم یبق الا اللہ الواحد الاحد۔

ترجمہ: جس طرح مذکورہ بالا مراقبۂ ذات پر مداومت یعنی قائم رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی میں جانا اور کیفیت کو شدید تر بنانا بھی اشد ضروری ہے اور یہ کام اس وقت ہو سکتا ہے، جب غیر ضروری امور سے اجتناب اور بے فائدہ کاموں سے احتراز کیا جائے۔ اور غیر ضروری اور بے فائدہ امور سے پیچھا اس وقت تک چھڑایا نہیں جا سکتا ہے جب تک دل سے وساوس، خطرات کو باہر نکالنے کے لئے جدوجہد نہ کی جائے۔ وساوس و خطرات میں جس قدر کمی ہوتی جائے گی تو نسبت یعنی مراقبۂ ذات کی کیفیت تیز تر ہوتی جائے گی۔ پس یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وساوس یا خطرات دل میں گھر نہ کریں تاکہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی ہستی کا نور ظہور (غلبہ) تیرے باطن پر چھا جائے۔ تجھے تجھ سے آزاد کرا دے اور خیال غیر سے نجات دلا دے۔ حتیٰ کہ نہ تجھے اپنی خودی کا شعور رہے، نہ بے خودی کا اور ذاتِ احدیت کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

شرح: اس لائحہ میں بھی مذکورہ بالا مراقبہ، یعنی مراقبہ ذات پر جم جانے کی تاکید کی گئی ہے بلکہ یہاں کیفیات میں زیادہ گہرائی پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جو بے فائدہ کاموں کو اور وساوس قلب کو ختم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لائحہ کے آخر میں یہ جو کہا گیا ہے۔ کہ "حتیٰ کہ تجھے نہ اپنی خودی کا شعور رہے نہ بے خودی کا" اس حالت کو تصوف کی

اصطلاح میں فنا اور فناء الفناء کہا جاتا ہے یعنی یہ احساس بھی سالک کو نہ رہے کہ میں فنا ہو چکا ہوں بلکہ ایک گونہ لاشعوری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس لاشعوری یا فناء الفناء پر زیادہ دیر قائم رہنے کے بعد مقام بقاء باللہ تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

رباعیات

یارب مدد کز دوئیِ خود بہ رِہَم — اَز بد بہَّرم وزبدیٔ خود بہ رِہَم

درہستیٔ خود مرا از خود بیخود کن — تا از خودی و بے خودی خود بہ رِہَم

(بارالہا! میری مدد کرتا کہ میں اپنی دوئی کو مٹا کر تیرے ساتھ ایک ہو جاؤں اور اپنی بشریت کی خواری سے نجات پاؤں، میری ہستی کو اپنی ہستی کے ساتھ مدغم کر دے حتیٰ کہ مجھے اپنی خودی کا شعور رہے نہ بے خودی کا، یعنی مقام فناء الفناء حاصل ہو)

آنرا کہ فنا شیوہ فقر آئین است — نے کشف ویقین نہ معرفت دین است

رفت او زمیان ہمیں خدا ماند خدا — اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ هُوَ اللّٰه ایں است

(جس خوش نصیب انسان کو مقام فنا حاصل ہو گیا اور فقر میں وہ مستقیم ہوا۔ اس کے لئے نہ کشف وکرامات ہے۔ نہ معرفت، نہ مذہب کیونکہ وہ گم ہو چکا ہے اور خدا ہی خدا باقی ہے اور جب صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ ''الفقر اذا تم ھو اللہ'' (جب فقر انتہا کو پہنچتا ہے تو اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے) اس سے ان کی مراد یہی مقام فناء الفناء ہے)

شرح: یاد رہے کہ بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پہلے مجھے اچھے خواب آتے تھے اور ماضی اور مستقبل کا کشف ہوتا تھا، اب وہ کیفیت بند ہو گئی ہے۔ شاید حالت میں تنزل واقع ہو گیا ہے۔ یہ تنزل نہیں بلکہ ترقی ہے کیونکہ جوں جوں ذاتِ حق میں سالک کو قوی سے قوی تر فنا حاصل ہوتی جاتی ہے۔ کشف وکرامات چھوٹتے جاتے ہیں حتیٰ کہ جب فنا کے آخری مراحل پر پہنچتا ہے تو کشف وکرامات بند ہو جاتے ہیں اور ذات ہی ذات باقی ہوتی ہے۔ اس مقام پر اگر یہ کہا جائے جیسا کہ مولانا نے فرمایا کہ سالک دین سے بھی معرا ہو جاتا ہے تو صحیح ہے۔ کیونکہ دین کے لئے دوئی ضروری ہے جب دوئی مٹ گئی تو عابد ومعبود اور ساجد ومسجود کا فرق بھی مٹ گیا۔

تنبیہ

یہاں قارئین کرام کو شدت کے ساتھ متنبہ کیا جاتا ہے کہ دین کا ختم ہو جانا اور عابد و معبود کے فرق کا مٹ جانا عارضی ہوتا ہے، دائمی نہیں ہوتا۔ صرف رات کے وقت یا دن میں مراقبۂ ذات کے دوران یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن جب سالک مراقبہ سے باہر آتا ہے تو دوئی کے مقام کو دوبارہ حاصل کر لیتا ہے اور باقاعدہ عابد و ساجد بن جاتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو مجذوب ہو جاتے ہیں یعنی دائمی طور پر ذات میں گم ہو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ وہ مرفوع القلم ہو کر صوم و صلوٰۃ سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نقصِ حال ہے، کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ شربتِ وصل کے پیالے نہیں، صراحی نہیں، دریا نوش کر جائے اور پھر بھی مدہوش نہ ہو بلکہ **هل من مزيد** کے نعرے لگاتا رہے۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے اپنی ایک کافی میں اس مقام کو یوں بیان فرمایا ہے

توڑیں جو دریا نوش ہن! پر جوش تھی خاموش ہن!
اسرار دے سرپوش ہن صامت رہن مارن نہ بک

(واصلینِ خدا اگرچہ دریا نوش ہوتے ہیں لیکن پر جوش ہونے کے باوجود وہ ضبط سے کام لیتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ نہ دوست کے رموز افشا کرتے ہیں اور نہ انا الحق جیسے نعرے لگاتے ہیں)

اس کی وجہ یہ ہے کہ مغلوب الحال ہو جانا نقص اور کمزوری ہے۔ کمال یہ ہے کہ غالب الحال ہو کر رہے اور بلند سے بلند تر مقام تک رسائی کے لئے جدوجہد جاری رکھے۔ جب ذاتِ باری تعالیٰ کی کوئی حد نہیں تو سالک کی پرواز فی الذات کی بھی کوئی حد نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن چونکہ انسان محدود اور مجبور ہے ہر سالک کو اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق بلند سے بلند پرواز کے بعد آخر مقامِ دوئی و کثرت پر واپس آنا پڑتا ہے تا کہ اپنے فرائض منصبی ادا کر سکے۔ یعنی ہدایت خلق وغیرہ۔

سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے

نہ جنبش غایتے دارد! نہ سعدی را سخن پایاں!
بمیرد تشنہ مستسقی! ودریا ہمچناں باقی

نہ دوست کے حسن و جمال کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کی وصف گوئی کی۔ بس ہوتا یہ ہے کہ استسقی کی بیماری والا دریا کے کنارے بیٹھا پانی پی پی کر مر جاتا ہے اور دریا اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

لائحہ نہم (9)

فنا اور فناء الفناء کی حقیقت

متن: فنا عبارت از آنست بواسطۂ استیلائے ظہور ہستی حق بر باطنِ ماسویٰ او شعور نماند و فنای فنا آنکہ بہ آں بی شعوری ہم شعور نماند و پوشیدہ نماند کہ فنای فنا در فنا مندرج است، زیراکہ صاحب فنا را اگر بفنای خود شعور باشد صاحبِ فنا نباشد بجہت آنکہ صفِ فنا و موصوف آں از قبیل ماسویٰ حق اند سبحانہٗ و تعالیٰ۔ پس شعور بآن منافی فنا باشد

ترجمہ: فنا کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ہستی کے ظہور کے غلبہ کی وجہ سے سالک کے باطن پر ماسویٰ اللہ یعنی غیر حق کا شعور باقی نہ رہے اور فناء الفنا یا فنائے فنا سے یہ مراد ہے کہ اس بے شعوری کا شعور بھی نہ رہے۔ یاد رہے کہ فناء الفناء بھی دراصل فنا ہے کیونکہ اگر صاحب فنا کو اپنی فنا کا شعور ہے تو وہ صاحبِ فنا نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صفتِ فنا اور صاحب فنا دونوں غیر حق ہیں۔ لہٰذا فنا کا شعور اصولی طور پر مرتبۂ فنا کے منافی (خلاف) ہے۔

رباعی

زینسان کہ فنا خویشتن مے خواہی ۔۔۔ از خرمن ہستیت جوے نہ کاہی

تا یک سرِ مُو ز خویشتن آگاہی! ۔۔۔ گردم زنی از راہ فنا گمراہی

(تو فنا کا طلبگار تو ہے لیکن اپنی ہستی میں ایک جو کے برابر کمی کرنے کو تیار نہیں۔ یاد رکھو جب تک بال برابر بھی تجھے اپنی ہستی کا شعور ہے تو اگر تو فنا کا دعویٰ کرے تو گمراہ ہے)

شرح: فنا کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی حالتِ فنا میں جسمانی طور پر گم ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جسم برقرار رہتا ہے لیکن آدمی کی روح، حق تعالیٰ کی روح یا ذات میں گم ہو جاتی ہے۔ البتہ بعض روایات میں آیا ہے کہ فنا فی اللہ کے انتہائی مراتب میں بعض اوقات کچھ وقفے کے لئے سالک کا وجود نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ سے جب کسی نے پوچھا کہ آیا سالک کا اثر یعنی وجود یا یقین باقی رہ جاتا ہے تو انہوں نے اس رباعی میں جواب دیا۔

جسم ہمہ اشک گشت و چشم بگریست　　در عشق تو بے جسم ہمے باید زیست

از من اثرے نماند وایں عشق زچیست　　چوں من ہمہ معشوق شدم عاشق چیست

(میرا جسم آنسو بن گیا اور آنکھوں کے ذریعے بہہ کر ختم ہو گیا لیکن تیرے عشق میں کیا بے جسم بھی انسان رہ سکتا ہے؟ جب میرا وجود ہی ختم ہو گیا تو یہ عشق کیا چیز ہے، جب میں معشوق بن گیا تو عاشق کہاں رہا)

یہ سن کر دریافت کرنے والے بزرگ نے نعرہ لگایا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اور سات دن تک اسی حالت میں پڑے رہے۔

حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا فنا فی اللہ کے متعلق یہ شعر بہت مشہور ہے۔

العبدُ عبدٌ وان تعرج　　والربُّ رب وان تنزّل

(بندہ بندہ ہے خواہ وہ جس قدر عروج کر لے۔ یعنی فنا فی اللہ میں ترقی کرے اور ربّ رب ہے خواہ وہ جتنا نزول فرمائے)

حق تعالیٰ کے نزول سے مراد ذاتِ بحت یا مرتبۂ احدیت سے تنزلاتِ ستہ کے ذریعے موجوداتِ عالم کی صورت اختیار کرنا ہے۔

فنا اور وحدت الوجود کا تعلق

اب چونکہ وحدت الوجود حق ہے اور ذاتِ حق کے سوا کسی چیز کا کونین میں وجود نہیں ہے۔ بلکہ اشیائے عالم جو نظر آ رہی ہیں سب کا وجود ظلی اور خیالی، اعتباری یا اضافی ہے اس لئے جب سالک ذات حق میں فنا حاصل کر لیتا ہے تو معنوی طور پر وحدت الوجود کی حقیقت اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن عالم اجسام میں مجازی طور پر بھی اس کا علیحدہ وجود قائم رہتا ہے۔ اگرچہ مسئلہ وحدت الوجود پر مفصل بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں صرف اس قدر بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کا مطلب جیسا کہ عام لوگوں نے سمجھ رکھا ہے یہ نہیں ہے کہ ہر چیز کے اندر خدا چھپا بیٹھا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مختلف اقسام کے مٹی کے برتن دراصل مٹی ہی ہیں۔ موجوداتِ عالم بھی دراصل ذات حق کا سایہ ہیں۔ علیحدہ وجود نہیں رکھتیں یا جس طرح دریا کی موجیں، حباب اور جھاگ اور برف کی اصل پانی ہے۔ اسی طرح ہر چیز کی اصل خدا ہے۔

حسام الدین کی مشترکہ خواہش پر لکھا تھا۔

(اپریل ۱۹۴۹ء) میں پہلی احرار کانفرنس لاہور میں ہوئی تو اس میں احرار کو سیاستاً ختم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور جو کارکن یا راہنما سیاست میں رہنا چاہتے تھے انھیں مشورہ دیا گیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ مجلس احرار اپنے مشن کو تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں تک محدود رکھے گی۔ شاہ جی نے یہ قرارداد کھلے اجلاس میں پیش کی۔ صوبہ بھر کے ہزاروں احرار کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ شاہ جی کے اس اعلان و تقریر پر پھوٹ پھوٹ کے روتے رہے۔ انھیں صدمہ تھا کہ برطانوی استعمار کے خلاف عمر بھر کی جدوجہد کا شعلہ اس طرح کچلا گیا اس سے پہلے کوئی پونے دو سال اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۴۸ء تک شاہ جی خاموش رہے اور کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئے لیکن دسمبر ۱۹۴۸ء میں ایک نجی محفل تھی اس میں پاکستانی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کرنل اپنے ایک سی ایس پی دوست کے ساتھ موجود تھے وہ شاہ جی سے کہہ رہے تھے۔

"شاہ جی! فی الواقع[1] پاکستان سے پہلے ہم قادیانیت سے متعلق علما کے تعاقب کو ایک فضول مذہبی جھگڑا سمجھتے تھے اور آپ لوگ جب قادیانیت کے بارے میں لمبے لمبے وعظ کرتے تو خیال ہوتا کہ یہ جھمیلے ملائیت کے منبر و محراب کی خصوصیت ہیں یا احرار کی اُفتادِ طبیعت ہے کہ وہ ذہنی طور پر مشغول رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جو حقائق ہمارے مشاہدے میں آئے اور جن تجربوں سے ہم گزر رہے ہیں وہ اتنے سنگین ہیں کہ پاکستان درجہ اول کی لیڈر شپ کے بعد:

(۱) اپنی موجودہ ہیئت کھو بیٹھے گا اور اس کا کوئی دوسرا نقشہ ہوگا۔

(۲) یا ہندوستان کی طرف کسی نہ کسی شکل میں پلٹ جائے گا۔

(۳) یا اس کی حیثیت ایک میرزائی ریاست کی سی ہوگی۔

ان تینوں میں جو شکل جس طرح قائم ہوگی اس کے پس منظر میں میرزائی ہوں گے۔

---

[1] "فی الحقیقت" زیادہ موزوں ہے۔

اس غرض سے اندر خانہ وہ اپنے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

شاہ جی نے فرمایا۔ پہلے بھی بعض ذمہ دار احباب نے اسی قسم کی خبریں دی ہیں اور مجھے میرزائیوں کے عزائم کا بخوبی اندازہ وعلم ہے لیکن میرا کچھ کہنا یا کرنا اب شاید کوئی نتیجہ پیدا نہ کرے آپ یہ سب باتیں ملک کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے نوٹس میں لائیں اور انھیں بتائیں کہ پاکستان میں میرزائی اُمت کے ہاتھوں کیا ہو رہا ہے۔ اور آئندہ اس اُمت کے منصوبے کیا ہیں۔ وہ ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ ہر دائرے سے رپورٹ منگوا کر براہِ راست معلومات حاصل کر سکتے ہیں"

کرنل صاحب نے کہا۔

"شاہ جی! ہماری اصل مصیبت یہ ہے کہ حکمران جماعت دین سے معاشرتی دل چسپی رکھتی ہے مذہبی نہیں۔ وہ اوّلاً اپنی ذات' پھر اپنی جماعت اور اس کے حدود میں اپنے مقاصد و مصالح دیکھتی ہے۔ اُسے اسلام اور اس کی دعوت کے مضمرات و مقتضیات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو بتائیں میرزائی کیا ہیں؟ آپ نے اس داستان کا نوٹس لیا اور اس طرح کوئی تحریک بن گئی تو لازماً حکمران جماعت آگاہ ہوگی نتیجتاً مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کی بیداری سے قادیانی اُمت کو بھی احتساب کا اندیشہ ہوگا اور اس طرح وہ خطرہ جو ہم محسوس کرتے ہیں ٹل جائے گا۔ اس وقت سوال مسلمان عوام اور مسلمان حکام کو اس فتنہ کے عمومی برگ و بار اور اس کی مخفی تگ و دو کے نقش و نگار سے مطلع کرنے کا ہے۔ میرے ساتھ یہ سی ایس پی افسر ہیں اور وزارت خارجہ میں اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان پاکستان کا وزیر خارجہ ہے لیکن اس کے منصب کا فائدہ میرزائیت کو پہنچ رہا ہے۔ وہ بیرونی دنیا میں پاکستان کی نمایندگی کے بجائے اپنی جماعت کی نمایندگی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس نے بیرونی ملکوں میں قادیانی اُمت کے لیے سیاسی و معاشی رابطے مہیا کیے ہیں۔ اگر میرزائی یہاں کام یاب ہو گئے تو بین الاقوامی ناطوں کی معرفت قادیانیت کو اندرونِ ملک تحفظ ملے گا"۔

شاہ جی نے یہ باتیں سن کر سرد آہ بھری اور فرمایا۔

"مجھے یہی محسوس ہوتا ہے لیکن بوڑھا ہو گیا ہوں اب ہمت نہیں رہی۔ کس سے کہوں اور کن سے لڑوں؟ آپ نے جو کچھ کہا ہے اس سے میرا اندر ہل گیا ہے میں دوستوں سے کہوں گا کہ وہ اس خطرہ سے آگاہ ہو جائیں اور عوام و حکام دونوں کو حتی المقدور آگاہ کریں"۔

کرنل صاحب بولے۔

"شاہ جی پاکستان کو اس خطرے سے صرف آپ نکال سکتے ہیں۔ کراچی سے لاہور اور لاہور سے پشاور تک آپ کی چند تقریریں موجودہ حکمرانوں کے کان کھول دیں گی کسی سے رُو برُو لڑائی کا سوال نہیں۔ بلکہ جو دیمک مسلمانوں کو چاٹ کر پاکستان کو حسب منشا ہضم کرنا چاہتی ہے اس کا عوام کی معرفت احتساب ہوگا کہ پوری قوم خبردار ہو جائے گی اور حکمرانوں کو بھی ہوش آئے گا کہ ملک میں فی الواقع[1] کسی مہلکہ میں ہے۔ شاہ جی ہم آپ تک یہ بات پہنچا سکتے تھے اور ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے وزیراعظم سے ہم مل نہیں سکتے ورنہ ان سے ملتے اور کہتے۔ بہر حال ان تک پہنچانا آپ کا فرض ہے' آپ نے کوتاہی برتی تو ذمہ دار آپ ہوں گے عنداللہ بھی اور عندالناس بھی! پاکستان میرزائی ہو گیا تو قیامت کے دن ہم رسول اکرم ﷺ کے روبرو آپ کے دامن گیر ہوں گے۔

وہ دونوں صاحب یہ کہہ کر چلے گئے لیکن شاہ جی کا یہ حال تھا کہ پہلے کچھ دیر چپ رہے پھر دو چار ہچکیاں آئیں اب جو ہچکیاں بند ہوئیں تو پون گھنٹا روتے رہے۔ زبان سے کچھ نہ کہا دیر تک آہیں ہی بھرتے رہے پھر اتنا فرمایا۔

مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے

ایسے موقعوں پر ہم لوگ خود ان کے ساتھ گم سم ہو جاتے اور اس طرح اپنی بے چارگی کا تماشا کرتے۔

غرض میرزائیوں سے مسلمانوں کو جو خطرات لاحق ہو رہے تھے' ان کے عوامی احتساب

---

[1] "فی الحقیقت" زیادہ موزوں ہے۔

اور اس احتساب میں احرار کی شرکت کا نتیجہ راست اقدام کی تحریک تھی۔

کھلا تصادم

۲۷۔فروری ۱۹۵۳ء کو شاہ جی تحریک کے رُفقا سمیت کراچی میں پکڑ لیے گئے تو پنجاب میں اس کا ردعمل شدید ہوا۔ایکا ایکی حکومت کے خلاف تحریک بھڑک اٹھی۔حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لیے کئی شہروں میں فائرنگ کی جس سے بے شمار لوگ شہید ہو گئے۔بالآخر لاہور میں چھے مارچ کو مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔حقیقت یہ ہے کہ اس دوران میں حکومت پنجاب معطل ہو کر رہ گئی۔ صوبہ کے بعض بڑے شہروں میں بغاوت کے آثار موجود تھے۔صوبائی حکومت کے سیکرٹریٹ میں اہل کاروں نے کام چھوڑ دیا۔ان کا مطالبہ تھا فائرنگ بند کرو یہ سارا اشتعال صرف اس لیے پیدا ہوا کہ حکومت نے پُر امن مظاہرین کو اولاً اشتعال دلایا پھر ان پر تشدد کیا جب وہ بھڑک اٹھے تو انھیں گولیوں سے مارنا شروع کیا حتٰی کہ پاکستانی فوج کو پہلی دفعہ اس کے فرائض سے مختلف استعمال کیا گیا۔لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ فوج مارشل لا کے نام پر کیا کرتی ہے؟ ادھر یہ پہلا موقع تھا کہ سیاست دانوں نے فوج کو عوام کی سزا دہی کے لیے منتخب کیا اور انھیں سخت سے سخت سزا دلوائی آخر یہی فوج اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سیاست دانوں کو نکال کے ملک پر قابض ہو گئی اور دسمبر ۱۹۷۱ء تک ملک کی تقدیر پر مسلّط رہی۔۱۹۵۳ء کے مارشل لا میں اسکندر میرزا حکومت پاکستان کے ڈیفنس سیکرٹری تھے اور جنرل محمد اعظم لاہور کے جی او سی۔سکندر مرزا نے صدرِ مملکت کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کا نفاذ کیا۔لیکن چند دنوں ہی میں جنرل اعظم نے ایوان صدر میں جا کر ان سے استعفٰی لکھوا لیا اور راتوں رات پاکستان سے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا۔پھر جنرل اعظم بھی اقتدار سے محروم ہو گئے۔ختم نبوت ﷺ کے مارشل لا میں راقم نے خود دیکھا اور سنا کہ اسکندر میرزا گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک فوجی افسر پر جھنجھلا رہے تھے کہ مجھے یہ نہ سنائیے امن ہو گیا ہے مجھے یہ بتائیے کہ اس وقت تک کتنی لاشیں ڈھیر ہوئی ہیں؟ جتنی ڈاڑھیاں نظر آئیں انھیں گولیوں

سے بھون دو۔

جسٹس منیر نے سی آئی ڈی کی رپورٹوں کا سہارا لے کر اس سارے واقعہ پر جو نتائج مرتب کیے نتیجۃً وہ ایک جج کی شان کے شایاں نہ تھے ان کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ جسٹس منیر بغض و عناد کے تحت یک طرفہ کارروائی کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں احرار نے تحریک ختم نبوت کا اجرا پاکستان کو ختم کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگرس سے اپنے پرانے تعلقات کی بدولت کیا تھا۔ موصوف کے نزدیک احرار پاکستان کے دشمن تھے جن کا طرزِ عمل بطور خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا۔ انھوں نے پاکستان بننے تک کانگرس کے آگے دُم ہلانے کا رویہ جاری رکھا اور اس سے ہم رشتہ ہو چکے تھے۔[1]

نزاع کے اسباب

میرزا محمود ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی اعلان کرتے رہے تھے کہ وہ پاکستان نہیں جائیں گے اور قادیان ہی میں رہیں گے[2] لیکن ایک انگریز کرنل کی تحریک پر ۳۱۔ اگست کو لاہور آ گئے اور یہاں روزنامہ پاکستان ٹائمز کے دفتر کی سڑک پر رتن باغ کے بنگلا میں قیام کیا اس کے سامنے کی عمارتوں میں ان کے پیروکار مقیم ہو گئے جب تک ربوہ کی نیو اُٹھا کر اقامت کا سروسامان نہ کر لیا لاہور ہی میں رہے۔ میرزا صاحب اس غلط فہمی میں تھے کہ ان کی مخالف جماعتیں ختم ہو چکی ہیں اور احرار مسلم لیگ کی مخالفت کے باعث بٹ گئے ہیں اور جو پاکستان میں ہیں ان میں اپنے سیاسی کردار کے باعث کوئی سکت نہیں رہی۔ میرزا صاحب نے مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ انھیں اپنے ہاں بلواتے اور ملکی مسائل بالخصوص کشمیر کے بارے میں معلومات مہیا کرتے۔ کچھ دنوں بعد کشمیر کے مسئلہ پر لا کالج لاہور کے مینارڈ ہال میں سلسلہ تقاریر شروع کیا۔ ان تقاریر میں وہ دیوار پر نقشہ لٹکا کر فوج کے حملوں کی نشان دہی کرتے اور اس ضمن میں مختلف احوال پر روشنی ڈالتے۔ میرزا صاحب کی یہ تمام معلومات قادیانی المذہب فوجی افسروں اور

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۷۲ بعنوان احرار۔

[2] کراچی سے خطاب ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء

وزارت خارجہ کے ان کارکنوں کی مہیا کی ہوتیں جو چودھری ظفر اللہ خان کی ہدایت پر انھیں ملتے اور سرکاری اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔ میرزا صاحب نے عام مسلمانوں سے بلا کھٹکے مخاطب ہونے کی یہ پہلی جسارت کی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ مسلمانوں کے کسی بھی جلسے کو خطاب کرنے سے محروم تھے۔ ایک دفعہ غالباً ۱۹۴۰ء میں انھوں نے بریڈ ہال میں سیرت کے موضوع پر خطاب کرنا چاہا تو مسلمانوں نے جلسہ اُلٹا دیا اور میرزا صاحب نوک دم بھاگ گئے۔ راقم نے تب ان کی بھگدڑ خود دیکھی تھی کہ ایک موٹر میں بیٹھ کر اڑنچھو ہو گئے تھے۔

ربوہ

میرزا محمود نے سب سے پہلے اپنے لیے ایک قلعہ کی ضرورت محسوس کی چنانچہ چنیوٹ ضلع جھنگ کے پاس دریائے چناب کے پار لائل پور اور سرگودھا کے وسط میں سر فرانس موڈی گورنر پنجاب سے کوڑیوں کے بھاؤ ۱۰۳۴ ایکڑ زمین لے کر ربوہ آباد کیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۹ء کو ربوہ ریلوے اسٹیشن بھی قائم ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر ایک قادیانی مقرر ہوا۔ غرض ربوہ کا پورا انتظام ایک ریاست کے نظام کے مشابہ ہے' کہا جاتا ہے کہ ربوہ میں اتنا اسلحہ ہے کہ پاکستان کے بڑے سے بڑے شہر میں بھی اتنا اسلحہ نہ ہوگا۔ ہر میرزائی کے لیے مسلح ہونا ''احکامِ خلافت'' کی رُو سے لازم ہے۔

قیام پاکستان سے دو سال تک حکومت کے مختلف شعبوں میں میرزائی داخل ہوتے رہے حتیٰ کہ بعض بنیادی محکموں میں انھیں رُسوخ حاصل ہو گیا۔ بالخصوص فوج' مالیات اور خارجہ کے محکموں میں ان کی جڑیں خاصی گہری ہو گئیں۔

پاکستان بن جانے سے پہلے ''الفضل'' نے کبھی فوجی بھرتی کے پروگرام شائع نہیں کیے تھے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد الفضل میں فوجی بھرتی کے پروگرام بہ التزام شائع ہونے لگے۔ بالخصوص ان علاقوں کے پروگرام جہاں میرزائی رہ رہے تھے اور جس دستہ کے ریکروٹنگ آفیسر میرزائی ہوتے' اسی طرح سول کے قادیانی افسروں بالخصوص ڈپٹی کمشنرز وغیرہ نے احمدیت کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا۔ فروری ۱۹۵۳ء سے پہلے مسٹر ایم احمد منٹگمری (ساہی وال) میں ڈپٹی کمشنر

تھے اُنھوں نے کھلم کھلا احمدی مبلغوں کے لیے راستہ پیدا کیا جس سے مسلمانوں میں مزاحمت کا جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر کا ذکر جسٹس منیر نے بھی اپنی رپورٹ میں کیا ہے کہ ان قادیانی افسروں کی جانب داری کے باعث مسلمانوں میں مزاحمانہ ردعمل کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

یہ سب کچھ محض تبلیغ نہیں تھا بلکہ قادیانی ریاست قائم کرنے کا ایک منصوبہ تھا جس کے خطوط انگریزوں کے عہد میں تیار ہوئے لیکن جس کی جھلکیاں پہلی دفعہ باؤنڈری کمیشن کے وقت سامنے آئیں اور پاکستان بن جانے کے بعد میرزا محمود بزعم خویش میدان خالی پا کر قادیانی ریاست بنانے کی دُھن میں لگ گئے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ احمدیت اپنے افکار و اعمال میں یہودیت کا مثنٰی ہے جس طرح دنیا بھر کے یہودی امریکا و برطانیہ میں وہاں کی معاشیات کو کنٹرول کرتے ہیں اور ان کی فوج میں رُسوخ رکھتے ہیں اسی طرح میرزا محمود کا پلان تھا اور ان کے جانشین بھی اسی نہج پر جا رہے ہیں کہ پاکستان میں فوج کو ہاتھ میں لیا جائے' کچھ عرصہ سے پاکستان کی اقتصادیات کو بھی تصرف میں لینے کی کوشش ہو رہی ہے' چنانچہ بنکوں میں قادیانی گھس رہے ہیں اور اب لائف انشورنس کمپنیوں پر سرکاری قبضہ کے بعد اکثر قادیانی حکومت کی بدولت ان کے نگران ہوتے جا رہے ہیں۔

میرزا محمود کا خیال تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے کہ اس کی حکمرانی بالآخر فوج کے ہاتھ میں ہو گی لہٰذا احمدیوں کا فرض ہے کہ وہ فوج میں اس کثرت سے شامل ہو جائیں کہ بالآخر فوج اُنھی کی ہو جائے۔

میرزا صاحب نے ایک خطبہ میں فرمایا:۔

''جب تک سارے محکموں میں ہمارے آدمی نہ ہوں ان سے جماعت پوری طرح کام نہیں لے سکتی۔ مثلاً موٹے موٹے محکموں میں سے فوج ہے' پولیس ہے' ایڈمنسٹریشن ہے' ریلوے ہے' فنانس ہے' اکاؤنٹس ہے' کسٹمز ہے' انجینئرنگ ہے۔ یہ آٹھ دس موٹے موٹے صیغے ہیں جن کے ذریعے جماعت اپنے حقوق محفوظ کرا سکتی ہے اور پیسے بھی اس طرح کمائے جا سکتے ہیں

کہ ہر صیغے میں ہمارے آدمی موجود ہوں اور ہر طرح ہماری آواز پہنچ سکے"۔

(الفضل ۱۱۔ جنوری ۱۹۵۲ء)

اسی سال ۱۶۔ جنوری کو ارشاد ہوتا ہے کہ:

"۱۹۵۲ء کو گزرنے نہ دیجیے۔ جب تک احمدیت کا رعب دشمن اس رنگ میں محسوس نہ کرے کہ اب احمدیت مٹائی نہیں جاسکتی اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں آ گرے۔

(الفضل ۱۶۔ جنوری ۱۹۵۲ء)

میرزا صاحب نے اس سے پہلے دسمبر ۱۹۵۱ء کو جماعت کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:

"وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ (مخالفین و منکرین) مجرموں کی حیثیت میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے"۔

الفضل ۲۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۶ میرزا صاحب کے خطبہ کا آخری فقرہ ہے۔

"اپنا یا بیگانہ کوئی اعتراض کرے پروا نہیں' ہونا وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کر کے رہیں گے"۔

وہ کیا تھا؟ میرزا صاحب نے ۲۳۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو یعنی پاکستان بننے کے تقریباً پونے گیارہ ماہ بعد کوئٹہ میں ایک خطبہ دیا جس میں اعلان فرمایا کہ وہ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانا چاہتے ہیں۔ پھر یہی اعلان میرزا صاحب نے دوبارہ ۵۔ جولائی ۱۹۵۰ء کو ایک خطبہ میں کیا اور اس کا اعتراف منیر انکوائری کمیٹی کے رُوبرو کیا۔ چنانچہ رپورٹ میں اس پر نقد و بحث موجود ہے کہ

"میرزا محمود نے کوئٹہ میں جو تقریر کی وہ نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی کہ تبلیغِ احمدیت کے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں تاکہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کی آغوش میں آجائے ظاہر ہے کہ اس سے مسلمانوں کا مشتعل ہونا لازمی تھا"۔ (ملاحظہ ہو اُردو متن صفحہ ۲۸۰)

میرزا صاحب نے مزید اعلان کیا:

''میں یہ جانتا ہوں کہ اب یہ صوبہ بلوچستان ہمارے ہاتھوں نکل نہیں سکتا۔ یہ ہماری شکارگاہ ہوگا' دنیا کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے یہ علاقہ چھین نہیں سکتیں''۔

سردار عبدالرب نشتر (سابق گورنر پنجاب) نے تحقیقاتی عدالت میں بیان دیتے ہوئے توثیق فرمائی کہ قادیانی بہرطور بلوچستان کو اپنا صوبہ بنانے کی فکر میں تھے۔ سردار صاحب نے چودھری ظفراللہ خان سے بھی کہا تھا کہ وہ میرزا صاحب کے اس اعلان کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں' شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ جو کچھ دنوں کے لیے جسٹس منیر کی مہربانی سے لاہور ہائی کورٹ کے جج رہے اور میرزا صاحب کے مقرب و ہم زُلف تھے' اُن سے بھی سردار صاحب نے یہی بات کہی کہ وہ میرزا صاحب کو آگاہ کر دیں۔ لیکن میرزا محمود کب مانتے تھے انھوں نے اس وقت تک بلوچستان کا پنڈ نہ چھوڑا جب تک ایک قادیانی ڈاکٹر میجر محمود کو لوگوں نے قتل نہ کر دیا اور میرزا صاحب وہاں سے چھپ کے بھاگ نہیں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا محمود اور اس کی جماعت کا محاسبہ علما نے اس وقت شروع کیا جب میرزا محمود احمد کھلم کھلا احمدیت کا سیاسی اقتدار قائم کرنے پر تُل گئے اور خلافِ معمول ان کی زبان بہت تیز ہوگئی۔ میرزا صاحب کا خیال تھا کہ علما کی اکثریت تحریکِ پاکستان میں عدم شمول کے باعث معتوب ہو چکی ہے وہ ان کا مقابلہ نہ کرے گی اور جو علما تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے ہم راہ و ہم نوا تھے وہ ان کے احتساب کا مذاق نہیں رکھتے۔ لیکن میرزا صاحب کو جلد معلوم ہو گیا کہ وہ پاکستان میں عوام کی معرفت کبھی اقتدار میں نہیں آسکتے اُن کا میدان عالمی طاقتوں کی معرفت سازش کا میدان ہے اور وہ گٹھ جوڑ ہی سے ابھر سکتے ہیں۔ یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ میرزائی اُمت برِعظیم کی آزادی سے پہلے تک نہ صرف برطانیہ کی آلۂ کار رہی ہے بلکہ اب اُس کی حیثیت مستقلاً استعماری طاقتوں کے ایجنٹ کی ہو چکی ہے آج کل وہ امریکی استعمار کی کل پُرزہ ہے۔

بلوچستان

میرزا محمود احمد نے جس زمانہ میں بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانے کا اعلان کیا اس زمانے میں عوام تو کیا خواص کو معلوم نہ تھا بلکہ دانش ورانِ حکومت بھی اس سے بے خبر تھے کہ بلوچستان کی سرحدی وسیاسی پوزیشن کیا ہے اور اس کے بارے میں بعض عالمی طاقتوں کے ارادے کیا ہیں۔ اب ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء کے چار سال میں معلوم ہوا۔ کہ بلوچستان کے مسائل کیا ہیں؟ اور بعض غیر ملکی طاقتیں اس سے کیوں دل چسپی لے رہی ہیں۔ یہاں ان عوامل ومحرکات کو زیر بحث لانا مناسب نہ ہوگا جو خان قلات کی بغاوت ۱۹۵۸ء سے لے کر ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کی شکست (دسمبر ۱۹۷۱ء) تک ظہور میں آتے رہے۔ ایوب خان کے عہد میں بلوچستان پر بمباری اور قبائلی سرداروں کی سیادت کا ظہور اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔ سردار محمد اکبر بگٹی نے لندن میں اخبار نویسوں سے عندالملاقات جو بیان دیا اور جس طرح مغربی پاکستان میں مختلف آزاد ریاستوں کے تصور پر اشارے کیے بالخصوص پنجاب کے خلاف ان کی مسلسل ناراضی، تو ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کی آب وہوا کیا ہے؟ اور اس کے سیاسی مزاج کی مختلف لہریں کس طرح کام کرتی ہیں۔

شاہِ ایران، صدر بھٹو اور گورنر بزنجو کے درمیان مذاکرات (جون ۱۹۷۲ء) کوئی دوستانہ ملاقاتیں نہ تھیں بلکہ ایران کی ان سیاسی ضرورتوں کا اقتضا تھا جو ایک مدت سے شاہ کی پریشانی کا باعث ہو رہی تھیں۔ اس ضمن میں ایک بات واضح ہے کہ عرب ریاستوں کا وفاق ان کے علاقہ میں امریکی مفادات کو اسی صورت میں قائم رکھ سکتا ہے کہ بلوچستان کا نقشہ اس کے خلاف نہ ہو۔ عراق اور روس کے دفاعی معاہدے نے ایران کو غایت درجہ پریشان کر رکھا ہے جب چاروں طرف سے جمہوریت ہو تو بادشاہت کا مخدوش ہو جانا یقینی ہے۔ اس کے علاوہ روس گرم پانی کی تلاش میں پاکستان کی سمندری حد جیونی جو بلوچستان میں واقع ہے کو اپنے استعمال میں لانے کا متمنی ہے ادھر

ایران کے علاوہ عراق اور خلیج فارس کے علاقوں میں بلوچ پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں زمانہ کے ساتھ قومیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں عظیم بلوچستان کا منصوبہ قلات میں تیار کیا گیا۔ اس عنوان سے ایک کتاب بھی مرتب کی گئی جو ۱۹۴۲ء میں انگریزی حکومت نے ضبط کر لی مگر کتاب کے ضبط کیے جانے سے اس کے خیالات ختم نہیں ہوئے۔ عظیم بلوچستان کا تصور بلوچستان کی لیڈر شپ کے دماغ میں گھٹا نہیں بڑھا ہی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے بلوچستان دو حصوں میں منقسم تھا۔

(۱) برٹش بلوچستان

(۲) ریاستی بلوچستان

برٹش بلوچستان شمال مغربی حصہ پر مشتمل تھا جس میں زیادہ تر پٹھان آباد تھے۔ ریاستی بلوچستان میں خاران، مکران، قلات اور لس بیلا وغیرہ کے علاقے شامل تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری شروع ہوئی تو بلوچستان سب سے آخر میں سلطنت برطانیہ کا حصہ بنا۔ خان قلات اندرونی معاملات میں آزاد تھے اگر کوئی مسئلہ ریاستوں اور برطانوی بلوچستان کے درمیان اختلافی ہوتا تو اس کا فیصلہ شاہی جرگہ کرتا تھا۔

جس طرح انگریزوں کو کشمیر میں روس کی توسیع پسندی سے خطرہ تھا اسی طرح بلوچستان میں بھی ایسا ہی خطرہ محسوس کیا گیا اور ہمیشہ اس کے دفاع کو ملحوظ رکھا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کو خدشہ تھا کہ جرمنی عراق کے راستے خلیج فارس کے ذریعہ بلوچستان میں داخل ہوگا لیکن ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوگئی تو روس کا خطرہ لاحق ہوگیا اور اس طرح برطانوی مفادات کے لیے بلوچستان ایک اہم مرکز بن گیا۔ وہی انگریز جو ہندوستان چھوڑ رہے تھے وہ بلوچستان کو بالواسطہ اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے خان قلات کو یقین دلایا کہ وہ بلوچستان کو نیپال کی طرح آزاد حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں کوئٹہ کے پولیٹیکل ایجنٹ ڈی وائی فل نے خان قلات کو باور کرایا کہ برطانیہ بلوچستان کو برما اور لنکا کی طرح علیحدہ ریاست دیکھنا چاہتا

ہے۔

۱۹۴۷ء میں بلوچستان کے ایجنٹ مسٹر جیفرے نے خان قلات سے ملاقات کی اور انھیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پیغام دیا کہ وہ بلوچستان کو علیحدہ ریاست قرار دینے والے ہیں بشرطیکہ آپ لوگ آل بلوچستان کانفرنس منعقد کر کے اس امر کا مطالبہ کریں۔ خان قلات نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کی معرفت قائداعظم کو مطلع کیا جس سے معاملہ اُلٹ گیا۔

۱۲۔ اگست ۱۹۴۷ء کو نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ پاکستان نے قلات کو آزاد ریاست تسلیم کرلیا ہے۔ ۱۵۔ اگست کو خان قلات نے اپنی آزادی کا اعلان کیا لیکن خاران اور لس بیلا کے الحاق نے قلات کا بحری راستہ مسدود کر دیا پھر کچھ ایسے حالات نشوونما پانے لگے کہ خان قلات نے پاکستان میں شامل ہونا منظور کرلیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر فل اور ہینڈرسن بلوچستان میں برطانوی انخلا کے باوجود پخت و پز کر رہے تھے۔ جب صورت حال اس طرح پلٹا کھا گئی تو مسٹر فل اور مسٹر ہینڈرسن میرزا محمود سے ایک پُراسرار ملاقات کے بعد انگلستان چلے گئے۔[1] اُن کے فوراً بعد مرزا محمود نے بلوچستان کا دورہ کیا اور بلوچستان کو احمدی علاقہ بنانے کا اعلان کر دیا۔

قادیانی خصوصیت

میرزائی اُمت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے دو چیزیں خصوصیت سے ملحوظ رکھتی ہے۔

"اولاً: اس نے اپنی جماعت فراہم کرنے کے لیے محمد ﷺ عربی کی اُمت میں نقب لگائی ہے۔

ثانیاً: وہ ضعیف الاعتقاد لوگوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اپنے سیاسی منصوبوں کو

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۷۲ بعنوان احرار۔

الہامی سند مہیا کرتی ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ میرزائی مسلمانوں کے کسی ابتلا میں کبھی کام نہیں آئے بلکہ مسلمان سلطنتوں کے تاخت وتاراج ہونے پر چراغاں کیا' خلافت عثمانیہ کی تباہی پر جشن رچایا۔ انگریزوں کی کاسہ لیسی کو اپنے عقائد کا جزو سمجھا اور اس پر فخر کیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کے اسلامی ملکوں میں برطانیہ کے لیے جاسوسی کی خدمات سرانجام دیتے رہے اور آزادی کے بعد بھی اپنی یہی خصوصیت برقرار رکھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ۱۹۳۱ء میں کشمیری مسلمانوں کے ہم درد ہو گئے اور پاکستان آتے ہی حصولِ کشمیر کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ اس کا جواب تاریخِ احمدیت (مؤلفہ دوست محمد شاہد) جلد ششم کے صفحہ ۳۴۵ تا ۴۷۹ میں مرقوم ہے کہ میرزائیوں کی بلوچستان اور کشمیر سے دل چسپی کا باعث "مسیح موعود" اور "مصلح موعود" کے "الہامی ارشادات" ہیں یہ ذکر اوپر آ چکا ہے کہ وہ اپنی سیاسی ضرورتوں کو الہامات کی شکل دے کر شروع کرتے ہیں۔ تاریخ احمدیت کا مؤلف حکیم نور الدین خلیفہ اول کے ایک انکشاف کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ:

"آپ نے کوہ ہمالیہ سے (مطلب ہے کشمیر) شروع ہو کر بلوچستان اور ڈیرا غازی خان کے سب پہاڑی سلسلے گنے اور فرمایا ان پہاڑی قوموں کے اندر کوئی جائے اور ان میں زندگی پیدا کرے تو شاید ان میں حرکت پیدا ہو"۔ (صفحہ ۳۹۵)

میرزا بشیر الدین محمود کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ کشمیر اس لیے پیارا ہے کہ وہاں تقریباً اسی (۸۰) ہزار احمدی رہتے ہیں۔

۲۔ وہاں مسیحِ اول دفن ہیں اور مسیح ثانی (میرزا غلام احمد) کی بڑی بھاری جماعت اس میں موجود ہے۔

۳۔ جس ملک میں دو مسیحوں کا دخل ہے وہ ملک بہر حال مسلمانوں کا ہے اور مسلمان صرف احمدی ہیں۔

۴۔ نواب امام الدین جنھیں مہاراجا رنجیت سنگھ نے گورنر بنا کر کشمیر بھجوایا تھا وہ اپنے ساتھ بطور مددگار میرزا محمود کے دادا میرزا غلام مرتضٰی کو مہاراجا رنجیت سنگھ کی اجازت سے لے گئے تھے۔

۵۔ حکیم نورالدین (خلیفہ اول) جو میرزا محمود کے خسر بھی تھے ریاست میں شاہی طبیب رہے تھے۔

تاریخ احمدیت کے صفحہ ۴۸۰ پر اندرُونِ کشمیر کے احمدیوں کا نقشہ دیا گیا ہے۔ یہ نقشہ ۱۹۳۱ء کی احمدی جماعتوں کے مقامات کو ظاہر کرتا ہے' اسی صفحہ کے ساتھ جموں و کشمیر کا الگ نقشہ ہے جس میں جماعتِ احمدیہ کے حلقہ جات' مقامات اور مواضعات کے نام دیئے گئے ہیں۔ بارہ مولا کے حلقے میں ۷' اسلام آباد کے حلقہ میں ۶' کولگام کے حلقہ میں ۲۲' بلوامہ کے حلقہ میں ۳' جموں میں ۲' اُودھم پور میں ۳' ریاسی میں ۱۰' میر پور میں ۸' اور پونچھ میں ۱۴ جماعتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سب جماعتیں ڈلہوزی سے گڑھی حبیب اللہ تک سرحدات سے متصل علاقوں میں قائم ہیں۔

فرقان بٹالین

میرزا محمود نے ستمبر ۱۹۴۷ء کو رتن باغ لاہور میں مجلس شورٰی بلائی اور اپنے عم زاد ایم ایم احمد ڈپٹی کمشنر سیال کوٹ کے ایما پر جموں کی سرحد پر واقع گاؤں معراج کے میں چالیس پچاس قادیانیوں کی ایک کمپنی تعینات کی۔ ان کی کمان اپنے بھائی میرزا مبارک احمد کے حوالے کی۔ جون ۱۹۴۸ء میں فرقان بٹالین قائم کی۔ یہ بٹالین تاریخِ احمدیت کی روایت کے مطابق دو سال تک کشمیر کے محاذ پر لڑتی رہی۔ اس کا کیمپ سرائے عالم گیر کے قریب بنایا گیا۔ میرزا محمود امین الملک کا نام رکھ کر اس بٹالین کے کارناموں کا مشاہدہ کرنے محاذ پر گئے۔ اس فوج میں تاریخ احمدیت (صفحہ ۶۷۱) کے مطابق کوئی تین ہزار افراد تھے جن میں ہر حلقہ کے احمدی شامل تھے۔ خاندان مسیح موعود کے افراد' مبلغین احمدیت' مدرسہ احمد' جامعہ احمد اور تعلیم السلام کالج و اسکول کے اساتذہ و طلبہ' ڈاکٹر' زمین دار' دُکان دار' کلرک۔

فرقان بٹالین کا مقصد ایک تو وہی تھا کہ قادیانی اپنے سیاسی منصوبے کا راستہ صاف کرنا چاہتے تھے اور یہ ان کی عسکری تربیت کا پاکستان میں پہلا اجتماعی مظاہرہ تھا۔ اس کے علاوہ اسلحہ فراہم کرنا ان کا مقصود تھا۔ پونچھ کے مفتی اعظم کے الفاظ میں میرزائی اپنے اغراض مشؤمہ کو پروان چڑھانے کے لیے فرقان بٹالین کو معرض وجود میں لائے تھے۔ اس بٹالین پر یہ بھی شبہ کیا گیا کہ اس کی معرفت ہندوستانی فوج کو اطلاعات مل رہی ہیں لیکن یہ امر چوں کہ حکومت کے انٹیلی جنس بیورو تک محدود تھا اس لیے اس باب میں صحیح معلومات معلوم نہ ہوسکیں۔ بہرحال حکومت کی خفیہ اطلاعات اور چیدہ چیدہ علما کے بیانات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۵۔ جون ۱۹۵۵ء کو فرقان بٹالین توڑ دی گئی۔ یہ چیز اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ریاست کشمیر میں ابتداء پاکستانی فوج کے نہ لڑنے اور ہندوستان میں جنرل آکن لیک کو اس سلسلہ کی معلومات مہیا کرنے کا واحد ذریعہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی تھا۔ جب فرقان بٹالین ختم کی گئی تو اس نے ۱۷۔ جون کو اپنا دست خطی تہنیت نامہ لکھا جس میں اس کی خدمات کو سراہا گیا اور وہ خدمات سیال کوٹ کی سرحد پر جاسوسی کی خدمات تھیں کہ بھارتی فوج نے اطلاع پاتے ہی اپنے مدافعتی مورچوں کی نوعیت بدل لی تھی۔ کسی نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا کہ سیال کوٹ کے محاذ سے کٹھوعہ کتنی دور تھا یا شکر گڑھ اور قادیان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور ان میں کس قدر سرحدی قرابت ہے۔ ہندوستان نے مشرقی پنجاب کے ہر قصبہ وقریہ سے مسلمانوں کو محروم کر دیا لیکن میرزائی حضرات کو قادیان ہی میں رہنے دیا حالانکہ قادیان پاکستان اور بھارت کی سرحد پر واقع قریبی قصبہ ہے۔ بالفرض قادیانی مسلمان ہیں تو ان مسلمانوں سے بھارتی حکومت نے یہ رعایت کیوں برتی؟ حقیقت یہ ہے کہ میرزائی قادیان کے لیے پاکستان بھی ادا کرنے کو تیار تھے۔ میرزا محمود کے تقسیم ملک کے خلاف وہ تمام خطبات مطبوعہ ہیں جن میں انھوں نے قبل از تقسیم پاکستان کو اپنے سیاسی اور دینی مفادات کے منافی قرار دیا ہے، اسی طرح ۱۱۔ جون ۱۹۴۴ء کو میرزا صاحب نے پاکستان کے مطالبہ کو غلامی مضبوط کرنے والی زنجیر قرار دیا۔ ان سے تحقیقاتی کمیٹی میں سوال کیا گیا تو انھوں

نے تسلیم کیا کہ یہ میرے ہی الفاظ ہیں۔

تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۲۷۶ پر الفاظ ذیل ملتے ہیں:

''ہم دل سے پہلے ہی اکھنڈ ہندوستان کے قائل تھے جس میں مسلمان کا پاکستان اور ہندو کا ہندوستان ضا ورغبت شامل ہوں اور اب بھی ہمارا عقیدہ یہی ہے''۔

۳۔ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا تو میرزا محمود نے بہ عنوان ''سکھ قوم کے نام دردمندانہ اپیل'' ایک پمفلٹ لکھا جس کے آخری الفاظ تھے۔

''میں دعا کرتا ہوں کہ اے میرے رب میرے اہل ملک کو سمجھ دے۔ اول تو یہ ملک بٹے نہیں اور اگر بٹے تو اس طرح بٹے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہیں۔ اللّٰھم آمین''۔

مسٹر ایم ایم احمد کے والد میرزا بشیر احمد ایم اے نے بھی تقسیمِ پنجاب کے موضوع پر کئی ایک مقالات لکھے جن میں انھی خیالات کا اظہار کیا جو تقسیم کے خلاف میرزا محمود کے افکار کو محیط تھے۔

۴۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو چودھری ظفر اللہ خان کے بھتیجے کا نکاح تھا' میرزا صاحب نے فرمایا۔

''ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہندو مسلم سوال اُٹھ جائے' ساری قومیں شیر وشکر ہو کر رہیں۔ ملک کے حصے بخرے نہ ہوں۔۔۔۔ ممکن ہے عارضی طور پر کچھ افتراق ہو اور کچھ وقت کے لیے دونوں قومیں جدا جدا ہوں مگر یہ حالت عارضی ہو گی ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ حالت جلد دُور ہو جائے۔ بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر وشکر ہو کر رہیں''۔ (الفضل ۵۔ اپریل ۱۹۴۷ء)

۱۴۔ مئی ۱۹۴۷ء کو بعد از مغرب مجلس علم وعرفان میں فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے' ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم راضی ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے' پھر یہ کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد تر متحد

ہو جائیں''۔

منیر انکوائری رپورٹ کے مؤلفین نے بھی قادیانی اُمت کی اس روش کو تسلیم کیا ہے کہ وہ برعظیم کی تقسیم کے مخالف تھے اور قادیان کا حصول ان کے عقیدہ کا جزو لاینفک ہے' میرزا محمود نے اس غرض سے ۲۹۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کو اپنے ایک خطبہ میں کہا۔

''مایوس نہ ہونا' خدا تعالیٰ پر توکل کرو۔ اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ کے اندر ایسے سامان پیدا کر دے گا آخر یہودیوں نے ۱۲ سو سال انتظار کیا۔ پھر فلسطین میں آ گئے۔ آپ لوگوں کو تیرہ سو سال انتظار نہیں کرنا پڑے گا ممکن ہے ۱۳ بھی نہ کرنا پڑے ممکن ہے دس بھی نہ کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ اپنی برکتوں کے نمونے تمھیں دکھائے گا۔ (الفضل ۱۵۔ مارچ ۱۹۵۷ء)

۱۹۶۵ء کی جنگ

۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق نواب کالا باغ گورنر مغربی پاکستان نے اپنے کئی دوستوں سے بیان کیا اور راقم کو بھی عندالملاقات یہ کتھا سنائی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے جنرل ملک اختر حسین مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے پس و پیش کیا آخر ان کے زور دینے پر ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جنگ کرنا چاہتے ہیں لیکن ایوب خان نہیں مانتے میں ایوب سے کہوں کہ حصول کشمیر کے لیے یہ بہترین وقت ہے۔ میں جانتا تھا کہ اختر ملک قادیانی ہیں اور میرے پاس وہ ہینڈ بل بھی آ چکا تھا جو میرزائیوں نے کشمیر میں تقسیم کرایا تھا کہ مسیح موعود کا فرمان ہے کشمیر میری اُمت کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ نواب صاحب نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو بین الاقوامی سازش کا حصہ قرار دیتے ہوئے ساری کہانی بیان کی کہ پاکستان کو تاراج کرنے کے لیے کن لوگوں نے کیا عمل کیا؟

نواب کالا باغ حقیقتاً فیلڈ مارشل ایوب خان کے غایت درجہ وفادار تھے ان پر کبھی تنقید کرتے تو عموماً دو چیزوں پر اظہارِ ناراضی فرماتے۔ اولاً یہ کہ ان کے گردو پیش لادین عناصر جمع ہو گئے' ثانیاً ان کے مزاج میں قادیانی دخیل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ روایت خود مجھ سے ایس

آئی حق سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان نے بیان کی کہ مرکزی کابینہ کی ایک میٹنگ میں علما کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ایم ایم احمد بھی شریک تھا۔ اکثر وزرا نے زور دیا کہ علما اس ملک کے لیے رجعت و مصیبت کا باعث ہو گئے ہیں انھیں گربہ کشتن روز اول کے مصداق کھونٹے پر باندھا جائے۔ ساری کابینہ متفق نظر آ رہی تھی کہ مسٹر اے ٹی ایم مصطفےٰ نے شدت سے مخالفت کی اور یہاں تک فرمایا کہ ''علما کی آڑ میں اسلام کی مخالفت ہو رہی ہے کوئی غلط فیصلہ ہوا تو وہ کابینہ سے استعفیٰ دے دیں گے''۔ اسی اجلاس میں نواب کالا باغ نے ایم ایم احمد کو گھورتے ہوئے کہا کہ جن مولویوں سے آپ لوگ نالاں ہیں ان کی خطا کیا ہے یہی کہ وہ اس ملک میں اللہ ورسول ﷺ کا نام لیتے ہیں۔ آپ کو وہ لوگ نظر نہیں آتے جو یہاں نبوت کا کھڑاگ رچا کر خلافت بنائے بیٹھے ہیں اور میری معلومات کے مطابق ان کے خطرناک سیاسی منصوبے اس ملک کو تہس نہس کرنے کی خفیہ کوششوں کا حصہ ہیں۔ نواب کالا باغ کی اس گھرکی پر مسئلہ ختم ہو گیا لیکن اُدھر یہ واقعہ ہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان چودھری ظفر اللہ کو الگ کرنے کا سوچ رہے تھے اور میرزا محمود کے بعض سیاسی عزائم سے متعلق اُن سے جواب لینا چاہتے تھے کہ راولپنڈی میں ایک شخص سید اکبر کی گولی کا نشانہ ہو کر شہید ہو گئے۔

نواب کالا باغ اس کے بعد میرزائیوں کی نگاہ میں رڑکنے لگے۔ آخر میرزائی اُمت کی سازش کا شکار ہو کر گورنری سے الگ ہو گئے حتیٰ کہ انھیں بھی گولی کھا گئی۔ اس قسم کے شواہد نظائر موجود ہیں کہ جس نے بھی میرزائی اُمت کا محاسبہ کیا وہ اس کی احتسابی سازش کا شکار ہو گیا۔ ان لوگوں نے ایسے کسی شخص کو معاف نہیں کیا جو ان کے نزدیک قادیانی جماعت کا نکتہ چیں رہا ہو یا کبھی ان کا دوست نہ تھا۔

آستین کے سانپ

ہندوستان مخلوط تھا اور حکمران انگریز تھے تو میرزائی مسلمانوں میں تبلیغ کا حوصلہ نہ رکھتے

تھے۔ وہ مسلمان عوام میں سیاست رچانے سے محروم ہو چکے تھے لیکن پاکستان بنتے ہی وہ سرکش گھوڑے کی طرح ہو گئے انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس ملک کی عنان گویا ان کے ہاتھ میں ہو گی۔

شاہ جی نے احرار دوستوں کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کے بعد ۱۹۴۹ء کی آخری سہ ماہی میں فیصلہ کیا کہ قادیانیوں کے سیاسی عزائم سے حکومت کو مطلع کرتے رہنا چاہیے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اس غرض سے نامزد کیے گئے انھوں نے اکابر حکومت کو میرزائیوں کے خط وخال سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ جہاں تک میرزائیوں کے خلاف دینی محاذ کا تعلق تھا وہ سارا کام مولانا محمد علی جالندھری اور دوسرے رفقا کے سپرد کر دیا کہ ان کا تعاقب ہوتا رہے خود بھی گاہے ماہے مختلف شہروں کے جلسہ ہائے عام میں جانے لگے۔ فوری اثر یہ ہوا کہ میرزائی جس رفتار سے بڑھ رہے تھے اس میں کمی آ گئی۔ ادھر اوکاڑا میں ایک احمدی مدرس محمد اشرف اپنی سرکشی کے باعث ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ راولپنڈی باغ گوال منڈی میں ایک شخص ولایت خان نے بدر دین احمد کو موت کے گھاٹ اُتار ڈالا۔ قتل انسانی کسی لحاظ سے بھی پسندیدہ فعل نہیں، سزا دینے کا حق حکومت کی عدلیہ کو ہے لیکن ان حالات کے واحد ذمہ دار میرزا محمود تھے جو کسی روک ٹوک کے بغیر احمدیوں کو قتل وخون کی دعوت دے رہے تھے ان کا فرمان تھا کہ ''جو ہماری فتح کا قائل نہیں ہو گا تو صاف سمجھا جائے گا کہ اُسے ولد الحرام بننے کا شوق ہے اور حلال زادہ نہیں''۔

(انوار السلام صفحہ ۳)

میرزا محمود قادیان میں افراد کو قتل کرانے کے ماہر سمجھے جاتے تھے اس غرض سے وہ اپنے والد کی ''پیش گوئیاں'' اور اپنے ذاتی ''الہام'' استعمال کرتے۔ مسلمانوں کو کافر، سور اور ان کی عورتوں کو کتیا کہتے رہے۔ ان کے لیے کوئی روک یا پُرسش نہ تھی قادیان میں ایک متوازی حکومت قائم تھی۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ کو وہاں سے نکالا گیا۔ اس کا مکان جلا ڈالا، محمد حسین کو قتل کروایا جب قاتل پھانسی پا گیا تو اس کا جلوس نکالا اور بہشتی مقبرے میں دفن کرایا۔

یہ چیز پچھلے اوراق میں آ چکی ہے کہ میرزا محمود نے ایک شخص راجندر سنگھ آتش کو شاہ جی

کے قتل پر مامور کیا لیکن وہ ضمیر کی سرزنش پر منحرف ہو گیا۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۲ء کے الفضل میں میرزا محمود نے اعلان کیا کہ:

''آخری وقت آ پہنچا ہے ان علمائے حق کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جن کو یہ علما قتل کراتے آئے ہیں اب ان کے خون کا بدلہ لیا جائے گا''۔

اور وہ زیرِ عتاب علما کون تھے۔ میرزا محمود نے ان کے نام بھی درج کیے تھے۔

۱۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری۔	۲۔ مُلّا عبدالحامد بدایونی
۳۔ مُلّا احتشام الحق تھانوی۔	۴۔ مُلّا (مفتی) محمد شفیع
۵۔ مُلّا مودودی	

جسٹس منیر اور ان کے مآخذ یعنی سی آئی ڈی کے اربابِ بست و کشاد کے اس الزام کی تردید تو اسی اعلان سے ہو جاتی ہے کہ تحریکِ ختمِ نبوّت احرار احمدی نزاع تھا یا کیا تھا۔ شاہ جی کے سوا باقی چار میں سے کوئی بھی احراری نہ تھا اور نہ کبھی احرار سے وابستہ رہا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مفتی محمد شفیع شروع ہی سے لیگ میں تھے۔ شاہ جی یا دوسرے زعما ان تہدیدوں کا نوٹس نہ لیتے تو غلط ہوتا۔ میرزا کی اُڑان گھائیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ تحریکِ ختمِ نبوت کے مطالبات واضح و مدون ہوتے گئے۔

۱۷۔ مئی ۱۹۵۲ء کو چودھری ظفر اللہ خان نے جہاں گیر پارک کراچی میں احمدیوں کے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا، خواجہ ناظم الدین نے انھیں منع کیا کہ وہ اس جلسہ میں شریک نہ ہوں لیکن چودھری صاحب نہ مانے اور خواجہ صاحب سے کہا کہ وزیرِ اعظم اس بات پر مصر ہوں تو وہ اپنے عہدے سے مُستعفی ہونے کو تیار ہیں۔

''چودھری صاحب نے جلسہ میں فرمایا کہ:

احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے، وہ اب جڑ پکڑ گیا ہے اگر یہ پودا اُکھاڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا بلکہ ایک سُوکھے ہوئے

درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا''۔

(تحقیقاتی رپورٹ اُردو متن صفحہ ۷۷)

اس جلسہ کے ردِعمل میں فساد ہو گیا نتیجۃً میرزائیوں کی بعض عمارتوں کو نقصان پہنچا۔

آل پاکستان مُسلم پارٹیز کنونشن:

جب پانی سر سے گزر گیا اور میرزائی منہ زوری کے علاوہ سینہ زوری پر تُل گئے تو مولانا لال حسین اختر نے تھیوسوفیکل ہال کراچی میں آل پاکستان مُسلم پارٹیز کے مقامی زعما کی ایک کانفرنس بلوائی۔ جس میں ظفر اللہ خان کے جلسہ سے پیدا شُدہ صورتِ حال پر غور کیا گیا اور قادیانی مسئلہ سے متعلق مطالبات مرتب کرنے کے لیے ۳۔ جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلس مشاورت طلب کی گئی۔ اس دعوت نامہ پر مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا عبدالحامد بدایونی' مفتی جعفر حسین مجتہد' مولانا محمد یوسف کلکتوی اور مولانا لال حسین اختر کے دست خط تھے۔ ذیل کے مطالبات مرتب کیے گئے۔

۱۔ قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ چودھری ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ کے عہدے سے سبک دوش کیا جائے۔

۳۔ تمام کلیدی عہدوں سے احمدیوں کو ہٹا دیا جائے۔

۴۔ ان مقاصد کو قطعی شکل دینے کے لیے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کیا جائے۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ کنونشن منعقد کرنے کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا۔ جلسہ عام میں محولہ مطالبات کی تصدیق کرائی گئی۔ بورڈ کے ارکان حسب ذیل تھے۔

۱۔ علامہ سلیمان ندوی	۲۔ مفتی محمد شفیع
۳۔ مولانا عبدالحامد بدایونی	۴۔ علامہ محمد یوسف کلکتوی
۵۔ علامہ مفتی صاحب داد صاحب	۶۔ علامہ سلطان احمد
۷۔ علامہ شاہ احمد نورانی	۸۔ مولانا لال حسین اختر

۹۔ الحاج ہاشم گزدر ۱۰۔ مفتی جعفر حسین مجتہد

۱۱۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کنوینر مقرر کیے گئے۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو الحاج محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ہوا' مندرجہ تحت جماعتوں کو کنونشن میں شمول کے لیے دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۔ جمعیۃ العلمائے پاکستان ۲۔ جمعیۃ العلمائے اسلام

۳۔ جماعت اسلامی۔ ۴۔ تنظیم اہلِ سنت والجماعت

۵۔ جمعیۃ اہلِ سنت ۶۔ جمعیۃ اہلِ حدیث

۷۔ موتمر اہلِ حدیث پنجاب ۸۔ ادارہ تحفظ حقوقِ شیعہ پنجاب

۹۔ سفینۃ المسلمین ۱۰۔ حزب اللہ مشرقی پاکستان

۱۱۔ مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوۃ ۱۲۔ مجلسِ احرار

۱۳۔ جمعیۃ العربیہ ۱۴۔ جمعیۃ الفلاح

لاہور کنونشن

شاہ جی صورتِ حال کے بگاڑ کو پوری طرح جان چکے تھے اور ان کی نگاہ پاکستان میں قادیانی مسئلے کے احوال و وقائع پر تھی۔ انھوں نے رفقا کو مشورہ دیا کہ وہ خود جا کر ہر مکتب خیال کے علما کو قادیانی اُمت کے عزائم سے آگاہ کریں پھر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے جو زائے ان سب کی ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔[1]

چنانچہ شاہ جی کی حسب ہدایت ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی اس کانفرنس کا دعوت نامہ حسب ذیل حضرات کے دست خطوں سے جاری ہوا۔

مولانا غلام محمد ترنم' مفتی محمد حسن' مولانا احمد علی' مولانا محمد علی جالندھری' مولانا داؤد غزنوی' مولانا نور الحسن بخاری' سید مظفر علی شمسی' مولانا غلام غوث ہزاروی۔

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ ختم نبوت کے مسئلہ میں سرکاری افسروں کے رویے اور ان کے اہتمام میں خون خرابہ کی جامع دستاویز ہے۔

شاہ جی تشریف لائے تو پہلی قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ آپ کے دائیں طرف حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑہ شریف کے فرزند ارجمند سید غلام محی الدین شاہ تشریف فرما ہیں۔ شاہ جی دفعۃً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ صاحب زادہ صاحب کے پاؤں کی طرف احتراماً بڑھا دیے لیکن صاحب زادہ صاحب نے روک کر معانقہ کیا۔ اس کانفرنس میں ذیل کے مطالبات طے کیے گئے۔

۱۔ میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے سبک دوش کر دیا جائے۔

۳۔ میرزائی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے الگ کیا جائے۔

۴۔ ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

برِ عظیم کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ تمام مکاتب خیال کے علما و مشائخ اس طرح اکٹھے ہوئے تھے۔

کراچی میں ۱۳۔ جولائی کو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے علما و مشائخ کا اجتماع ہوا تو لاہور سے مولانا ابوالحسنات قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش شامل ہوئے۔

اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۱۶، ۱۷، ۱۸ جنوری کو کراچی میں کنونشن منعقد کیا جائے۔ اس دوران میں حکام مجاز نے طرح طرح کے فیصلے کیے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ان کے دماغ کی غلطیاں تھیں یا دل کی شرارتیں۔ بہر حال تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں سرکاری افسروں کے والوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تمام علما و اکابر کو نظر انداز کر کے اس مسئلہ میں صرف احرار کو مطعون کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اس کا الزام احرار پر عائد کریں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک نہیں کئی غلطیاں کیں۔ دوسرے تمام عناصر جو اس مسئلہ میں پیش پیش تھے اور آخر تک نمایاں و ممتاز رہے ان کی تعداد بہ مقابلہ احرار کسی طرح بھی نوے فی صد سے کم نہ تھی

اور یہ وہی لوگ تھے جو کبھی کانگرس یا اس کی ہم خیال جماعت میں نہ رہے تھے اور ہمیشہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے متعلق ہمیشہ یہی فیصلہ کیا گیا کہ انھیں نہ پکڑا جائے لیکن شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، سید عنایت شاہ بخاری اور صاحب زادہ فیض الحسن شاہ وغیرہ کو پکڑا گیا کہ وہ احرار کے راہ نُما تھے۔ سرکاری افسر غالباً ربوہ کے مشورہ سے مسئلہ کو احرار احمدی نزاع کا نام دے کر احرار کو ختم کرنے کے منصوبہ کی تیاری میں منہمک تھے۔ اس افسر شاہی کا خمیازہ ۱۸۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو اہلِ ملتان نے بھگتا کہ تھانہ کپ سے باہر پولیس نے احتجاجی جلوس پر فائرنگ کی۔ تین آدمی شہید اور تیرہ زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں میں سے بھی تین ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک جج کو انکوائری پر مقرر کیا اس نے پولیس فائرنگ کو جائز قرار دیا۔ اس افسر شاہی کا ایک مظہر آغازِ احمد رضا، ڈپٹی کمشنر ملتان تھا جو ایک بدمزاج قسم کا افسر تھا اُسے ہمیشہ یہ زعم رہا کہ وہ کوئی اعلیٰ مخلوق ہے حالانکہ وہ محض ایک ڈپٹی کمشنر ہی تھا۔

اس المیہ کا مسلمانوں کو بڑا صدمہ تھا کہ ایک تھانے دار نے مسلمانوں کے احتجاج کو اپنے تشدد کا نشانہ بنایا جس سے نوبت گولی تک جا پہنچی۔

اسی دوران میں مسلم لیگ کی مختلف شاخوں نے مندرجہ بالا مطالبات کی تائید کی حتیٰ کہ صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی اس ضمن میں ایک تائیدی قرار داد پاس کی جس میں میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹۰ جلسے ہوئے جن میں ۱۶۷ کا اہتمام مجلس احرار کی شاخوں نے کیا اور ان میں محولا بالا مطالبات کی تائید کی گئی۔

جو علما کراچی کانفرنس میں شریک ہوئے وہ یہ تھے۔

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۳۔ مولانا ابوالحسنات قادری
۴۔ مولانا محمد یوسف بجنوری
۵۔ مولانا احمد علی لاہوری
۶۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ

۷۔ مولانا شمس الحق وزیر معارف قلات ۸۔ خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور

۹۔ پیر سرسینہ شریف ڈھاکا ۱۰۔ مولانا راغب احسن ایم اے ڈھاکا

۱۱۔ مولانا اظہر علی ڈھاکا ۱۲۔ مولانا سخاوت الانبیا ڈھاکا

۱۳۔ مولانا حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ ۱۴۔ مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ ڈھاکا

۱۵۔ مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ لاہور۔ ۱۶۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی

۱۷۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ ۱۸۔ علامہ سید سلیمان ندوی

۱۹۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی۔ ۲۰۔ مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی

۲۱۔ مولانا مفتی صاحب داد خان صاحب سندھ مدرسہ کراچی ۔۲۲۔ مولانا عبدالحامد بدایونی

۲۳۔ مولانا محمد یوسف کلکتوی۔ ۲۴۔ مولانا محمد اسماعیل گوجراں والا۔

۲۵۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ ۲۶۔ مولانا محمد علی جالندھری

۲۷۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔

حسب ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں۔

(۱) چوں کہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس امر کی کوئی اُمید نہیں کہ میرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے اس لیے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے ''راست اقدام'' ناگزیر ہو گیا ہے۔

(۲) چوں کہ حکومت میرزائیوں کو ایک غیر مُسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں اس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا لازم ہو گیا ہے کہ فرقہ میرزائیہ کو ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) چوں کہ میرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا اس لیے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتا ہے تا کہ مسلمانان پاکستان

اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۴) مذکورہ بالا مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتا ہے کہ وہ معزز و مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمایندوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

(۵) جنرل کونسل اپنے پندرہ ممبروں کو منتخب کرے جو مجلس عمل کے ممبر قرار پائیں۔

جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے۔

۱۔	مولانا سید ابوالحسنات قادری	۲۔	امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۳۔	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۴۔	مولانا عبدالحامد بدایونی
۵۔	حافظ کفایت حسین	۶۔	مولانا احتشام الحق تھانوی
۷۔	ابوصالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان		
۸۔	مولانا محمد یوسف کلکتوی۔		

اور ان ممبروں کو اختیار دیتی ہے کہ بقیہ سات ممبروں کو اپنی مرضی سے نامزد کر لیں۔

(۶) مجلس عمل کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات کو منظور کرانے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرے۔

(۷) مجلسِ عمل کو ہدایت دی جاتی ہے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرنے سے پیش تر ایک نمایندہ وفد مرتب کرے جو مرکزی حکومت سے ملاقات کر کے اُسے لوگوں کے آخری فیصلے سے مطلع کر دے۔ اس وفد کو اختیار ہوگا کہ کابینہ کو آخری جواب کے لیے مزید وقت دے دے۔

اُسی دن نمازِ مغرب کے بعد مجلسِ عمل کے آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل سات ممبروں کو شامل کیا گیا۔

۱۔	پیر غلام مجدد سرہندی	۲۔	مولانا نور الحسن
۳۔	ماسٹر تاج الدین انصاری	۴۔	مولانا اختر علی خان
۵۔	مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی	۶۔	صاحبزادہ فیض الحسن شاہ

۷۔ حاجی محمد امین سرحدی۔

اس اجلاس میں مجلسِ عمل نے ایک وفد مرتب کیا جو خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کرے چنانچہ ایک وفد جس کے رئیس مولانا عبدالحامد بدایونی اور جس کے شرکا (۱) پیر صاحب سرسینہ شریف (۲) سید مظفر علی شمسی سیکرٹری ادارۂ تحفظ حقوقِ شیعہ لاہور (۳) ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار تھے۔

وفد ۲۲۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہوا۔ خواجہ صاحب نے مطالبات پر ہمدردی کا اظہار کیا لیکن فرمایا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔[۱]

خواجہ ناظم الدین ۱۶۔ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے تو مولانا اختر علی خان، مولانا ابوالحسنات، سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری اور حافظ خادم حسین پر مشتمل ایک وفد اُن سے دوبارہ ملا۔ خواجہ صاحب نے بعض مشکلات کے پیشِ نظر وہی عذر کیا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ۲۱۔ فروری ۱۹۵۳ء کو علما کا ایک اور وفد جس میں مولانا علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا اختر علی خان شامل تھے، خواجہ صاحب سے کراچی میں ملا اور انھیں بتایا کہ الٹی میٹم کا ایک مہینا گزر چکا ہے۔ اگلے روز ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات اور سید مظفر علی شمسی سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں خواجہ صاحب سے ملے، اِتمام حجت کیا۔ خواجہ صاحب نے اس وفد کو وہی منفی جواب دیا کہ نہ تو ان کے مطالبات تسلیم کیے جا سکتے ہیں اور نہ وہ انھیں دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔ فرمایا کہ میرزائیوں کو چھیڑنے سے امریکہ ہمیں گندم دے گا اور نہ مسئلہ کشمیر کے حل میں ہماری مدد کرے گا۔ واضح رہے کہ اُن دنوں ملک کا دستور آخری مراحل میں تھا اور علما کی مجلسِ عمل کو اصرار تھا کہ میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔ خواجہ صاحب کے دوٹوک فیصلے سے مجلسِ عمل کے زعما مایوس ہو گئے تو ۲۶۔ فروری ۱۹۵۳ء کو صورت حال پر غور

---

[۱] واوین کا طویل اقتباس تحقیقاتی کمیٹی سے من وعن نقل کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۳۳۔۱۳۴

کرنے کے لیے کراچی ہی میں اجلاس کیا۔ حضراتِ ذیل شریکِ اجلاس تھے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ صاحب زادہ فیض الحسن۔ سید نورُ الحسن بخاری۔ مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ۔ مولانا عبدالحامد بدایونی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔ مولانا محمد یوسف کلکتوی اور سید مظفر علی شمسی۔ مولانا ابوالحسنات نے اجلاس کی صدارت کی اور فیصلہ کیا کہ راست اقدام کی شکل کیا ہو۔ پانچ رضا کار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پرامن رہ کر لگا تار مظاہرہ کریں اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جاری رہے۔ مولانا ابوالحسناتؒ کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ مطلقاً نہ جائیں۔

حکومت نے ۲۶۔ اور ۲۷۔ فروری کی درمیانی رات..... سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور ان کے رفقا کو گرفتار کرلیا اور پنجاب میں احرار کے متعلقین کو پکڑ کے جیلوں میں ڈال دیا۔ اس جانب دارانہ تشدّد سے لوگ برافروختہ ہوگئے اور صوبہ بھر میں برہمی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لاہور، سیالکوٹ، گوجراں والا، راول پنڈی، لائل پور[1] اور منٹگمری میں لوگوں نے اس شدّت سے احتجاج کیا کہ لا اینڈ آرڈر کی آبرو اُٹھ گئی اور قریب قریب نظامِ حکومت معطل ہو گیا۔ لاہور کے احتجاجی مظاہرے قابو سے اس قدر باہر ہوگئے کہ چھے مارچ کو شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جو کچھ لاہور میں ہُوا راقم اس کا چشم دید گواہ ہے۔

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ احتجاجی جلوس ہزار ہا لوگوں پر مشتمل ہوتے اور میرزائیوں کے خلاف پُرجوش نعرے بلند کیے جاتے تھے لیکن عام جلوس دہلی دروازے سے شروع ہو کر چیئرنگ کراس پر ختم ہو جاتے کسی مرحلے میں بھی اہلِ جلوس کی طرف سے کوئی سی بدنظمی کا اِرتکاب نہ ہُوا۔

(۲) ان پُرامن مظاہروں کا خاتمہ مشکل تھا۔ انتظامیہ کے پاس ایسا کوئی قانون نہ تھا جس سے وہ مظاہرے ختم کر سکتی۔ راقم سے خود ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بیان کیا کہ ہر روز کے اس

---

[1] فیصل آباد کا نام اُس وقت لائل پور تھا۔

جلوس کوختم کرنے کے لیے وہ تشدد کی طرح ڈال کر قضیہ نمٹا دیں گے۔

(۳) چنانچہ حکام نے اپنے سفید پوش اہل کاروں کی معرفت پولیس پر پتھراؤ کیا اور اس طرح فائرنگ کی بنیاد رکھی۔

(۴) شہر کے مختلف حصوں میں پولیس اور عوام میں تصادم شروع ہو گیا۔ نتیجۃً سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ مرحوم کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے چوک دال گراں میں مظاہرین کو بُری طرح مارا اور قرآن مجید کی توہین کی تھی۔ مسجد وزیر خان کے پاس ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا پھر چھُروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کر دیا۔ سید فردوس شاہ کے جسم پر زخموں کے ۵۲ نشان تھے۔

(۵) کئی جگہ قادیانی' جیپ میں سوار ہو کر فائرنگ کرتے رہے لیکن انھیں روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہ تھا بعض قادیانی العقیدہ پولیس افسروں نے اپنے علاقہ میں مسلمان نوجوانوں کو بے دریغ شہید کیا۔

(۶) اس [illegible]یانہ تشدد کے ہاتھوں تنگ آ کر مسلمانوں نے مسجد وزیر خان میں کیمپ لگا لیا اور پولیس کی رپورٹوں کے مطابق ایک متوازی حکومت قائم کی اس کیمپ کے انچارج مولانا عبدالستار خان نیازی تھے۔

(۷) لاہور میں مال روڈ پر چینیز لنچ ہوم کے سامنے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے ۱۵ سے ۲۲ سال کی عمر کے نوجوانوں کی ایک جماعت پر ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے گولیوں کی بوچھاڑ کرا[illegible] اور دس بارہ بے گناہ نوجوانوں کو شہید کروا ڈالا۔ یہ نظارہ انتہائی دردناک تھا۔

(۸) لاہور چھاؤنی کے ملٹری ہسپتال میں بہت سے مظاہرین جو فوج کی گولی سے مجروح ہوئے تھے' انتہائی استقامت سے پڑے تھے ان میں سے ایک نوجوان نے ہوش میں آتے ہی اپنے کرنل ڈاکٹر سے سوال کیا اس کے چہرے پر کسی خوف کے آثار تو نہیں ہیں؟ جب اسے کہا گیا کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا چہرہ فخر و مسرت سے تمتما اُٹھا۔

(۹) ۶۔ مارچ کو مارشل لا نافذ کر کے سارا شہر فوج کی نذر کر دیا۔ فوج نے اپنی ہی قوم کے ساتھ انتہائی بے رحمانہ سلوک کیا اس سے پہلے کم از کم دو نسلیں مارشل لا کی سنگینی سے نا آشنا تھیں۔

(۱۰) مولانا ابوالاعلیٰ موودودی اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ملٹری کورٹ نے موت کی سزائیں دیں اور ان دونوں حضرات نے پھانسی کی کوٹھری میں جس بے نظیر استقامت و ایمان کا مظاہرہ کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ موودودی نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اس حکومت سے کوئی اپیل نہ کرنا پھانسی پا جاؤں تو انھی کپڑوں میں دفنا دینا۔ مولانا سے چند قدم آگے مولانا عبدالستار خان نیازی پھانسی کی کوٹھری میں بند تھے وہ ان کے ملاقاتیوں کو للکارتے اور کہتے کہ اس بزدل حکومت میں یہ جرأت نہیں کہ مجھے پھانسی پر لٹکا سکے۔ بھلا مولانا کو پھانسی پر کیوں کر لٹکا سکتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی مولانا کو پھانسی پر لٹکانے کا خطرہ مول نہیں لے گی وہ اپنی موت سے ڈرتی ہے۔

(۱۱) اولاً پولیس، ثانیاً مارشل لا ان دونوں کے ہاتھوں لاہور کے مسلمانوں کی جو بے عزتی کی گئی وہ تشدد و بہیمیت کا ایک ایسا سانحہ تھا کہ اس سے پہلے کسی نے ۳۴ برس میں ایسا اندوہ ناک ڈراما نہیں دیکھا تھا۔

(۱۲) انگریزوں کے زمانہ میں لاہور کا شاہی قلعہ سیاسی اسیروں کے خلاف استعمال ہوتا تھا اس تحریک میں بھی کئی علما کو گرفتار کر کے قلعہ میں لے جایا گیا وہاں ایک ایسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ان سے استفسار پر لگایا گیا جو انگریزوں کے زمانہ سے جھوٹے سیاسی مقدمے بنانے میں ماہر تھا اور جسے اپنے طرزِ استبداد پر ہمیشہ ناز رہا۔

اس نے ان علما کے خلاف اس قسم کی واہیات زبان استعمال کی کہ ایک شریف آدمی تخلیہ میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ مثلاً اس نے بعض خوب صورت لڑکے کوٹھڑیوں میں ان کے ساتھ ڈال دیئے اور استہزاءً ان سے کہا کہ امیر شریعت کی سنت تازہ کرو۔

شاہ جی اور اُن کے ساتھیوں مولانا سید ابوالحسنات، ماسٹر تاج الدین انصاری مولانا

لال حسین اختر‘ صاحب زادہ فیض الحسن اور سید مظفر علی شمسی وغیرہ کو گرفتار کر کے پہلے کراچی جیل میں رکھا پھر سکھر جیل بھجوا دیا‘ جہاں ان کے لیے خاصی پریشانی پیدا کی گئی۔ ادھر حکومت پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر سکھر جیل گیا اور ان سے کہا کہ مسلمانوں کی حکومت ہے ایک اسلامی سلطنت میں اس قسم کی تحریک چلانا مناسب نہیں۔ چار سطریں لکھیے اور گھر جائیے۔ شاہ جی نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی حکومت ہے اور پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہے مگر ؎

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

مسلمانوں کی ساری تاریخ یہی ہے کہ چند لوگ حکمرانی کرتے اور کچھ لوگ ان کے ہاتھوں قید و بند میں رہتے ہیں بھلا اس کے بغیر کوئی سی اسلامی حکومت کیوں کر مکمل ہوتی ہے؟

اس ساری صورتِ حال سے اگر کوئی شخص خوش تھا تو وہ صرف ربوہ کا خلیفہ میرزا محمود تھا یا اس کی جماعت‘ جس نے بعض پولیس افسروں کو ہر قسمی آب و دانہ مہیا کر رکھا تھا۔

شاہ جی کے مرض الموت کا آغاز سکھر جیل ہی سے ہوا اچانک معلوم ہوا کہ ان کا جسم کئی بیماریوں کا محور ہو گیا ہے۔

لاہور میں یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقاتی کمیٹی نے کام شروع کیا تو کمیٹی کے سامنے جواب دہ فریقوں میں احرار زعما کو بھی شامل کیا گیا۔ اس غرض سے ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو شاہ جی اور ان کے تمام ساتھی لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیے گئے۔

شاہ جی اس کمیٹی سے تعاون کے حق میں نہ تھے۔ راقم کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ وہ اکثر نازک مرحلوں میں استدلال کے بجائے وجدان سے باتیں کرتے اور عموماً ایسی باتیں کہ جاتے جو بظاہر عجیب سی معلوم ہوتیں لیکن جب نتائج سامنے آتے تو اُن کے مطابق ہوتے۔ شاہ جی کو اصرار تھا کہ ”تحقیقاتی کمیٹی جسٹس منیر کی وجہ سے کبھی صحیح نتائج مرتب نہ کر سکے گی۔ میں ذاتی طور پر منیر کو جانتا ہوں وہ احرار کا دشمن اور احمدیوں کا دوست ہے۔ اس کی ضرورتیں احمدی بکمال و تمام پوری کر سکتے ہیں بہتر ہے کہ ہم اس فتنہ کا ساتھ نہ دیں اور جو شخص عاقبت خراب

کرنے پر تُلا ہُوا اُسے عاقبت خراب کرنے دیں۔ منیر دنیادار انسان ہے وہ آخرت کو نہیں مانتا اور نہ اُسے توحید و رسالت سے آگاہی وارادت ہے۔ شاہ جی کے رفقا نے ان کی بات نہ مانی اور تحقیقاتی کمیٹی سے تعاون کا فیصلہ کرلیا۔

اس کمیٹی کے اجلاسوں میں جو کچھ ہُوا وہ غایت درجہ افسوس ناک ہے۔ جسٹس منیر علما کی اہانت پر تُلے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے علما اور اسلام کو اپنی ژاژ خائی کا ہدف بنایا۔ یکم جولائی ۱۹۵۳ء سے لے کر ۲۳۔ جنوری ۱۹۵۴ء تک اس کمیٹی کے ۱۱۷۔ اجلاس ہوئے جن میں ۹۲۔ اجلاس شہادتوں کی سماعت اوران کے اندراج میں صرف ہوئے۔ یکم فروری سے ۲۸۔ فروری ۱۹۵۴ء تک طرفین میں بحث ہوتی رہی اس کے بعد ۱۰۔ اپریل ۱۹۵۴ء کو کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت پنجاب کو پیش کردی یہ کہنا مشکل ہے کہ احرار کے عدم تعاون سے کمیٹی کیا کرتی اور نتیجہ کیا ہوتا لیکن تعاون کا نتیجہ یہ تھا کہ جسٹس منیر نے کُھلے اجلاسوں میں علما کا حد درجہ استخفاف کیا۔ افسوس کہ علما نے برداشت کیا اگر کوئی دیوانہ جسٹس منیر کو ٹوک دیتا تو لازماً کمیٹی کو علما کی اہانت کرنے کے شوق سے دست بردار ہونا پڑتا۔

ان دنوں راقم نے اپنے جریدے میں ایک شذرہ لکھا۔ مُلا کو گالی نہ دو'' ۔ اصلاً یہ خلیفہ عبدالحکیم کے اس مقالہ کا جواب تھا جو انھوں نے ''مُلا اور اقبال'' کے عنوان سے لکھا۔ اور اس میں علما کو بزعمِ خویش رسوا کرنا چاہا تھا۔ اس شذرہ کو دیکھتے ہی جسٹس منیر نے راقم کو عدالت میں طلب کرلیا'' فوراً گرفتار کر کے پیش کرو'' کے تحت راقم سہ پہر کے اجلاس میں خود ہی پیش ہو گیا۔ جسٹس منیر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔

وہ۔ یہ شذرہ آپ نے لکھا ہے؟

مَیں۔ جی ہاں۔

وہ۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اسے کو سمجھتے نہیں۔

مَیں۔ ضرور سمجھتے ہوں گے۔

وہ۔ یہ عدالت کی توہین ہے۔

مَیں ۔عدالت کی توہین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہ۔اس کے بین السطور میں عدالت پر تنقید کی گئی ہے۔

مَیں ۔مُعاف کیجیے اسلام سب جوڈس (Subjudice) نہیں ہو گیا۔ میں نے اسلام کا دفاع کیا ہے اور اگر اسلام کا دفاع کرنا جُرم ہے تو مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔

جسٹس کیانی ۔علما کا مذاق کہاں اُڑایا جاتا ہے؟

میں ۔کافی ہاؤس جیسے مشروب خانوں میں

جسٹس کیانی ۔لوگ کیا کہتے ہیں؟

مَیں ۔مَیں ان کی خرافات کو یہاں بیان کرنا نہیں چاہتا نقل کیا تو اس سے عدالتِ عالیہ کے حُسنِ سماعت میں خراش پیدا ہوگی۔

جسٹس کیانی ۔آپ کافی ہاؤس میں روز وشب کے بیٹھنے والوں میں سے ہیں۔

مَیں ۔جی نہیں، صبح شام کے بیٹھنے والوں میں سے ہوں، رات کو کافی ہاؤس بند ہو جاتا ہے۔

جسٹس منیر جس تیزی سے بول رہے تھے مدّھم ہو گئے اور اگلی تاریخ ڈال دی پھر چھوڑ دیا۔

پنجاب میں اتنا خون خرابا ہو چکا تھا کہ جب تک لوگوں کے دل راضی نہ ہوں کسی حکومت کے لیے بھی کام کرنا مشکل تھا۔ایک اندازے کے مطابق تحریک میں کوئی ایک ہزار افراد شہید ہوئے، مجروحین کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ ہر گھر حکومت سے بددل تھا۔اولاً میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت اعلیٰ برخاست کی گئی اور ملک فیروز خان نون کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ انھوں نے تقریباً سبھی قیدیوں کو رہا کر دیا۔اُدھر مرکزی حکومت میں میرزائیوں کی ملی بھگت سے سازش کا ایک چکّر شروع ہو گیا۔ملک غلام محمد نے قومی اسمبلی کو برخاست کر دیا۔خواجہ ناظم الدین وزارتِ عظمیٰ سے نکال دیئے گئے۔ان کی جگہ امریکا میں پاکستان کے سفیر مسٹر محمد علی بوگرا کو درآمد کیا گیا اور وزیر اعظم بنائے گئے۔مولوی تمیز الدین سپیکر نیشنل اسمبلی نے برخاستگی کے خلاف رٹ کی لیکن جسٹس منیر نے یہاں بھی گُل کھلایا اور ملک غلام مُحمد کے اقدام کو جائز قرار دے کر ایک غیر قانونی اقدام کی تصدیق کر دی۔اس فیصلے سے ملک میں عدالتی وقار مجروح ہو گیا اس کے ذمہ دار

صرف جسٹس منیر تھے۔

رٹ اور رہائی

مسٹر محمود علی قصوری نے حضرت شاہ صاحب، مولانا ابوالحسنات، صاحب زادہ فیض الحسن اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر دی۔

جسٹس ایس اے رحمٰن نے قانونی غلطی کا فائدہ دے کر ۸۔ فروری ۱۹۵۴ء کو انھیں رہا کر دیا۔ نتیجۃً حضرت شاہ صاحب اور ان کے محولا بالا ساتھی ۸۔ فروری ۱۹۵۴ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا ہو گئے۔

رہائی کے فوراً بعد شاہ جی نے ملتان میں ایک استقبالیہ کو خطاب کیا۔ عمر بھر کی روایت کے خلاف آغاز تقریر میں خطبہ مسنونہ کی تلاوت نہ کی۔ لوگ ششدر رہ گئے۔ فرمایا لیڈیز اینڈ جینٹلمین! مجمع کھلکھلا اٹھا۔ کسی نے کہا۔

شاہ جی یہ کیا؟

فرمایا کچھ نہیں، قرآن اس لیے نہیں پڑھوں گا مبادا جسٹس منیر توہین عدالت میں باندھ لیں۔ رہا لیڈیز اینڈ جینٹلمین، تو جسٹس منیر نے انکوائری رپورٹ میں لکھ دیا ہے مسلمان کی کوئی تعریف نہیں اب یہ ملک مسلمانوں اور مسلمات کا نہیں، لیڈیز اینڈ جینٹلمین کا ہے"۔

اسی سال (۱۳۔ ستمبر) حضرت شاہ صاحب کو ملتان کے ایک اجلاس میں مجلسِ ختمِ نبوت ﷺ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۶۔ نومبر کو گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا لیکن جلد ہی اس کا اثر زائل ہو گیا۔ یہ گویا مہلک مرض کے آغاز کا انتباہ تھا۔ لاہور میں شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

جو لوگ تحریکِ ختمِ نبوت میں جہاں تہاں شہید ہوئے ہیں ان کے خون کا جواب دِہ میں ہوں۔ وہ عشقِ رسالت ﷺ میں مارے گئے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبہ شہادت مَیں نے پھونکا تھا۔ جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کنی

کترارہے ہیں ان سے کہتا ہوں کہ حشر کے دن بھی اس خون کا ذمہ دار ہوں گا۔ اگر ان دانش ورانِ بے دین یا دین دارانِ بے عشق کے نزدیک ان کا جان دینا غلطی تھا تو اس غلطی کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔ وہ عشقِ نبوت میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں کی بھینٹ ہو گئے حضرت ابوبکرؓ نے بھی تو سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو ختمِ نبوت ﷺ کی خاطر شہید کرایا تھا۔

شاہ جی کی طبیعت ماندہ ہو چکی تھی لیکن بعض لیڈروں کی دغا اور کراچی کے بعض علما کی مخبری سے انھیں اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ شب و روز دورہ کرتے اور مسلمانوں کو بتاتے کہ ختم نبوت کا مسئلہ جوں کا توں ہے اور وہ آخری سانس تک اس کا اعلان کرتے رہیں گے۔

حکومت نے ۱۹۵۵ء میں چھ ماہ کے لیے انھیں اپنے گھر ملتان میں نظر بند کر دیا۔ آزاد ہوئے تو کچھ عرصہ بعد ۱۴۔ اپریل ۱۹۵۶ء کو خانیوال کی ایک تقریر میں پکڑ لیا۔ کوئی پانچ چھ ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ ڈاکٹر خان صاحب صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے، راقم کی استدعا پر انھوں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ میرزائیوں نے اس کے خلاف اندر خانہ احتجاج کیا اسکندر میرزا کے ہاں پہنچے۔ اسکندر میرزا نے شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کی۔ شاہ جی ٹال گئے کہ فقیر بادشاہوں سے نہیں ملا کرتے۔ سید مظفر علی شمسی نے کوشش کی کہ اسکندر میرزا اسپیشل ٹرین میں ملتان سے گزر رہے ہیں وہاں شاہ جی سے میرزا صاحب کی ملاقات ہو جائے لیکن شمسی صاحب کو بھی ٹال دیا کہ میں ان ملاقاتوں کا آدمی نہیں ہوں۔ اسی دن خبر آ گئی کہ ڈاکٹر خان صاحب کو لاہور میں قتل کر دیا گیا ہے۔

اواخر ۱۹۵۶ء میں جسمانی عوارض یکا یک عود کر آئے ایسے چت ہوئے کہ پھر صحت ایک گرتی ہوئی دیوار ہو گئی، کبھی برائے نام صحت کبھی سنگین علالت چار سال یہی عالم رہا۔ ۱۶۔ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا شدید حملہ ہوا جو ۲۱۔ اگست کی شام کو چھ بج کر ۵۵ منٹ پر ملک کے اس عظیم انسان کی وفات پر ختم ہو گیا اور اس طرح تحریک ختم نبوت کا سپہ سالار ۴۲ برس کی لازوال جدوجہد کے بعد اس عارضی کائنات سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

احرار کی تحریکیں

احرار راہ نُما آل انڈیا سیادت کے نہیں آل انڈیا شہرت کے مالک تھے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوا۔ کوئی دس سال بعد مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مشورہ سے مجلسِ احرار اسلام کی بُنیاد رکھی گئی اور یہ نام مولانا آزادؒ ہی کا تجویز کردہ تھا۔ پہلا اجلاس لاہور کانگرس کے موقع پر ۲۹۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اسی کے پنڈال میں ہوا' سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر منتخب ہوئے۔ لیکن ۱۹۳۰ء شروع ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کیا تو احرار راہ نما اس میں شامل ہو گئے اور تنظیم کی تاسیس کا سفر ملتوی ہو گیا۔ پھر جولائی ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون میثاق کے تحت تمام سیاسی قیدی چھوٹ گئے تو احرار راہ نُماؤں نے رہا ہو کر اپنے الگ سفر کی نیو اُٹھائی۔ پہلی احرار کانفرنس اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی ان دنوں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا مسئلہ حقیقتاً دو قومی مسئلہ کا سرآغاز تھا۔ مسلمان جُداگانہ انتخاب چاہتے تھے کانگرس مخلوط انتخاب کی حامی تھی۔ یہ سارا قضیہ نہرو رپورٹ سے پیدا ہُوا تھا۔ احرار نے اس کانفرنس میں نشستوں کے تعین اور جداگانہ انتخاب کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس لحاظ سے کانگرس سے الگ ان کا یہ پہلا سفر تھا۔

احرار کے سامنے کچھ اور واقعات بھی تھے مثلاً:

(۱) مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں بھی کانگرس کا ہندو دین دار مسلمانوں کو ناپسند کرتا تھا انھیں ایسے مسلمان پسند تھے جو ان کے دماغ سے پوچھیں اور مذہب سے بیزار نہیں تو بیگانہ ضرور رہوں۔

(۲) پنجاب میں کانگرس کے عہدے داروں کا چناؤ اسی ذہن سے کیا گیا۔

(۳) کراچی کانگرس (۱۹۳۱ء) کے موقع پر مہاتما گاندھی نے مجلس عاملہ کے ارکان نام زد کرتے وقت چودھری افضل حق کو نظر انداز کیا اور ڈاکٹر عالم کو نام زد فرمایا۔ اگر چہ گاندھی جی کو یہ مشورہ مولانا عبدالقادر قصوری نے دیا تھا جو احرار سے بدظن تھے لیکن اس کا جو نقصان کانگرس کو پہنچا اس کا اظہار پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری ''میری کہانی'' میں کیا ہے۔

(۴) امرت سر اور لدھیانہ میں ضلعی کانگرس کے انتخاب ہوئے تو اس میں احراری زعما کے نام زد اشخاص کو شکست دی گئی حتیٰ کہ امرت سر میں غازی عبدالرحمٰن ہار گئے جنھیں مہاتما گاندھی تحریک خلافت میں لائل پور سے اُٹھا کر ساتھ لے گئے تھے کہ غازی صاحب وہاں ایک سکول میں صدر مدرس تھے۔

(۵) پنجاب میں سیاسی و عمرانی فرقہ پرستی کو اُٹھانے اور اُجالنے میں کانگرس کے ہندو راہ نُما پیش پیش تھے۔

(۶) مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شمول کے لیے لندن جا رہے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بمبئی پہنچ کر ۱۰۔ اگست ۱۹۳۱ء کو ان سے ملاقات کی اور مشورہ دیا کہ وہ ڈاکٹر انصاری کے بغیر نہ جائیں اس طرح کانگرس ہندو جماعت ہو کر رہ جائے گی۔ مہاتما جی نے اِتفاق کیا لیکن گول میز کانفرنس میں چلے گئے۔

اِدھر پنجاب کا ہندو پریس جُداگانہ انتخاب کی بنیاد پر احرار کے خلاف شوشے چھوڑنے لگا۔ اُس کے نزدیک احرار راہ نُما فرقہ پرست ہو گئے تھے حالانکہ مسئلہ صرف انتخاب کا تھا اور یہ ایک اصولی مسئلہ تھا۔ جہاں تک برطانوی استعمار کے خلاف جدو جہد اور غیر ملکی غلامی کے انخلا کا سوال تھا

احرار راہ نُما اب بھی کانگرس کے ہم خیال تھے۔ اگر ہم مذہبوں کا نام لینا یا ان کے مصالح کی نگہداشت کرنا فرقہ پرستی تھی تو اس میں کانگرس کے بلند پایہ راہ نُما حتیٰ کہ گاندھی جی بھی ملوث تھے۔ آخر ہریجن تحریک کیا تھی؟ احرار راہ نُماؤں نے کانگرس میں رہ کر بھی تحریک خلافت کے بعد شُدھی کا مقابلہ کیا۔ چھوت چھات کے مرض پر ہندوؤں کو ملامت کی۔ راجپال کے فتنہ کو سر کیا۔ علم دین کی لاش میاں والی سے لاہور بھجوائی۔ ابن سعود کی حمایت کی۔ غازی امان اللہ کا ساتھ دیا۔ شاردا ایکٹ کی دھجیاں بکھیریں۔ مغل پُورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل وہنکر کی بدگوئی کا محاسبہ کیا۔

ان کا علیحدہ سیاسی سفر اور احرار کے ساتھ اسلام کا لفظ ایسے نہ تھے کہ ہندو پریس آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ اور کانگرس کے صوبائی راہ نُما ان کے خلاف ایکا کر کے نقد و بحث کا دروازہ کھولتے لیکن ہندو نیشلسٹوں نے مسلمان نیشلسٹوں کو ساتھ لے کر احرار کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اُس محاذ کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب احرار نے تحریکِ کشمیر شروع کی۔ احرار نے اپنے علیحدہ سفر (۱۹۳۱ء) سے اختتام پاکستان تک (۱۹۴۷ء) فکر و عمل کی جو تحریکیں چلائیں یا ان میں حصہ لیا وہ یہ تھیں۔

۱۔ مغل پُورہ انجینئرنگ کالج ایجی ٹیشن ۲۔ تحریک کشمیر
۳۔ قادیانی اُمت کا احتساب ۴۔ کپورتھلہ ایجی ٹیشن
۵۔ بہاول پُور ایجی ٹیشن ۶۔ تحریک مدح صحابہ
۷۔ سکھر کی مسجد منزل گاہ کا مسئلہ ۸۔ زلزلہ زدگان کوئٹہ کی امداد
۹۔ دوسری جنگ عظیم میں فوجی بھرتی کا مقاطعہ ۱۰۔ مُسلم لیگ سے اختلاف
۱۱۔ فسادات بہار میں مسلمانوں کی اعانت
۱۲۔ برِ عظیم کی تقسیم کے مرحلے میں خدمتِ عوام۔

''قادیانی جماعت'' کی مزاحمت' احرار کا مستقل مشن ہو گیا اس کی مزاحمت میں اس کے راہ نُما وقتاً فوقتاً پکڑے گئے۔ اس ذہن ہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان بنا تو تحریک ختم نبوت کو وہ جوش و جذبہ حاصل ہوا جس کا اجمالی ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے مجلسِ احرار ہندوستان میں واحد

جماعت تھی جس نے میرزائی اُمّت کے سیاسی عزائم کو بے نقاب کیا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملایا۔ اگر اس وقت احرار میرزائیوں کا محاسبہ نہ کرتے اور ان کی مساعی مشکور سے علامہ اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے الگ نہ ہوتے اور اپنا تاریخی بیان جاری نہ کرتے تو میرزائی پنجاب کی تقدیر پر قابض ہو کر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا رُخ بدل ڈالتے۔ احرار نے مسلمانوں کو نہایت شرح و بسط سے آگاہ کیا کہ میرزائی اس ملک میں برطانوی استعمار کا ففتھ کالم ہیں۔ اور ان کا وجود مسلمانوں کی دینی وحدت توڑ کر عالمی سامراج کے لیے ایک الگ اُمّت پیدا کرنا ہے تا کہ وہ مسلمانوں کے رُوپ میں دنیائے اسلام کو اُلٹ سکیں۔

مُغل پورہ انجینئرنگ کالج

مُغل پُورہ انجینئرنگ کالج کا مسئلہ دو ایک دن ہی میں حل ہو گیا۔ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ اس کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر وہنکر نے حضور ﷺ سے متعلق ایک آدھ توہین آمیز جُملہ کہہ دیا تھا۔ مسلمان طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ معاملہ پبلک میں آ گیا۔ شاہ جی نے موچی دروازہ کے باہر جلسۂ عام کو خطاب کیا۔ ان کی تقریر نمازِ فجر تک جاری رہی۔ سحر کا حال یہ تھا کہ شاہ جی نے اُسی وقت جلسہ کو اٹھا کر مغل پُورہ روانہ کر دیا اور وہاں ہزار ہا لوگوں نے کالج کا محاصرہ کر لیا پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس سے بیسیوں نوجوان زخمی ہو گئے۔ لیکن اسی شام مولانا ظفر علی خان کی مداخلت سے پرنسپل وہنکر نے مُعافی مانگ لی اور اس طرح یہ قضیہ ختم ہو گیا۔

تحریکِ کپُورتھلہ

کپورتھلہ ایجی ٹیشن (۱۹۳۳ء) کسانوں کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی درماندگی کے خلاف ایک اثباتی تحریک تھی جس میں قانون شکنی کا شائبہ تک نہ تھا۔ دیوان سر عبدالحمید ریاست کے وزیر اعظم تھے وہ جالندھر کے تھے اور وہاں بہمہ وُجوہ اپنا رسوخ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اس

تحریک کو اپنی ملازمت کے مفاد میں سبوتاژ کرنا چاہا اور جالندھر میں مسلمانوں کو دو حصوں میں بٹوا دیا لیکن کپورتھلہ ایجی ٹیشن جو بیگووال سے شروع ہوا تھا اس انداز میں ڈھلتا رہا کہ چودھری عبدالعزیز بیگووالیہ جو مجلس احرار اسلام کے نائب صدر تھے اس تحریک کے قائد ہو گئے۔ انھوں نے دیوان صاحب کے ہاتھوں قید و بند کے مصائب سہ کر بھی سپر انداز ہونے سے انکار کیا۔ مہاراجا کپورتھلہ کو چودھری صاحب نے جو عرض داشت پیش کی اس میں ذیل کے مطالبات تھے۔

(۱) مالیات کے محصول کا معیار برطانوی ہند کے مطابق کیا جائے۔

(۲) بیگار یا ملبا وغیرہ قسم کے اقدامات بیک قلم منسوخ کیے جائیں۔

(۳) قانون انتقال اراضیات پنجاب کے اصول پر ریاست میں بھی نافذ کیا جائے۔

(۴) ریاست میں نمایندہ اسمبلی قائم کی جائے۔

(۵) بلاضرورت آسامیوں کو تخفیف میں لا کر ان کی رقم اصلاح دیہات پر صرف کی جائے۔

دیوان عبدالحمید اپنی ملازمت کے لیے مہاراجا کے غلام تھے انھوں نے تحریک کو برباد کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ انھیں معلوم تھا۔

(۱) ریاست میں ۵۷ فی صد مسلمان بستے ہیں۔

(۲) وہ ریاست کا ساٹھ فی صد مالیہ ادا کرتے ہیں۔

(۳) لیکن اس کے باوجود انھیں وظائف و اوقاف میں ۸۴۴۰ روپے سالانہ ملتے اور اس کے برعکس غیر مسلموں کو ۶۸۳۳۸ روپے دیئے جاتے تھے۔

(۴) مندروں اور دھرم شالاؤں کے لیے معافیاں تھیں مگر مساجد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ریاست کا حکمران مہاراجا تھا۔

دیوان صاحب نے تحریک کا رُخ موڑنے کے لیے سلطان پور میں تعزیہ اور بڑ کے

درخت کا روایتی قضیہ پیدا کر دیا' جس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تصادم ہو گیا۔ پولیس نے بیدردانہ گولی چلائی' کئی مسلمان شہید ہو گئے بہت سے زخمی ہوئے اور تقریباً ساڑھے چار سو گرفتار کر لیے گئے۔ ان دیوان صاحب کی بدولت چودھری عبدالعزیز بیگووالیہ پانچ سال قید کیے گئے لیکن مہاراجا کپورتھلہ نے عوام کی برہمی کا انداز کر لیا اور چودھری عبدالعزیز اپیل پر رہا ہو گئے۔ دیوان عبدالحمید کو وزارت عظمیٰ سے چھٹی دے دی گئی، اس سے پہلے کہ ریاست میں مطالبات تسلیم کیے جاتے عوام میں عزت نفس کا احساس اُجاگر ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ اب ان کی حیثیت ڈھور ڈنگر کی نہیں رہی ہے۔

ریاست بہاول پُور

ریاست بہاول پور ایک ''اسلامی ریاست'' تھی لیکن یہاں کے مسلمان عوام کی حالت غایت درجہ ناگفتہ بہ تھی۔ حزب اللہ اور جمعیۃ المسلمین مقامی طور پر جدوجہد کرتے رہے لیکن کاسہ لیس اُمرا کب گوارا کرتے وہ لَاتُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ کی آڑ لے کر مذکورہ جماعتوں کے راہ نُماؤں کی پکڑ دھکڑ کا جواز پیدا کرتے حالانکہ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ تمام ریاستوں کی طرح ریاست بہاول پور کے عوام بھی بیدار ہو گئے اور انھیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس زمانے میں جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا' انسان ہونے کی توہین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاستی عوام بیچارگی اور درماندگی کی شرمناک زندگی گزار رہے تھے، جمعیۃ المسلمین نے آوازِ حق کے نام سے امیر بہاول پور کی خدمت میں استدعا نامہ پیش کیا جس میں ذیل کے مطالبات تھے۔

(۱) بالغ رائے دہی کے اُصول پر ذمہ دار حکومت کا قیام' عوام کے نمایندوں میں سے وُزرا کا چناؤ جو نمایندوں ہی کے سامنے جواب دِہ ہوں۔

(۲) تمام بجٹ اسمبلی میں پیش ہو اور اسمبلی کو اختیار ہو کہ وہ اس میں حک و اضافہ کر سکے۔

(۳) اسمبلی پہلے قوانین بدلنے اور نئے قوانین بنانے کی مجاز ہو۔

(۴) تمام سرکاری محکمے ذمہ دار وُزرا کے ماتحت ہوں۔

غالباً یہی وہ زمانہ تھا جب نواب بہاول پُور نے شاہ جی کو انتہائی راز داری سے اپنے محل میں یاد کیا اور ان سے سیرۃ النبی ﷺ کے موضوع پر تقریر کرائی۔

احرار نے مرکزی طور پر اس ایجی ٹیشن میں حصہ نہ لیا لیکن جو لوگ ریاست کے اندر حزب اللہ اور جمعیۃ المسلمین سے متعلق تھے وہ احرار ہی سے متاثر تھے اور احرار ان کا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آخر بہاول پُور کا انسان جاگ اُٹھا اور عوام کو اس تحریک کی بدولت بال و پَر مل گئے۔

مسجد منزل گاہ سکھر

سندھ کثرتِ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا صوبہ تھا لیکن اس کے بعض بڑے شہروں میں دولت اور آبادی کے لحاظ سے ہندو غالب تھے۔ انھی شہروں میں ایک سکھر بھی تھا۔ ایک لاکھ کی آبادی میں ساٹھ ہزار ہندو تھے۔ دریائے سندھ کے بیچ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس میں ہندوؤں کا ایک مندر سادھ بیلا واقع تھا۔ دریا کے کنارے ہندو آباد تھے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں یہاں فوج کا ایک ڈیرا تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک مسجد منزل گاہ تھی۔ امتدادِ زمانہ سے مسجد معطل ہو گئی۔ انگریزوں نے تالا لگوا دیا۔ اس سناٹے پر ایک طویل زمانہ گزر گیا۔ صوبائی خود مختاری کے بعد اللہ بخش کی وزارت بنی تو اسے کوزچ کرنے کے لیے مسلم لیگیوں نے جو بیسیوں سال سے ادھر کبھی متوجہ نہ ہوئے تھے ایکا ایکی اس کی واگزاری کا ہنگامہ برپا کیا۔ خان بہادر اللہ بخش نے کہا کہ مجھے چھ ہفتے کی مہلت دی جائے تاکہ میں کوئی صحیح فیصلہ کر سکوں اور اگر آپ عدالت میں جائیں تو حکومت زائد المیعاد کے عذر کو مسترد کرتے ہوئے مسلمانوں کے مطالبہ کا ساتھ دے گی لیکن لیگ کے راہ نُماؤں نے بعض خلوتیان راز سے کہا کہ ہم نے اللہ بخش وزارت سے لڑنے کے لیے یہ مسئلہ اُٹھایا ہے ورنہ ہمارا مطمحِ نظر حصول مسجد نہیں ہے۔

سکھر میں مجلس احرار ایک مضبوط جماعت تھی۔ جب لیگ کے بزرجمہروں نے تحریک

شروع کی تو احرار نے شہید گنج کے سے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ہم نوائی کی۔ مقامی طور پر چار سو احرار رضا کاروں کو گرفتار کیا گیا۔ احرار کا مسلک یہ تھا کہ مسجد منزل گاہ کو ہندوؤں سے مفاہمت کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن لیگ کا مشن دوسرا تھا۔ جب اللہ بخش شہید کروا دیئے گئے اور سندھ میں لیگ کا راج قائم ہوا تو منزل گاہ کا مسئلہ اسی طرح لاینحل رہا۔ تاہم احرار کی مساعی سے منزل گاہ واگزار ہو گئی اور دونوں قوموں میں باہمی سمجھوتا ہو گیا۔

خدمتِ خلق

احرار کے نصب العین میں خدمت عامہ کا پروگرام بھی تھا۔ کوئٹہ میں زلزلہ آیا تو احرار نے لاہور میں کیمپ لگا کر اُجڑے پُجڑے لوگوں کی بے نظیر اعانت کی۔ جس کا سرکاری حلقوں میں بھی اعتراف کیا گیا۔ بہار (۱۹۴۶ء) میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہُوا اور وہاں کے غریب مسلمانوں کو پاکستان کی ہول ناک سزا بھگتنا پڑی تو لیگ کے راہ نُما پٹنہ جا کر بھی ان کی مدد نہ کر سکے۔ قتل عام کئی اضلاع میں پھیلا ہوا تھا اور غارت زدگی کے آثار و مظاہر انتہائی لرزہ خیز تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ہدایت پر احرار نے تین قافلے بھیجے۔ پہلا قافلہ غازی مُحمد حسین سالار پنجاب کی قیادت میں، دوسرا امداد کی رقم اور پارچات لے کر راقم تحریر کے ساتھ، تیسرا سید مخدوم شاہ بنوری کے ہم راہ۔ راقم الحروف نے وہاں ڈیڑھ ماہ رہ کر ایک طویل رپورٹ مرتب کی اور دہلی لَوٹ کر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کی۔ اس کی ایک نقل مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب کو دی۔ اُن دنوں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ لاہور میں تھے، انھیں ساری رُوداد عرض کی۔ مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خان کو بہار بھجوانے والے ہمیں لوگ تھے۔ راقم الحروف کو یقین ہے کہ جس خلوص و انہماک اور جوش و استقامت سے بہاری مسلمانوں کی خدمت ہم نے کی وہ ہم جیسے عاجزوں کی بخشش کے لیئے کافی ہے۔

۱۹۴۷ء کا سال پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتوں کے لیے بے رحمی کا سال تھا۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس سے قبل کے چند ماہ قتل و خون کے مہینے تھے۔ دونوں طرف فسادات جوبن پر تھے۔ احرار رضا کاروں نے لاہور، امرت سر اور لدھیانہ میں عوام کی جو خدمت کی وہ بے مثال تھی، لدھیانہ میں ماسٹر تاج الدین انصاری، امرت سر میں شیخ حسام الدین اور لاہور میں راقم الحروف امدادی مہم کے انچارج تھے۔ ہندوؤں کے علاقوں سے مسلمانوں کے بے شمار گھرانوں کو نکال کے ان کی زندگی بچائی گئی۔ ہم نہ جاتے تو سیکڑوں گھر آگ کی نذر ہو جاتے۔ اسی طرح ہندوؤں کو مدد پہنچائی جہاں تہاں ان کی بیٹیاں، مسلمانوں کے نرغہ میں گھری ہوئی تھیں ہم نے انھیں نکالا اور محفوظ مقامات پر پہنچا دیا۔ مسلمان ہمارے شکر گزار تھے لیکن ہندو بھی ممنون تھے۔ ٹریبون اور ''جے ہند'' نے احرار زندہ باد کے عنوان سے اداریے لکھے اور اعتراف کیا کہ احرار کے نوجوان اس اندھیری رات میں انسانیت کی مشعلیں لے کر انسانی زندگی کے خدمت گزار ہیں۔ اس خدمت ہی نے نواب ممدوٹ اور بعض دوسرے لیگی راہ نماؤں کی نگاہ میں احرار کو بالا کیا اور وہ ماضی کی سیاسی آویزش بھول گئے۔

تحریکِ مدحِ صحابہ

تحریکِ مدحِ صحابہ اس طرح شروع ہوئی کہ شاہ جی لکھنو میں تقریر کر رہے تھے اپنی تقریر میں کہیں خلفائے راشدین کا ذکر کیا تو ایک طرف سے آواز آئی۔

''شاہ جی! کیا کر رہے ہیں آپ؟

شاہ جی نے پوچھا۔ کیا ہے بھائی؟

بتایا گیا کہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ ممنوع ہے' یہ تھا مدحِ صحابہ کے قضیہ میں احرار کا شمول۔

معلوم ہوا کہ ۱۹۰۴ء تک لکھنؤ میں شیعہ سنی قضیہ نہ تھا مگر اس سال ایک شیعہ مقبول احمد نے فتنہ جگایا نتیجۃً دو کربلائیں ہو گئیں۔ شیعہ کربلا کا نام تال کٹورا تھا۔ سنیوں نے اپنی کربلا کا نام پھول کٹورا رکھا۔ چوں کہ سنیوں کا غلبہ تھا اس لیے ان کے جلوسوں کی رونق سوا ہو گئی۔ ہندو بھی

اپنا تعزیہ لے کر اُن کے ساتھ مل گئے۔ یہ ۱۹۰۶ء میں شروع ہوا ۱۹۰۸ء میں شیعوں نے گورنر یوپی سے شکایت کی کہ سُنیوں کا جلوس روکا جائے اور خلفائے راشدین کی مدح نہ ہو کیوں کہ اس طرح ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ گورنر نے اس کی تحقیقات وسفارت کے لیے ایک آئی سی ایس مسٹر پگٹ کی صدارت میں کمشن بنا دیا۔ جس کے ارکان میں دو ہندو، دو سنی اور دو شیعہ تھے۔ اس کمشن کی رپورٹ پر یوپی گورنمنٹ نے اس ترمیم کا اضافہ کیا کہ کسی بھی پبلک مقام پر ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کی مدح زیر دفعہ ۲۹۸ قابلِ مواخذہ ہے۔ اس پابندی کے بعد شیعہ وسنی ایک ہی قوم کے دو متحارب فریق ہو گئے۔ کوئی ۲۸ برس بعد (۱۹۳۶ء) اس باب میں مسٹر اے ٹی نقوی جو لکھنؤ میں سٹی مجسٹریٹ تھے اپنے شیعہ عقائد کی وجہ سے سنیوں کی دل آزاری کا باعث ہوئے۔ اُنھوں نے میلاد النبی کا جلوس نکالنے اور اس میں مدحِ صحابہ پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ واضح رہے کہ یہی سٹی مجسٹریٹ پاکستان آ کر کراچی کے چیف کمشنر ہو گئے۔۔۔۔ ان کی بدولت لکھنؤ میں پہلی دفعہ جن تین صاحبوں کو مدح صحابہ کے جُرم میں پکڑا گیا وہ مجلسِ احرار کے کارکن تھے۔ ان کی گرفتاری سے عوام مشتعل ہو گئے اور سول نافرمانی شروع ہو گئی۔

۱۳۔ اپریل ۱۹۳۷ء کو یوپی گورنمنٹ نے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس العپ کی صدارت میں اس قضیہ کا حل تلاش کرنے کے لیے کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی نے ۱۵۔ جون ۱۹۳۸ء کو اپنی رپورٹ میں سنیوں کے حق مدح صحابہ کو تسلیم کیا لیکن معاملہ عملاً جوں کا توں رہا۔

مولانا حسین احمد مدنی نے مداخلت کی اور یوپی گورنمنٹ کو احوال وکوائف کے علاوہ نتائج وآثار سے مطلع کیا۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ لکھنؤ میں ۸۰ ہزار سنی اور ۲۰ ہزار شیعہ رہتے تھے۔ شیعوں کے سال بھر میں ۱۴۴ جلوس نکلتے لیکن سنیوں کو ایک جلوس بھی نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ مقامی احرار نے میلاد النبی ﷺ پر جلسہ کرنا چاہا لیکن پولیس نے مدحِ صحابہ کے خدشہ سے رکوا دیا اور یوپی کے بعض احرار زعما پکڑ لیے۔ اس شرارت کا سرغنہ وہی ابوطالب نقوی تھا جس نے مدح صحابہ کے جرم میں کئی ہزار مسلمانوں کو جیل میں ڈلوا دیا۔ احرار راہ نماؤں میں مولانا اظہر علی

شیعہ تھے، انھوں نے تحریکِ مدح صحابہ کے نام پر ایک کتاب لکھی اور سارا مسئلہ بیان کیا کہ کس قسم کے لوگ استعمار کو تقویت پہنچانے کے لیے مدح صحابہ کر رہے اور ان کے عزائم کیا ہیں؟

شاہ جی نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چیز تو سمجھ میں آتی ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فُلاں کی مدح نہ کی جائے۔ اس قسم کا انوکھا قانون لکھنؤ ہی میں ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقوں میں سے اقلیت کا فرقہ اکثریت سے مطالبہ کرتا اور قانون کی آڑ لیتا ہے کہ وہ قرنِ اول کے اسلام کی اُن شخصیتوں کا نام نہ لیں اور نہ اُن کی منقبت سنیں جو مدینہ طیبہ میں رسول اللہ کے پہلو میں سو رہے ہیں۔ مظہر علی نے کہا اگر ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ کے نام گردن زدنی ہوتے تو علی مرتضیٰ اپنے بیٹوں میں سے تین کے نام ان کے نام پر نہ رکھتے۔ یہ شیعوں کی زیادتی ہے کہ وہ کربلا کے شہدا میں ان کا نام نہیں لیتے حالانکہ ۷۲ کے قافلہ میں یہ تینوں بھائی کربلا ہی میں شہید ہوئے تھے۔

آواز آئی ''مظہر علی شیعہ ہو کر کیا کہہ رہے ہو؟''

جواب دیا ''وہی کہہ رہا ہوں جو حق ہے میرے پاس مولا علیؓ کی سند ہے''۔

تحریکِ کشمیر

احرار کے عظیم کارناموں میں سے تحریکِ کشمیر (اکتوبر ۱۹۳۱ء) کو فوقیت حاصل ہے جماعت احرار کے باب میں اس کا ذکر آ چکا ہے۔ مزید برآں کہ یہ تحریک ریاستی استبداد کے خلاف عوامی احتجاج تھا سوال ہندو یا مسلمان نواب یا مہاراجا کا نہیں تھا، مسئلہ یہ تھا کہ ریاستیں ہندوستان میں دہری غلامی کا جہنم تھیں۔ کشمیر کا مسلمان غایت درجہ ستایا ہوا تھا۔ مہاراجا ہری سنگھ کے ڈوگرے مسلمانوں کو انسان ہی نہ سمجھتے تھے۔ گائے ذبح کرنے کی سزا عمر قید تھی، احرار نے اس تحریک کی عنان ہاتھ میں لی تو اس کے کئی وجوہ تھے لیکن کشمیری مسلمانوں کی مظلومی کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میرزائی برطانوی استعمار کے آلۂ کار کی حیثیت سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنا کر ایک

چہار پہلو ناٹک رچا بیٹھے تھے۔

اولاً: وہ ریاست میں اپنا رُسوخ و اقتدار چاہتے تھے جو کشمیر کو مرزائی ریاست بنانے کے خواب کی تعبیر تھی۔

ثانیاً: کشمیری مسلمانوں کی ہم دردی کے نام پر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں رسائی کے خواہاں تھے۔

ثالثاً: انگریزوں نے اپنے مقاصد مشئومہ کی تکمیل کے لیے انھیں ایک آلۂ کار کی حیثیت سے اس راستہ پر لگایا تھا۔

رابعاً: برطانیہ جب تک ہندوستان میں رہا اس نے روس سے خطرہ محسوس کیا۔ روس کے اس خطرے کا جائزہ لینے کے لیے اس نے بعض مسلمان فضلا کو بھی جاسوسی پر مامور کیا۔ مثلاً پچھلے ہی دنوں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے نواسے نے اپنے نانا کی انھی خدمات کا انکشاف کیا تھا۔ قادیان کے خلیفہ اول حکیم نور الدین مہاراجا پرتاب سنگھ کے طبیب تھے۔ انگریزوں نے مہاراجا پر الزام لگایا کہ وہ برطانیہ کے خلاف رُوسی حکومت سے خفیہ خط و کتابت کرتا ہے حکیم صاحب متعدد سالوں تک مہاراجا کی جاسوسی کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مہاراجا نے انھیں ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء میں مشکوک قرار دے کر نکال دیا۔

اس ضمن میں ایک قادیانی مبلّغ محمد امین کا بیان جو ۲۸۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کے الفضل میں طبع ہوا۔ توجہ طلب ہے وہ لکھتا ہے کہ:

”اگرچہ میں روس میں تبلیغ احمدیت کے لیے گیا تھا لیکن سلسلہ احمدیہ اور برٹش گورنمنٹ کا مفاد چوں کہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس لیے جہاں میں تبلیغ کرتا لازماً مجھے گورنمنٹ انگریزی کی خدمت گزاری بھی کرنا پڑتی“۔

اس پس منظر میں کشمیر کمیٹی کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ ۲۵۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو اس کی بنیاد رکھی گئی میرزا بشیر الدین محمود، علاّمہ اقبالؒ کو ساتھ ملا کر اس کے صدر ہو گئے۔ احرار نے

علاّمہ اقبال کو حقائق کے مطالعہ کی دعوت دی۔ آخر کار علاّمہ انور شاہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق کی تحریک پر حضرت علامہ کشمیر کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔

احرار نے تحریک کشمیر میں پچاس ہزار مسلمان قید کرائے، ان کی اس تحریک کو ہندو کیا سمجھتے کہ مہاراجا ہندو تھا اور ہندو من حیث الجماعت کوتاہ نظر اور تنگ دل تھے لیکن مُسلمان اُمرا اس وقت تک تحریک کا ساتھ دیتے رہے جب تک مہاراجا ہری سنگھ سے مقابلہ تھا۔ جوں ہی احرار نے کانٹا بدلا یعنی انگریزی سیاست کا زہر توڑنے کے لیے صوبہ میں بدیسی کپڑے اور شراب پر پکٹنگ شروع کی تو انگریزوں سے براہِ راست تصادم ہوتے ہی اُمرا کا گروہ بھاگ گیا۔ مہاراجا بے بس ہو گیا لیکن انگریز بھی چھٹکارا چاہتے تھے۔ انھوں نے مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو بیچ میں ڈالا کہ احرار سے صلح کرا دیں۔ معاملہ طے ہو رہا تھا کہ سرکاری مسلمانوں نے پیچ کاٹ ڈالا کہ اس طرح آپ پنجاب کی سیادت ان لوگوں کو دیں گے جو طبعاً انگریزوں کے خلاف ہیں۔ کچھ دیر توقف کیجیے۔ احرار کی تحریک ختم کرنا ہمارا ذمہ ہے۔ وہی ہوا میرزا بشیر الدین محمود نے شیخ عبداللہ اور ان کے نوجوان رفقا کو مغالطہ دے کر اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس طرح کشمیر میں ان کی معرفت احرار کی مخالفت شروع ہو گئی۔ پنجاب میں مُسلمانوں کے سرکاری امرا پہلے سے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ تحریک کا چراغ ٹھنڈا ہو گیا لیکن کشمیر میں تحریک آزادی کو نشو ونما حاصل ہوئی۔ گلانسی کمشن بیٹھا جس نے کشمیر میں ذمہ دار حکومت کے قیام کو تسلیم کیا اور سب سے بڑی چیز جو اس تحریک کی معرفت احرار کو حاصل ہوئی وہ کشمیر میں میرزائیوں کے منصوبے کی ناکامی تھی اور علامہ اقبالؒ کے مطالعہ کا یہ حاصل تھا کہ میرزائیت یہودیت کا چربہ ہے اور مسلمانوں سے الگ ایک دوسری اُمت ہے۔

دُوسری جنگِ عظیم

دوسری جنگِ عظیم تین ستمبر کو چھڑی، احرار نے اس سے اگلے روز امرت سر میں ورکنگ کمیٹی بلا کر ہندوستان کی آزادی اور افریشیا سے انگریزوں کے نکل جانے کا مُطالبہ کر دیا اور اعلان کیا کہ جب تک برطانوی حکومت یہ اعلان نہیں کرتی وہ نہ صرف حکومت سے تعاون نہیں کرے گی بلکہ فوجی بھرتی کی مخالفت کرے گی اور اس غرض سے وہ ایک ہمہ گیر تحریک کا آغاز کرتی ہے۔ شیخ حسام الدین کو صدر اور راقم الحروف کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ واضح رہے کہ احرار سال بھر سے آرمی ایکٹ کی مخالفت کر رہے تھے۔ شاہ جی کے خلاف ۱۲۴۔ الف، ۱۲۱۔ الف اور ۳۰۲/۱۱۷ کے مقدمات دائر کیے گئے۔ اور وہ گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن ۱۲۴۔ الف میں ماخوذ تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر راول پنڈی کی ایک تقریر میں پکڑے گئے اور جیل میں تھے۔ احرار کے اس اِقدام کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ:

(۱) انھوں نے حکومت کے خلاف ملک کی تمام سیاسی جماعتوں سے کہیں پہلے مقاطعۂ جنگ کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کے ساتھ ہی اپنی تحریک کا آغاز کر دیا۔

(۲) ملک میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ ہو گیا تو ہندوستان بھر میں پہلی گرفتاری راقم الحروف کی ہوئی۔

(۳) پنجاب سوشلسٹ پارٹی نے احرار کے ساتھ مل کر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے منشی احمد دین لاہور تشریف لائے لیکن پنجاب میں وہ جماعتی اعتبار سے کم زور تھے۔

(۴) اس تحریک میں قید ہونے والے احرار کی صوبہ وار تعداد یہ تھی۔

پنجاب: تین ہزار کارکن قید، ۴۵ لیڈر نظر بند

سرحد: ایک ہزار کارکن قید، ۱۰ لیڈر نظر بند

یُو پی: ایک ہزار کارکن قید

بنگال: پانچ سو احرار رضا کار قید

بمبئی: ایک ہزار احرار قید

بہار: ایک ہزار کارکن قید

(۵) احرار نے جو پالیسی ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اختیار کی' کانگرس نے وہی پالیسی ۱۵۔ اگست ۱۹۴۲ء کو ہندوستان چھوڑ دو کے نعرے سے شروع کی۔

(۶) احرار پر جیلوں میں بے پناہ سختی کی گئی۔ چند ایک زعما کو چھوڑ کر باقی سب سی کلاس میں رکھے گئے۔

(۷) بعض مجسٹریٹوں نے کئی کارکنوں کے فیصلے میں لکھا کہ احرار سیاسی قیدی نہیں ان سے اخلاقی قیدیوں کا سلوک کیا جائے۔

(۸) رائے بہادر مہر چند کھنہ ایک زمانہ میں سرحد کی مہاسبھا کے صدر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کانگرس میں شامل ہو گئے اور سرحد کی خان وزارت میں وزیر لیے گئے۔ اُنھوں نے گاندھی جی کو خط لکھا کہ احرار کلہاڑی رکھتے ہیں کیا ہم انھیں ستیہ گرہی مانیں؟ مہاتما گاندھی نے جواب دیا' کلہاڑی تشدّد کا نشان ہے اور وہ ستیہ گرہی نہیں ہیں۔

(۹) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا داؤد غزنوی اپنے طور پر کوشاں تھے کہ مہاتما گاندھی احرار پر حکومت کے بے دریغ مظالم کی مذمت کریں۔ اس غرض سے انھوں نے کانگرس میں احرار کے شمول کا مشورہ بھی قبول کر لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی واردھا سے پنجاب واپس آتے برطانوی سرکار نے پکڑ کے انھیں منٹگمری سنٹرل جیل میں نظر بند کر دیا۔ مولانا داؤد غزنوی کانگرس میں چلے گئے لیکن فوراً ہی دھر لیے گئے۔ یہ ۱۹۴۲ء کے وسط کا زمانہ تھا۔ شاہ جی رہا ہو کر تبلیغ میں سیاست لڑاتے رہے اور قرآن و تفسیر میں انھیں پکڑنا مشکل تھا۔ شیخ حسام الدین رہا ہو کر زبان بند تھے۔ چودھری افضل حق کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہو گیا۔ مولانا مظہر علی اظہر قائد احرار ہو گئے لیکن ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کے دنوں میں جماعت کا اجلاس

سہارن پور میں بلا کر ایک طویل قرارداد پاس کی کہ احرار اس مرحلہ میں حکومت کے خلاف اپنی تحریک ختم کرتے ہیں۔ لیگ کے جواب میں ''حکومت الٰہیہ'' کا مطالبہ اٹھا دیا۔

جہاں تک احرار کی تحریک کا تعلق تھا اپنے اثرات پیدا کر چکی تھی اور اس کے سیکڑوں کارکن اب بھی جیل میں تھے۔ سب سے بڑی سزا (پانچ سال قید) راقم بھگت رہا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی طویل عرصہ سے دھرم سالہ جیل میں نظر بند تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر کا حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد منظور کرانا اور اس طرح تحریک ختم کرانا اُصولاً اور معناً غلط تھا۔ رہا حکومتِ الٰہیہ کا معاملہ تو وہ سب کچھ ہوگا لیکن پاکستان کا جواب نہ تھا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگرس احرار سے پہلے ہی بدظن تھی اور بدظن ہوگئی۔ لیگ راضی نہ تھی اور اُس کا اس طرح راضی ہونا ناممکن تھا۔

لیگ اور احرار

لیگ اور احرار کے فاصلوں کا تجزیہ جماعت احرار کے باب میں آچکا ہے' نظری طور پر اختلاف یہ تھا کہ لیگ کے نزدیک ہندوستان کی ۹ کروڑ مسلمان اقلیت کے مسئلے کا حل پاکستان تھا، احرار کو اس سے سیاسی اختلاف تھا ان کے نزدیک یہ حل ہی نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس طرح ۳۵ فی صد مسلمان جو ہندوستان میں رہ جائیں گے ایک طاقت ور ہندو ذہن کا شکار ہوں گے اور جو مسلمان پاکستان میں ہوں گے یا پاکستان میں آئیں گے انھیں بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین ہندوستان ہوگا کب تک دونوں حصے ایک حکومت کے تحت رہ سکیں گے' ضرور جدا ہوں گے قائداعظم کے بعد پاکستان میں لیگ کی صفوں میں سے کسی فعال لیڈر شپ کا ملنا اور اُٹھنا محال ہے۔ ملک جذبات سے کہیں زیادہ حقائق پر چلتے ہیں جو مسئلہ آج لیگ اور کانگرس کا ہے وہ کل ہندوستان اور پاکستان کا ہو جائے گا۔ عجب نہیں دونوں ملک بین الاقوامی طاقتوں کا مہرہ بن جائیں اور ان کی باہمی چپقلش سے دونوں مملکتوں کے سر پہ ہر لحظہ جنگ کا خوف مسلط ہو۔

احرار اپنے طبقاتی مزاج کے مطابق ملک کی سیاست کو مسلمانوں کے طبقۂ اُمرا کی سیاست قرار دیتے اور گفتنی و ناگفتنی سب کہہ جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے کہیں انسب دولت کی تقسیم ہے۔ اس غرض سے وہ ہندوستان کے دو ٹکڑے نہیں کئی ٹکڑے کر دینے کے حق میں تھے لیکن اسلام کا نام لے کر کسی ٹکڑے میں کسی یزید جیسے مسلمان کے لیے تختِ سلطنت بچھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کے نزدیک ایسا سوچنا یا کرنا اسلام سے غداری کے ہم معنی تھا۔ چودھری افضل حق نے احرار کو ۱۹۴۱ء میں مشورہ دیا تھا پاکستان کے نعرے کی مخالفت نہ کرنا یہ دکھی دلوں کی آواز ہے اگر مخالفت کی تو جان لیوا قسم کی ایک اور شہید گنج آ گرے گی۔ احرار نے عمل نہ کیا اور کیے دھرے کی سزا پائی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے متحدہ ہندوستان کے آخری انتخابات (۱۹۴۶ء) میں حصہ لے کر احرار کی شہ رگ کٹوا دی۔ مولانا مظہر علی حدودِ اختلاف سے تجاوز نہ کرتے اور اپنی جنگ کو محض سیاسی رہنے دیتے تو احرار اپنے اختلاف کے باوجود لیگ کے بعد پاکستان کی دوسری بڑی جماعت ہوتے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دوسری جنگِ عظیم تک احرار کے صدر رہے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ کانگرس کے قریب تھے ان کے امام و پیشوا مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے اس کے برعکس مولانا مظہر علی اظہر احرار میں کانگرس کے سب سے بڑے مخالف تھے لیکن قائداعظم کو جلسہء عام میں کافرِ اعظم کہہ کر اور ان کی اہلیہ کے متعلق نکاح سے محرومی کا فرضی الزام لگا کر انھوں نے احرار کو مصیبت میں ڈال دیا۔ مظہر علی کے اس الزام اور تبرا سے کوئی خوش نہ تھا۔ شاہ جی نے سری نگر سے واپس آتے ہی مظہر علی کو مطعون کیا کہ ایک عفیفہ عورت کے متعلق انھوں نے یہ شوشہ کیوں چھوڑا؟ اور ساتھ ہی بھری مجلس میں فرمایا کہ مظہر علی تم ہار گئے ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقسیم کے بعد دہلی میں آباد ہو گئے اور وہیں مَر کے دفن ہوئے۔ ان کے صاحب زادے مولوی عزیز الرحمٰن نے جنوری ۱۹۶۱ء میں والد کے سوانح حیات شائع کیے اور کانگرس ہی کے ذہن کو ملحوظ رکھا۔ لیکن ان سوانح کے مشمولہ خطوط میں ایک خط پنڈت

جواہر لال نہرو کے نام ہے۔ یہ خط مولانا نے ۲۔فروری ۱۹۳۷ء کو تحریر کیا اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ درج ہے کہ:

''آپ کی ایک تقریر کا خلاصہ جو آپ نے بمبئی میں مسٹر جناح کے خلاف کی ہے میری نظر سے گزرا۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان اخباروں نے آپ کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ ہمیں خود مسٹر جناح سے بیسیوں باتوں میں سخت اختلاف ہے لیکن ان کا ہندوستان میں کوئی مخالف ہو یا موافق؟ ہر شخص انھیں دیانت دار سمجھتا ہے۔ گورنمنٹ مسٹر جناح کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی۔ مرکزی اسمبلی میں کانگرس کی کامیابی مسٹر جناح کی رفاقت پر مبنی رہی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

نہرو رپورٹ میں ہمیں کیوں ناکامی ہوئی صرف اس لیے کہ کلکتہ کنونشن میں مسٹر جناح سے نازیبا سلوک کیا گیا۔ آپ آج اسی تاریخ کو پھر دُہرا رہے ہیں؟ مسٹر جناح سے بہتر آدمی ملنا محال ہے' انھیں کو قریب لانے کی کوشش کیجیے''۔

احرار کی جدوجہد سے ملک وقوم کو جو کچھ ملا وہ تجزیہ کی ابتدائی بحث میں آچکا ہے فی الجملہ احرار برِعظیم کے پاکستانی علاقے کی سیاسی بیداری کا نصف اول تھے' ان کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو ملک کا سیاسی نقشہ مختلف ہوتا۔ لیکن تاریخ انسانی کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ بونے والوں' کاٹنے والوں اور پانے والوں کے سلسلے مختلف ہوتے ہیں۔ احرار اقتدار سے محروم رہے لیکن تاریخ کا شرف ان کے ساتھ ہے۔ اس شرف کے تعین کا فیصلہ مُستقبل کا مؤرخ کرے گا کیوں کہ آج جن لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے وہ مُنصِف انہیں غاصب ہیں اُنہیں افسانوی رغبت نے ڈھلی ڈھلائی حکایتوں کے اُلٹ پھیر کا عادی بنادیا ہے۔[1]

---

[1] تحریکیں پیدا ہوتی پھر اپنی طبعی عمر گزار کر ختم ہو جاتی ہیں۔ قریب قریب یہی معاملہ ان جماعتوں کا ہے جو ان تحریکوں کی داعی ہو کر عوام کی راہنمائی کرتی ہیں۔ بے شک دنیا میں مختلف الاصل اصولوں کی حکمرانی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُصولوں سے کہیں زیادہ اس کائنات کو انسانوں نے ہلایا ہے اور وہی انسان اس دُنیا کو ہلاتے رہے ہیں جو مختلف العنوان اُصولوں کے مظہر تھے۔

برِ عظیم پاکستان و ہندوستان میں سب سے بڑی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگرس تھی کہ حصول آزادی تک اس کی قیادت بعض دوسری عظیم شخصیتوں کے باوجود مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں رہی۔ گو ان کے جانشین کم پایہ لوگ نہ تھے لیکن آزادی کے بعد تنظیم مدّھم پڑ گئی۔ اور ذہن باقی رہ گیا، جو اندرا گاندھی تک موجود ہے۔ مسلم لیگ برعظیم کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہو گئی لیکن اپنی عظمت کے باوجود وہ اول و آخر قائد اعظمؒ کی سیادت کا نام تھا۔ قائد کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

اتفاقات کہ لیجیے یا کچھ اَور کہ ان دو بڑی تنظیموں کے علاوہ چھوٹے پیمانہ پر جو تنظیمیں ہندوستان و پاکستان یا ان کے کسی صوبہ میں قائم تھیں، وہ اپنا سیاسی کردار ختم کرتے ہی متروک ہو گئیں۔ پھر جب ان کی لیڈر شپ رحلت کر گئی تو ہر تحریک یا تنظیم کی باقیات کو اس کے راہنماؤں کی اولاد نے میراث بنا لیا۔

سوال صحیح یا غلط کا نہیں؟ امر واقعہ کا ہے۔

اس پاکستان میں خاکسار تحریک علامہ مشرقی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے کی سیادت میں آ گئی لیکن بہمہ وجوہ وہ دست بردار ہو گئے۔ بالفاظ دیگر بھاری پتھر تھا اُٹھ نہ سکا، چُوم کے چھوڑ دیا۔ خدائی خدمت گار تنظیم، پختون زلمے کے نام سے خان عبدالغفار خان کے فرزند خان عبدالولی خان کو منتقل ہو گئی کہ ان کے والد جس ملک کے لیے آزادی کی طویل جدّ و جہد کرتے رہے اُس ملک میں ان کا رہنا اجیرن ہو گیا اور وہ بڑھاپے میں افغانستان چلے گئے اور اب کئی سال بعد آخری عمر میں لوٹ آئے ہیں۔

مجلسِ احرار اسلام حقیقتاً چند استعمار دُشمن اور ہم خیال دوستوں کا مجموعہ تھی۔ اس کا دماغ افضل حق، اس کی زبان سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اس کا دل حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور اس کی آنکھ مظہر علی تھے۔ چودھری صاحب ۱۹۴۲ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی اولاد نے سیاستِ احرار کا پنڈ چھوڑ دیا۔ مظہر علی کے بیٹے بھی افضل حق کے بیٹوں کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے

لیکن وہ سیاست کی دوسری راہوں پر آ گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن چوں کہ ہندوستان میں آباد ہو گئے لہٰذا ان کے فرزند اپنے سیاسی مذاق کی بدولت بھارت میں رہنے لگے۔ ان کے ایک فرزند مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنے والد مرحوم کے سوانح حیات لکھے ہیں لیکن ان کا استدلال ہندوستان کی آب و ہوا کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں وہ احرارِ اسلام کے نہیں اپنے والد کے نمائندہ ہیں اور اسلام کا لفظ پاکستان کے احرار کی نذر کر دیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے فرزند سید ابوذر بخاری آج کل مجلسِ احرار کے ناظم اعلیٰ (جنرل سیکرٹری) ہیں انھوں نے احرار راہ نُماؤں کی تحریریں اور جماعت کی تاریخ کے گم شُدہ اجزا جمع کر کے شائع کیے ہیں لیکن ہر کتاب کے ابتدائیے اکثر تاریخ کی ترازو سے نکل گئے ہیں۔ جس سے کئی چیزیں ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب اثاثہ کی بنیاد میراث پر ہو تو قدرتاً بعض چیزیں یک طرفہ ہو جاتی ہیں۔ بہر حال ان عزیزوں کے مواد سے راقم نے معتد بہ فائدہ اُٹھایا ہے لیکن ان کے استدلال سے اپنی راہ الگ نکالی ہے اور ان کے لہجے سے بھی اجتناب کیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ان جلیل القدر فرزندوں کے علاوہ احرار کے ایک آدھ کارکن نے شاہ جی کے سوانح مرتب کیے اور خطبات جمع فرمائے ہیں۔ لیکن جن صاحب نے سوانح لکھے ہیں وہ لکھنا جانتے ہی نہیں جو کچھ ان کے نام سے لکھا گیا وہ اس کے پڑھنے سے بھی معذور ہیں۔ اس سوانح عمری کا تین چوتھائی الفاظ و مطالب کا کوڑا کرکٹ ہے۔ ایسا ہی مذاق خطباتِ امیرِ شریعت میں ہے۔ مرتب نے ثریا کو ثریٰ میں ڈال دیا ہے۔

احرار کی تحریکیں اصلاً اس کتاب کا حصہ نہیں اُن کی تاریخ اور تجزیہ ایک علیحدہ کتاب کا مضمون ہیں۔ چوں کہ شاہ جی نصف احرار تھے اور کوئی سی جماعتی تحریک ان کے بغیر متحرک نہ ہوتی اس لیے زیرِ نگاہ باب مندرجہ بالا عنوان کے تحت مختصراً قلم بند کیا ہے (مؤلف)

چند یادیں

شاہ جی کو دیکھا تو بچپن میں تھا۔ راقم اُس وقت پانچویں یا چھٹی میں پڑھتا تھا' ۱۹۲۹ء کا سال تھا سائمن کمشن کے ورود پر ملک کی سیاسی فضا میں جوش و خروش تھا۔ ہر جگہ کمشن کا استقبال اختلافی واحتجاجی مظاہروں سے ہو رہا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی بائیکاٹ کی تحریک کے مددگار تھے۔ لاہور میں سر میاں محمد شفیع انگریزوں سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کے باعث اپنے حلقۂ یاران کو لے کر حکومت کے طرف دار تھے ورنہ تمام شہر کمشن کے مقاطعہ پر متفق تھا۔

کمشن لاہور پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر زبردست مظاہرہ ہُوا۔ لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر ستیہ پال، مولانا ظفر علی خان، چودھری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ اس مظاہرے کے راہ نُما تھے۔ اتنا بڑا جلوس تھا کہ اسٹیشن کی سڑکوں پر پولیس نے کانٹے دار تار لگوا کر راستے روک دیئے تھے اور پولیس کی زبردست جمعیتیں لیس کانٹا ہو کر بزن کے لیے کھڑی تھیں۔ تب جیپیں اور کاریں نہ تھیں۔ ایک نامی سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس گھوڑے پر سوار تھا اس نے بزن کیا تو اس کی ہندو

مسلمان اور سکھ ذریت عوام پر ٹوٹ پڑی۔ اُس زمانہ میں پولیس اور ظلم ہم معنی الفاظ تھے۔

لالہ لاجپت رائے لاٹھی چارج سے شدید زخمی ہوئے۔ اُسی رات موری دروازہ کے باغ میں جلسۂ عام تھا۔ شاہ جی نے اس جلسہ میں اس غضب کی تقریر کی کہ مجمع کچھ سے کچھ ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا ملک پر اس جلسہ کی حکومت ہے۔ شاہ جی کی یہ پہلی تقریر تھی جو راقم نے سنی تب شعور تو کچھ زیادہ نہ تھا بس ایک احساس تھا کہ اس ملک پر انگریزوں کو حکمرانی کا کوئی حق نہیں وہ یہاں ایک غاصب کی حیثیت سے قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اس وقت یہ تمیز نہ تھی کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون؟ بس ایک جذبہ حریت تھا کہ عوام اس سے معمور تھے۔

شاہ جی کو ہندو نوجوان ڈنڈے والا پیر کہتے' جلسہ ختم ہو گیا تو ہر زبان پر تھا کہ ڈنڈے والے پیر نے جادو کر دیا ہے۔ ہمارے ایک دوست پون کمار جو ایک آئی سی ایس کے صاحب زادے تھے اور اُردو ادب سے انھیں یک گونہ تعلق خاطر تھا۔ جلسہ گاہ سے لوٹتے وقت یہی کہتے رہے کہ شاہ جی ویدوں اور اپنشدوں کے زمانے کے رشی ہیں۔ اُن کی شکل والمیک رشی کی لاہور کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی تصویر سے مشابہ ہے۔ آواز میں اُن کی گنگا کی پوترتا اور جمنا کی سندرتا ہے۔

دوسری دفعہ شاہ جی کو میکلیگن کالج کے طلبہ کی سٹرائیک سے متعلق منعقدہ جلسہ میں دیکھا' موچی دروازہ کے باغ میں جلسۂ عام تھا ہزار ہا مسلمان جمع تھے۔ شاہ جی نے کوئی چھے گھنٹے تقریر کی اور تین چوتھائی جلسہ اٹھا کر کالج کی طرف بھجوا دیا اور رات پو پھٹنے سے پہلے نعروں سے شق ہو گئی۔ راقم اس جلسہ میں ایک طرف کنارہ پہ کھڑا تھا۔ اور تاثر یہ تھا کاش اس شخص سے مصافحہ کر سکوں اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دوں۔ قدرت نے یہ دُعا اس طرح قبول کی کہ آٹھ سال بعد زندگی کا ایک ایسا سفر شروع ہوا کہ جس قافلہ کے شاہ جی امیر تھے راقم اس قافلہ کے گنے چنے رفقا میں تھا اور ان سے جسم و جان کا سا تعلق پیدا ہو چکا تھا پھر ان کے ساتھ دُور دراز کے سفر کیے۔ کئی کئی مہینوں کی شبانہ روز صحبتوں سے فیض اُٹھایا' خلوت و جلوت کا مطالعہ کیا۔ ظاہر و باطن کی ایک پوری زندگی کا مشاہدہ ہو گیا۔ کوئی شخص کسی کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسے کو پا لیا ہے یا

میں اس کے وجود سے متعلق حرف آخر کہہ سکتا ہوں لیکن بہرحال انسان جتنا پیچیدہ ہے اُتنا ہی سہل ہے۔وہ کھلی کتاب کی طرح سمجھ میں آتا ہے۔۔۔۔شاہ جی کے ساتھ راقم نے ملک کے بہترین اور بدترین دن گزارے ہیں اور یہ دن سال ہا سال کی یک جائی رکھتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ راقم کے مشاہدہ و تجربے میں بہت سی شخصیتوں کا سونا۔۔۔ملمع سے بھی کم تر قیمت کی دھات نکلا۔لیکن جن شخصیتوں نے راقم کے افکار و سوانح کا رخ بدل ڈالا ان میں شاہ جی ایک ایسی شخصیت تھے کہ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرنِ اول میں ہوتے تو عشرہ مبشرہ میں ہوتے۔راقم نے اُنھیں ہر لحاظ سے ایک سچا اور کھرا انسان پایا وہ اس عہد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ غیبت کیا ہوتی ہے؟ اور جھوٹ بول کر زندگی کیوں کر بسر کی جاتی ہے' یہ بات پہلے بھی کہیں آ چکی ہے کہ وہ دو گروہوں کے دشمن تھے۔اولاً انگریزی حکومت اور اُس کے خوشہ چینوں کے دوم میرزائی نبوت اور اُس کے اعضاو جوارح کے۔لیکن ان کے متعلق بھی کبھی کسی افترا و کذب کے مرتکب نہ ہوتے جو بات حقیقت ثابتہ ہوتی وہی بیان کرتے۔کئی لوگ جن سے قومی گناہ سرزد نہ ہوئے تھے لیکن ان کے خیالات دوسرے تھے۔وہ ان کے ذاتی دوست تھے۔کوئی رفیقِ سفر اُن کے متعلق سخت سُست کہتا تو سختی سے روک دیتے۔بھائی! جانے دو' وہ میرا دوست ہے۔ان کی یہ عادت نقص کی حد تک چلی گئی تھی کہ دوستوں کے عیب چھپاتے تھے۔فرماتے بھئی اللہ تعالیٰ ستار بھی ہے غفار بھی اور رحیم بھی ہم اُس کے بندے ہیں ہمیں سنت اللہ پر کاربند ہونا چاہیے۔

شاہ جی دعوت و تذکیر کے باب میں متشدد نہ تھے فرماتے جن لوگوں نے قرنِ اول سے لے کر اب تک اسلام قبول کیا وہ محض گفتار سے متاثر نہ ہوئے تھے' اُنھیں داعیوں کے کردار نے متاثر کیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔فرمایا اچھی تعلیم تو ہر مذہب میں مل جاتی ہے اصل مسئلہ اس تعلیم کی اساس اور تربیت پر انسانوں کے معاشرہ کا ہے۔اسلام نے اُونچ نیچ ختم کی' غریبوں کو سرداری بخشی' ہزاروں خداؤں سے نجات دلائی۔ایک خدا کا بندہ بنایا اور خدا بھی ان دیکھا کہ ہماری آنکھیں اس خدا کو دیکھ نہیں سکتی ہیں۔نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ساری خدائی میں اسلام پھیلنے لگا۔یہ

گڈریوں کی جہاں بانی کا اعجاز تھا کہ نصف کائنات مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہو گئی...... لیکن اب مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ سیاسی مسلمان ہو گئے ہیں۔ خود علما کو اپنے فرائض و مناصب کا احساس نہیں رہا۔ غیروں کو مسلمان بناتے بناتے مسلمانوں کا فر بنانے کی تحریکیں چلا دی ہیں۔ ہندوستان میں یہ فصل انگریزوں نے کاشت کی۔ پہلے لوگ اہل اللہ کی نگاہ سے مسلمان ہوتے تھے اب اہلِ علم کی زبان سے کافر ہو رہے ہیں۔ شاہ جی کو ہمیشہ قلق رہا کہ سیاست دانوں نے تبلیغِ اسلام کی رفتار روک دی ہے اب کوئی مسلمان نہیں رہا اور جو مسلمان ہوتا ہے وہ سیاسی طور پر مسلمان ہوتا یا معاشی ضرورت کھینچ لاتی ہے یا پھر عشق و نفس کی مہربانی ہوتی ہے۔

۱۹۳۹ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے بمبئی میں احرار کانفرنس تھی۔ حافظ علی بہادر مرحوم نے بڑے ٹھاٹھ کا انتظام کیا۔ راقم کے چند احباب جو وہاں فلم انڈسٹری میں کام کرتے تھے اور قدرت نے انھیں پنجابی حُسن دے رکھا تھا۔ راقم کو ملنے آئے۔ راقم نے شاہ جی کو بھی ملایا' شاہ جی نے ان سے محفل جمالی اور زمانہ بھر کی باتیں زیر بحث آ گئیں۔ ایک نوجوان نے جو کسی فلم میں سائیڈ ہیرو تھا شاہ جی سے کہا۔

''ہندو مسلم اتحاد نا قابلِ عمل ہے''۔

شاہ جی نے کہا۔

''ہاں بھائی تم بھی ٹھیک کہتے ہو واقعی اتحاد سے بڑھ کر خطرناک چیز کوئی نہیں البتہ پیٹ کے لیے ہو تو خطرناک نہیں آزادی کے لیے ہو تو خطرناک ہے۔ فلمی صنعت میں ہیرو ہندو ہو اور ہیروئن مسلمان' تو وہ اتحاد قابلِ عمل ہے لیکن قومی سیاست میں عطاء اللہ شاہ' جواہر لال سے قدم ملا کے چلے اور مقصود انگریزوں کی غلامی ختم کرنا ہو تو اس سے بڑھ کر بھلا کیا چیز خطرناک ہو سکتی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں انگریزی فوج کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے بیرون ملک شانہ بہ شانہ خون بہایا اور دوسروں کو غلام بنانے کے لیے خون بہایا وہ قابل عمل تھا اور اس سے کوئی خطرہ نہ تھا' لیکن جلیاں والا باغ میں مشترکہ خون واقعی خطرناک تھا''۔

اب شاہ جی اس نوجوان کو چھوڑتے کیوں کر؟ اس کے لیے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اتنے میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وارد ہو گئے۔۔۔۔ کیا کرتے ہو؟ مولانا جلالی طبیعت کے زاہد خشک تھے' شاہ جی جمالی طبیعت کے باغ و بہار انسان۔

شاہ جی ''کیا ارشاد ہے؟''

مولانا نے خُوب صُورت انسانوں کا جم گھٹ دیکھا تو کہا'

''یہ کون لوگ ہیں؟''

شاہ جی ''یہ جبہ و دستار کے دشمن ہیں؟''

مولانا ''تو آپ انھیں کیوں سمیٹ کے بیٹھے ہیں''۔

شاہ جی ''جی نہیں! مَیں ان کے نرغہ میں ہوں''۔

مولانا ''اچھا' چھوڑو! لوگ جلسہ گاہ میں انتظار کر رہے ہیں''۔

شاہ جی ''آپ چلیں ابھی آتا ہوں''۔

مولانا ''میرے ساتھ چلیں''۔

شاہ جی ''آپ پدھاریئے کتھا بکھاریئے تھوڑی دیر میں آتا ہوں''۔

کسی نے مولانا سے کہا یہ نوجوان فلم میں کام کرتے ہیں اور شاہ جی کو ملنے آئے ہیں۔

مولانا' نوجوان سے مخاطب ہو کر!

''آپ لوگ یہاں رہتے ہیں؟''

وہ ''جی ہاں''

مولانا ''کیا شغل ہے؟''

وہ ''ہم فلم میں کام کرتے ہیں''۔

مولانا ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ''

شاہ جی کے ہاتھ مضمون آ گیا' فرمایا۔

''دو چیزوں نے دین کو نقصان پہنچایا ہے۔ پہلی چیز دین سے تعصب دوسری دین میں تشدد۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی چیز سے دین کی دعوت ختم ہوگئی ہے دوسری چیز سے نوجوان باغی ہو رہے ہیں''۔

ایک نوجوان نے شاہ جی سے کہا'

''شاہ جی! مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے لاحول نے ہمیں خوف زدہ کر دیا ہے ورنہ ہم نے آپ کی شخصیت سے جو تاثر اخذ کیا' یہ تھا کہ آپ سے دارورسن نام کی ایک پکچر کا ہیرو بننے کی خواہش کریں۔ کیوں کہ آپ کی صُورت حضرت یسوع مسیح سے ملتی جلتی ہے''۔

شاہ جی کھلکھلا کے ہنس پڑے فرمایا۔

''خوب ہے میاں! خود قد و گیسو میں رہو اور ہمارے لیے وہاں بھی دارورسن؟ اب سمجھ میں آیا کہ غالب کے ہاں ''جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے'' کے معنی کیا تھے؟

اِن نوجوانوں نے کہ شاہ جی کی گُل افشانیوں سے مسحور تھے رخصت ہوتے وقت شاہ جی کا ہاتھ چومنا چاہا تو ہاتھ کھینچ لیا فرمایا۔

دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

اتنے میں مولانا حبیب الرحمٰن کے فرزند مولوی خلیل الرحمٰن آ گئے کہ ابا بلا رہے ہیں۔ مجمع ٹکٹکی باندھے بیٹھا ہے اور آپ کے انتظار میں ہے۔ شاہ جی نے مصافحہ کیا اور خلیل کے ساتھ ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے' ماضی و حال میں اردو زبان کا اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ مسٹر اے ڈی اظہر برطانیہ میں پاکستان کے مالی مشیر تھے۔ ایک دن اُن سے سر ونسٹن چرچل کی خطابت کا ذکر چھڑ گیا۔ اظہر صاحب نے اُس کی خطابت کے متعلق بہت سی چیزیں بیان کیں' کہنے لگے چرچل عموماً لکھی ہوئی تقریر کرتے تھے اور انگریزی میں انھیں ملکہ خاص حاصل تھا۔ لیکن ان کی خطیبانہ شہرت کا سبب انگریزی زبان کا غلبہ

تھا۔ چوں کہ انگریزی اس وقت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے کو غلبہ عام حاصل ہے اس لیے چرچل کا نام ہر جگہ موجود ہے۔ اُردو اس کے برعکس محدود ہے۔ جس برعظیم میں بولی جاتی ہے وہاں بھی ایک زبان نہیں کئی زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ اُردو عالمی زبان ہوتی تو شاہ جی دنیا کے سب سے بڑے اور منفرد ویگانہ خطیب تسلیم کیے جاتے۔ اظہر صاحب نے کہا چرچل بہ لحاظ خطابت شاہ جی کے مقابلہ میں ہیچ تھا۔ الفاظ شاہ جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے کہ وہ انھیں کب استعمال کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہزاروں الفاظ ان کے نطق کی حسرت لیے موجود ہوتے۔ وہ بڑے سے بڑے مجمع کو اکائی میں ڈھال کر شکار کر لیتے۔ ان کے ہاں الفاظ خانہ زاد کی حیثیت سے موجود رہتے اور وہ ان سے موقع ومحل کی مناسبت سے اس طرح کام لیتے کہ بہ قول انیس ؂

دُعا دے مجھے اے زمینِ سخن
کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

ان کی زبان پر چڑھ کر سیکڑوں منسوخ ومتبدّل الفاظ شائستہ وحسین ہو گئے اور سماعت میں جھولنے لگے۔ اکثر پنجابی الفاظ اور پنجابی دوہے جو کھلنڈروں کے مذاق کا حصہ تھے ان کی بدولت بالا ہو گئے اور ان کی زبان پر آ کر ان کا شرف بڑھ گیا۔ علامہ اقبال فرماتے تھے ''شاہ جی اسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں''۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے راقم سے خطابت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ''شاہ جی کا اُردو خطابت میں وہی مقام ہے جو اُردو شاعری میں میر انیس کا درجہ ہے''۔ مولانا محمد علی جوہر نے شاہ جی سے کہا تھا ''آپ لوگوں کو مرغ وبریانی کھلائیں گے تو ہمارا ساگ ستّو کون پوچھے گا''۔ مولانا ظفر علی خاں فرماتے تھے ''اُردو میں شاہ جی سے بڑا خطیب پیدا نہیں ہوا اور آئندہ بھی کئی نسلیں اتنا بڑا خطیب پیدا نہ کر سکیں گی''۔ مولانا شوکت علی کا ارشاد تھا 'شاہ جی بولتے نہیں موتی رولتے ہیں ان کا وجود چشمہ صافی ہے''۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کی وفات پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ سردار نشتر نے راقم سے کہا تھا کہ ''شاہ جی نے خطابت میں انا الحق کی بنیاد رکھی ہے' وہ بیک وقت سرُود ودشمن

اور دار و رسن کے خطیب ہیں"۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا کہ "ان کی باتیں عطا الٰہی ہوتی ہیں۔ علامہ انور شاہ نے کہا "عطاء اللہ عہد نبوت میں ہوتے تو ناقہ رسالت کے حدی خوان ہوتے۔۔۔۔ وہ یگانہ روزگار خطیب ہیں"۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا بیان تھا کہ "اس قسم کے نابغہ لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ وہ روزمرہ کی زبان میں دین کے بڑے بڑے مسئلے حل کر جاتے ہیں"۔ مولانا حسین احمد مدنی نے انھیں اس زمانہ میں اسلام کی زبان قرار دیا اور مولانا احمد علی لاہوری نے فرمایا کہ "شاہ جی اسلام کی شمشیر برہنہ ہیں"۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی رحلت پر کہا تھا "اُردو خطابت کا تاج محل ڈھے گیا ہے" اور سب سے تاریخی جملہ مہاتما گاندھی کا تھا۔ کچھ لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے شاہ جی کا ذکر آ گیا کہنے لگے۔

اب بھی وہ چھے چھے گھنٹے بولتے ہیں؟

جواب دیا۔ جی ہاں ان میں وہی کس بل ہیں۔

مہاتما جی نے کہا۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ دنیا مختصر ہو گئی ہے۔

ہم لوگ مسکرائے، مہاتما جی بولے۔

"شاہ جی آگ ہیں جو دشمنوں کے نشیمن پھونکتی اور دوستوں کے چولھے جلاتی ہے۔ وہ ہوا کو روک کر اس سے روانی اور سمندر کو ٹھہرا کر اس سے طغیانی لیتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے شاہ جی قرآن پڑھتے تو معلوم ہوتا ابھی نازل ہو رہا ہے۔ اور جب بولتے تو ان کی تقریر اس طرح مسجع و مقفع ہوتی کہ اس پر کوئی سی تشبیہ یا استعارہ وارد نہیں ہوتا۔ گمان ہوتا کہ قرن اول کے غزوات نے اپنے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھا دیا ہے۔

شاہ جی کی خاص خوبی یہ تھی کہ وقت کی خصوصیت کو ملحوظ رکھتے اور اس سے بات پیدا کرتے۔ شبِ برات کا دن تھا کسی نے پوچھا شاہ جی خطابت کیا ہے؟

جواب دیا۔ آتش بازی، احباب کھلکھلا کے ہنسنے لگے۔

فرمایا ہنستے کیوں ہو خطابت آتش بازی نہیں تو اور کیا ہے، اس میں پٹاخے، ہوائیاں،

مہتابیاں، انار، پھلجھڑیاں سب شامل ہیں؟ اب جو اس موضوع پر شروع ہوئے تو خطابت پر تقریر ہو گئی۔ تقریر کیا مقالہ تھا۔ خطابت کے نشیب و فراز نہایت شرح و بسط سے بیان کیے۔ فرمایا خطابت اپنا کوئی موضوع نہیں رکھتی لیکن ہر موضوع کے ابلاغ کا نام ہے۔ خطیب وہی کامیاب ہوتا ہے جو عوام کو ان کی سطح سے اُٹھا کر اپنی سطح پر لے آئے۔ خطابت فنونِ لطیفہ کی غیر مرئی آواز کے اجتماعی حسن کا نام ہے۔ چہروں کا حسن آنکھیں چنتی ہیں آواز کا حسن کانوں سے چنا جاتا ہے۔ چہروں کا حسن شخصاً متاثر کرتا اور مضطرب رکھتا ہے آواز کا حسن اجتماعاً مسحور و مستعد کرتا ہے۔

فرمایا۔۔۔۔ تقریر کے لیے اول چیز زبان ہے کہ جس میں کلام کرتے ہو۔ اس پر کتنی قدرت حاصل ہے، رہا لہجہ تو زبان کے لیے سونے پر سہاگا کی طرح ہے۔ روانی تقریر کے لیے صیقل ہے، ذہانت اس تلوار کی کاٹ ہے ظرافت بس اتنی ہو جتنا حسین چہرہ پر تل ہوتا ہے۔ حرکات و سکنات خطیب کی وجاہت کے نشان ہیں ان سے خطابت واضح ہوتی ہے۔

انفرادیت سے متعلق فرمایا۔ وہ خطابت کا طرّہ ہے، قدرت ہر خطیب کو ایک بانکپن بخشتی ہے جو اخلاص و محنت سے پروان چڑھتا ہے۔ باقی موضوع، مضمون، دعوت یا پیام کے بغیر تقریر اس کے سوا کچھ نہیں کہ الفاظ کا نخرہ ہے۔

بعض سوالوں کے جواب میں فرمایا۔

خطابت ابلاغ کی معراج کا نام ہے جس سے دماغوں میں افکار کو راہ ملتی اور دلوں میں تحریک پیدا ہوتی ہے تقریر الفاظ و مطالب کی مینا کاری ہے۔۔۔۔ وعظ عقیدہ کی آبیاری ہے پارلیمانی تقریر افہام و تفہیم کی نمائش ہے۔ مذاکرے یا مباحثے افکار و اذہان کی شطرنج ہیں۔

پبلک سپیکنگ کے متعلق فرمایا۔ کہ شعلہ و شبنم کا آمیختہ ہے اور اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ انسانوں کے سر اکٹھے کر کے ان کے قدم ملا دینا خطابت کا منتہیٰ ہے۔

خطابت کے بارے میں شاہ جی کے یہ خیالات حافظہ کی یادوں سے ماخوذ ہیں۔ انھوں

نے خطابت کی وادی میں چالیس برس سفر کیا اور لاکھوں فقرے زبان و بیان سے نکلتے رہے۔ ان کے شرکائے سفر میں کوئی صاحب قلم ہوتا تو نطشے کی تالیف ''بہ قول زردشت'' کی طرح ایک ایسی کتاب تیار ہو جاتی کہ اردو خطابت صدیوں ناز کرتی۔ افسوس ان کے افکار و کلام کا وہ سرمایہ ہواؤں میں گھل مل گیا۔ نتیجۃً قرطاس و قلم خالی رہ گئے۔۔۔۔ بہر حال اپنی یادداشتوں اور دوستوں کی روایتوں سے چند کلمات نذرِ قارئین ہیں' فرمایا۔

- عمر بھر مسلمانوں کے دروازے پر دستک دیتا رہا' جواب نہ آیا۔ سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی سرشت بوڑھوں کی ہمت' بچوں کی ضد' اور عورتوں کی عقل سے تیار ہوئی ہے۔
- میرے اعضا نے مجھ سے بغاوت کر دی ہے' ہمت نہیں کہ آپ سے خطاب کروں' ساری عمر کی پونجی وہ نوجوان ہیں جو گھر سے اُٹھا کر مجھے یہاں لے آئے۔ حقیقتاً یہاں سزا کے طور پر کھڑا ہوں۔ ان نوجوانوں نے سزا دی ہے اور میں نے وہ سزا قبول کر لی ہے۔
- ہم دونوں بیمار ہیں۔ آپ بھی بیمار ہیں مَیں بھی بیمار ہوں۔ مجھے سچ بولنے کا عارضہ ہے تمھیں سچ نہ سمجھنے کی بیماری ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آیئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو شفا دے ورنہ

جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

- میں بیان کرتا ہوں بیان نہیں دیتا۔ میری ساری زندگی کا خلاصہ یہی ہے' مسلمانوں کی تاریخ کے بالاستیعاب مطالعہ نے مجھے یہ رائے قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے کہ ان کی پوری تاریخ کا لب لباب یہ ہے کہ وہ ڈنڈے والے کے آگے آگے اور پیسے والے کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔
- شاہ جی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا اکثر و بیشتر محسوس ہوتا دل گرفتہ ہیں۔ ایک دن کسی نے کہا شاہ جی اس قوم نے آپ کو کچھ نہیں دیا؟

فرمایا۔ پہلے کسے دیا ہے کہ مجھے دیتی مَیں نے جو کچھ کیا اللہ کے لیے کیا۔ ایک صاحب بولے۔

بہر حال اتنی طویل جدوجہد کا صلہ یہ ہو تو شکستیں دل پر داغ چھوڑ جاتی' ہیں۔ فرمایا۔

''مجھے اپنی قوم سے کوئی اُمید نہ تھی اگر وہ بہتر سُلوک کرتی تو حیرت ہوتی اس قوم نے میرے باپ سے جو کربلا میں کیا اور میرے نانا سے جو مکہ میں کیا وہ گویا میرا ورثہ تھا اس قوم کو وہی کرنا چاہیے تھا جو میرے خاندان سے کر چکی اور میرے اسلاف سے کرتی رہی ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس سے مطمئن ہوں سُلوک مختلف ہوتا تو متعجب ہوتا۔ البتہ اس قوم کے انجام سے متفکر ہوں مبادا یہ قوم...... برِ عظیم سے محو ہو جائے۔

o سلطان ابن سعود نے حجاز میں جلسے کروانا شروع کیے تو برعظیم کے ان علما و مشائخ نے آسمان سر پر اٹھا لیا جن کے پیروؤں نے ان سے تعویذ لے کر زندہ عربوں کو جلایا اور پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر خلافتِ عثمانیہ کو تاراج کیا تھا۔ شاہ جی اور ان کے رفقا ابن سعود کے طرف دار تھے ان کا خیال تھا کہ ابن سعود کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ انگریزوں کی سیاست کاری ہے اور اب وہ لوگ فتنہ اُٹھا رہے ہیں جو پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے ریکروٹنگ ایجنٹ تھے۔

o شاہ جی بھی وہابی ہونے کی زد میں آ گئے۔ ڈیرا غازی خان میں ختمِ نبوّت کے مسئلہ پر تقریر کر رہے تھے کسی نے سوال کیا۔

حضرت قبوں سے متعلق کیا خیال ہے؟

مجمع پیر پرست اور قبر پرست۔ فرمایا'

روضہ تو ایک ہی ہے اور وہ ہے گنبد خضرٰی تلے سونے والے کا' اس کے بعد کوئی دوسرا روضہ شرک فی النبوۃ ہے لوگ تھے کہ واہ واہ کرا ٹھے' سبحان اللہ' جزاک اللہ فی الدارین۔

o عمر بھر قرآن سناتا رہا ہوں' میں نے جس محاذ پر کام کیا قرآن ساتھ رکھا اور کبھی افتراق بین المسلمین کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس سے انسانوں کو لڑایا نہیں' ملایا ہے۔

o اگر دنیا سے قرطاس و قلم ختم ہو جائیں تو بھی یہ کتاب جوں کی توں رہے گی۔ یہ سینوں کی کتاب ہے دنیا میں کسی کتاب کی اشاعت اتنی نہیں ہوئی جتنے قرآن کے حافظ ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں۔

مجھے فکر و نظر کے لیے کسی کتاب کی ضرورت نہیں، میں قرآن پڑھتا ہوں اور قرنِ اول میں گھومتا ہوں جس کتاب سے انسان میں فقر و استغنا اور جہد و غیرت پیدا ہو وہ سب سے بڑی کتاب ہے اور قرآن کے سوا کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے۔

o انبیا نہ آتے تو کائنات ایک ایسی کتاب ہوتی جس کے ابتدائی اور آخری صفحات کھو گئے ہوں۔ یہ چیز انبیا ہی کی معرفت بنی نوع انسان کو ملی ہے کہ انسان اور اس کے رب کے مابین کیا رشتہ ہے۔

o صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، رسالت مآب ﷺ کی دعوت پر قائم شدہ معاشرے کے ابتدائی فرد تھے، انھیں دعوتِ رسول ﷺ ہی نے تیار نہیں کیا تھا بلکہ ان کی تربیت میں نگاہِ رسول ﷺ شامل تھی۔ جو لوگ ان مقدس ہستیوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ رسالت مآب ﷺ کی ناکامی (خاکم بدہن) ثابت کرتے ہیں گویا اللہ کا آخری نبی اپنے رفقا کو بنا سکا اور نہ بچا سکا [illegible] اس طرح وہ لوگ حضور ﷺ کی نبوت پر بالارادہ حملہ آور ہوتے ہیں۔ اگر رسالت مآب اپنے رفقا کے دل میں قرآن نہ اُتار سکے تو پھر کون رہ جاتا ہے جس کے متعلق یہ کہنا ممکن ہے کہ اس کی بدولت فلاں عہد کے انسانوں نے اپنے تئیں اسلام کے سپرد کیا تھا۔

o ایک نے سوال کیا حضرت عائشہؓ اور حضرت خدیجہؓ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا اس قسم کے سوال نہ کیا کرو۔ سوالات میں چور ہو تو دل کافر ہوتا ہے۔۔۔۔ خدیجہؓ محمد بن عبداللہ کی بیوی اور عائشہؓ محمد رسول اللہ کی زوجہ تھیں۔ اُمہات المومنینؓ سے متعلق دل کا چور نکال دو۔ حضور ﷺ عائشہؓ ہی کے حجرہ میں آرام فرما رہے ہیں حضور ﷺ پیار سے انھیں حمیرا کہہ کر پکارتے تھے اور عائشہؓ ہی کے لیے جبرائیل ﷺ نے قرآن کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر صفائی دی ہے۔

o جو لوگ اس سے پریشان ہوتے ہیں کہ حضرت علیؓ خلفائے راشدین میں آخری خلیفہ کیوں تھے؟ تو گویا ان کے نزدیک آخری ہونا بمنزلہ اہانت ہے، انھیں معلوم ہے کہ رسول اکرم ﷺ آخری نبی تھے۔

o کسی قصبہ میں تقریر کرنے جا رہے تھے' دیکھا تکیہ میں کچھ لوگ چرس پی رہے ہیں اور چلم کا کش لگا کے یا علی مدد کا نعرہ لگاتے ہیں۔ رُک گئے انھیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا کیوں میاں! حضرت علیؓ چرس پیا کرتے تھے؟ چرس پی کر میرے باپ کا نام کیوں لیتے ہو اپنے باپ کا نام لو۔

o کسی نے سوال کیا۔

شاہ جی! علیؓ اور عمرؓ میں کیا فرق ہے؟

فرمایا۔ بڑا فرق ہے علی حضور ﷺ کے مُرید تھے۔ عمرؓ مراد۔۔۔۔ اور سب خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے لیکن عمرؓ کو اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا۔

o سوال کیا۔

حضرت فاطمہؓ اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کی دوسری بہنوں رقیہ' اُم کلثوم اور زینب میں کیا فرق ہے؟

فرمایا۔ فاطمہ نبوّت کے بعد کی صاحب زادی اور باقی نبوت سے پہلے کی صاحب زادیاں ہیں۔

شاہ جی اُردو' عربی' فارسی' پنجابی اور ہندی اشعار کا مخزن تھے۔ اُردو بولتے تو اہلِ زبان منہ میں گھنگنیاں ڈال لیتے' پنجابی میں کلام کرتے تو معلوم ہوتا اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ پنجاب کے ہر ضلع کی بولی ٹھولی میں اُتا رُو تھے۔ بالخصوص ملتان اور بہاول پور کی زبانوں میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ بابا فرید کا کلام اور مولانا روم کی مثنوی حفظ تھے۔ کہانیاں' لطیفے' تمثیلیں' ضرب الامثال اور برجستہ گوئیاں ان کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھیں۔ پنجابی کے دوہے ان کی معرفت عقد ثریا تک چلے جاتے۔

ایک صاحب نے سوال کیا۔

شاہ جی جناح سے آپ کا اختلاف کیا ہے؟

فرمایا۔

کوئی نہیں۔

وہ۔تو پھر ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔

شاہ جی۔ بھائی' میں تو ان کی کفش برداری کو تیار ہوں لیکن میرے ذہن میں بعض کانٹے ہیں وہ یاد فرمائیں سر کے بل جاؤں گا۔سمجھا دیا تو وہ آرام سے بیٹھیں ان کی لڑائی خود لڑوں گا۔لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرتے صرف بیعت چاہتے ہیں۔

مجمع دیہاتی تھا قائداعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

میری گھگھری نوں گھنگرو لوا دے

جے توں میری ٹور ویکھنی!

اور شرح یہ کی "پاکستان کا اور چھور بتا دو عوام کے ہر محاذ پر جاؤں گا اور لڑوں گا۔

ایک ٹھیٹھ پنجابی گاؤں میں معراج النبی ﷺ پر تقریر کر رہے تھے' فرمایا۔

حضور ﷺ معراج کو چلے تو کائنات رُک گئی۔

سوچا کہ دیہاتی سمجھ نہیں سکے کہ کائنات رُک گئی کے معنی کیا ہیں' پوچھا۔

کچھ سمجھے؟ مجمع نے کہا............جی نہیں۔

بہت سمجھایا لیکن اُردو اور پنجابی کے متبادل فقروں سے بات نہ بن سکی۔۔۔۔کروٹ لی "کہ سوہنا اپنے عاشق ول چلیا تے زمین و آسمان ٹھہر گئے"۔۔۔۔کیوں؟ آواز کا رس گھلاتے ہوئے بہ لحن۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا

تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

مجمع پھڑک اٹھا۔آوازیں آئیں شاہ جی سمجھ گئے۔اور یہ تھا خطابت کا اعجاز۔

O

جن دنوں وزارتی مشن دہلی پہنچا شاہ جی اور احرار کی عاملہ کے ارکان دہلی میں تھے اور

اس وقت تک دہلی ہی میں رہے جب تک مشن انگلستان لوٹ نہیں گیا۔

دو اڑھائی مہینے کی ان صحبتوں میں شاہ جی کا بالراست مطالعہ کیا تو ان کی طبیعت کے مختلف پہلو اپنی خصوصیتوں سمیت ظاہر ہو گئے تمام دن لوگ چلے آتے مختلف موضوعات پر گفت گو ہوتی، جو موضوع چھڑتا گھنٹوں چلتا۔ بظاہر وہ کتاب کے آدمی نہیں تھے شاذ و نادر کوئی سی کتاب دیکھ لی، فبہا نہیں تو جدید ادب سے قطعاً نابلد تھے۔ ایک دن نئے شاعروں اور نئے ادیبوں کے انتخاب کا ذکر ہونے لگا پہلے تو غور سے سنتے رہے پھر اس ادب کا تجزیہ شروع کیا تو حیرت ہوئی کہ معلومات حیرت انگیز ہیں۔ فرمایا۔

"نیا ادب جدت نہیں، بدعت ہے اس میں زیادہ تر کھلنڈرا پن ہے، ہر عہد کے بیان کا ایک اُسلوب ہوتا ہے ہمارے نئے لکھاری اُسلوب بدل ڈالتے تو عیب نہ تھا عصری روح کا اقتضا ہوتا لیکن انھوں نے مطالب بھی بدل ڈالے اور ان کی جگہ جو نئے مطالب لائے وہ محض تقلید، اخذ اور توارد ہیں اور تقلید بھی یورپ کے اس ہیجانی ادب کی جو مغرب میں معاشرہ و اخلاق اور دین و مذہب سے بغاوت کے نام پر جنا گیا ہے۔ اس قسم کا ادب کبھی مستقل نہیں ہوتا۔ یہ محض نعرہ بازی ہے جو ایک قوم، ایک عہد چھوڑتے وقت دوسرے کی عہد کی راہوں میں اختیار کرتی ہے۔ یہ انقلاب نہیں نراج ہے...... غم و غصہ کی یادگار ہمارے شاعر و ادیب نہیں جانتے کہ تقلید ارتقا کی دشمن ہے، اس سے جمود پیدا ہوتا اور انقلاب ٹھہر جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ادب کی پرانی قدروں سے بغاوت کے شوق میں ادب کے مسلمات بھی ترک کر دیئے ہیں۔ ہر قوم کی ایک زبان ہوتی، اس کا مزاج اور اس مزاج کے رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں، ہمارے ان ادیبوں اور شاعروں نے ان پر بھی ہتھوڑا چلایا ہے یہ چیز عُمدہ ہے کہ نئے ادب سے زنجیروں کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے لیکن حیرت ہے کہ ان ادیبوں کے ہاں ابلاغ کی روح نہیں۔ جو ادب عوام کے لیے نہ ہو وہ ادب نہیں پہیلی ہے، تعجب ہے کہ ادب میں عوام کی زبان کے استعمال پر زور دینے والے عوام کی زبان سے نابلد ہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ جس قوم سے مخاطب ہیں اسے کس لہجے سے پکارنا چاہیے اور اظہار

کا وہ کون سا پیرایہ ہے جو ان کی زبان کا لازمہ ہے اور جس سے عوام حرکت میں آتے ہیں۔ نیا ادب عوام سے مُغایَرت کی بنیاد پر ہے اس کے پروڈیوسر مارکیٹ میں نہ تو اس کی ضرورت کا احساس کرا سکے ہیں اور نہ اس کی مانگ پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک خاص مزاج کے چند سو لوگ ادب میں عریانی کی تحریک لے کر لکد کوبی کر رہے ہیں۔ جدید ادب...... بالفاظ دیگر اُردو میں ہپی ازم ہے' یہ لوگ بازارِ حُسن کے تاجر ہیں ان کے ہاں آگ اور لہو کی سفارت نہیں' تجارت ہوتی ہے۔ یہ سرور نہیں نشہ بیچتے ہیں۔۔۔۔ گھٹیا نشہ جس سے نئی پود ادب کی آڑ میں گناہ کا جواز لاتی ہے۔

شاہ جی نے اس ادب کے نوادرات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔ مثلاً یہی نظم ہے۔

چھن...... چھن...... چھن

چھنا چھن' چھنا چھن...... چھننن

چھن...... چھن...... چھن

چھنا چھن' چھنا چھن.......... چھننن

فرمایا میں نے اس کے ناظم سے پوچھا...... اس شہ پارہ کا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگے۔

یہ صوتی تصویر ہے ایک محبوبہ آشنا سے ملنے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو اس کی رفتار چوری چھپے کی ہوتی ہے' چھن...... چھن...... چھن۔ پھر دائیں بائیں کے خطرات سے اپنے تئیں محفوظ پا کر آشنا کے مکان میں جھٹ سے داخل ہو جاتی ہے...... چھننن۔ لوٹتے وقت اسی طرح چوری چھپے نکلتی اور اپنے گھر میں چھننن سے داخل ہو جاتی ہے...... چھن چھنن اس کے پازیب کی آواز ہے۔

فرمایا' اول تو یہ صوتی تصویر شاعری نہیں' کچھ اور ہے۔ خیال کی بدکرداری ہے اور اگر شاعری یہی ہے تو میں بوڑھا ہو کر بھی دن بھر میں کئی دیوان مرتب کر سکتا ہوں۔ جہاں تک اختصار کا تعلق ہے اس سے بھی مختصر یعنی دو حصوں میں پوری کہانی کہی جا سکتی ہے۔

مثلاً:۔

وصل کی شب' اور ان کا کہنا

جاؤ بھی' ہم نہیں منتے

عوام سمجھ لیتے اور بات ادھوری نہیں رہتی' دو مصرعوں میں پوری کہانی لپٹی ہوئی ہے۔

ان دنوں شاہ جی کی بدولت مہاتما گاندھی' پنڈت جواہر لال نہرو' مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے مشاہیر سے ملنے کا مفصل موقع ملا۔ ان سے یہ پہلی ملاقاتیں نہ تھیں لیکن شاہ جی سے ان کے تعلقات کا اندازہ ہو گیا۔ ان نجی محفلوں سے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو اکثر و بیش عوام میں نہیں آتی ہیں۔

مہاتما گاندھی نے عزیز الرحمٰن کی معرفت انھیں یاد کیا اور وہ تاریخ مقررہ پر ان کے ہاں آدھ گھنٹا رہے' شاہ جی سے بڑھ کر وقت کا دشمن کوئی نہ تھا وہ اس باب میں کسی پابندی کو ملحوظ نہ رکھتے۔ گاندھی جی کے ہاں پہنچے تو ٹھیک وقت پر لیکن وہاں ملکی مسائل کے بجائے سورۂ اخلاص کی تفسیر لے بیٹھے۔ گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں علاوہ اپنی دعاؤں کے سورۂ اخلاص اور سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔ شاہ جی نے کہا ان سورتوں کے معنی میں آپ کس کے ترجمہ پر انحصار کرتے ہیں؟ گاندھی جی نے کہا...... دونوں سورتوں کے معنی بیان کرتے وقت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ترجمہ ملحوظ رکھتا ہوں...... فرمایا شاہ عبدالقادر کا ترجمہ دیکھا ہے کہنے لگے ہاں' فرمایا...... انھوں نے سورۂ فاتحہ کا جو لفظی ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ سہل ہے۔ غرض اس بیان و کلام میں انتیس منٹ نکل گئے' ایک منٹ باقی تھا ہم چاہتے تھے کہ شاہ جی گاندھی جی سے پیش آمدہ مسائل سے متعلق معلوم کریں کہ وزارتی مشن سے گفتگو کس مرحلے میں داخل ہوئی ہے لیکن وہ ترجمہ کی بحث کو چھیڑ کے بیٹھ گئے۔

عزیز الرحمٰن نے کہا۔ شاہ جی وقت ہو گیا ہے۔

شاہ جی نے فرمایا...... چھوڑو میرے اور مہاتما جی کے درمیان کوئی وقت نہیں۔ پورے تیس منٹ ہو گئے تو شاہ جی کا فقرہ ابھی ادھورا ہی تھا کہ مہاتما جی مسکراتے ہوئے اُٹھ گئے۔ اچھا شاہ جی۔ پرارتھنا کا وقت ہو گیا ہے میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گاندھی جی

موٹر پر سوار ہو کر لیلا گراؤنڈ چلے گئے جہاں وہ ہر روز ۵ بجے شام پرارتھنا کرتے اور بعض ملکی مسائل پر ہلکے پھلکے اشارے کرتے تھے۔

میر احمد حسین شملوی شاہ جی کے میزبان تھے۔ ان کی ایک دکان کناٹ پیلس میں تھی' پنڈت جواہر لال نہرو شاہ جی سے ملنے وہاں آئے۔ اس ملاقات میں شاہ جی کے ہم راہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی' ماسٹر تاج الدین انصاری' شیخ حسام الدین اور راقم الحروف بھی تھے۔ پنڈت جی نے مختلف سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جو کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ ہم نے غلطیاں کی ہیں اور ان کا نام تجربے رکھ لیا ہے۔

۲۔ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے لیکن جس طرح ہم چاہتے تھے اس طرح نہیں اس آزادی کی صورت بالکل دوسری ہو گی۔

۳۔ مسٹر جناح دُھن کے پکے ہیں وہ تقسیم سے کم پر راضی ہوتے نظر نہیں آتے۔ ملک تقسیم ہو گیا تو برعظیم ہندو مسلم مسئلہ سے نکل کے پاکستان و ہندوستان کے ٹکراؤ کا شکار ہو گا۔ نہ جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟

۴۔ ہم سے مسٹر جناح کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں ابتداءً غلطیاں ہوئی ہیں۔ کانگرس ان کی شخصیت کو شروع میں نظر انداز نہ کرتی تو آج حالات و مسائل مختلف ہوتے۔

۵۔ کانگرس نے پنجاب' سندھ اور بنگال میں مسلمانوں کو ناراضی کا موقع دے کر موجودہ صورت حال کو جنم دیا اور وہ (مسلمان) اپنے مسائل کے لیے ہندوؤں کے اکثریتی صوبوں کی (مسلمان) لیڈر شپ کے دست نگر ہو گئے۔

۶۔ عجب بات ہے جن لوگوں کے پاس مسلمانوں کا دین ہے وہ ان کی سیاست سے متروک ہو گئے ہیں اور جن کے پاس سیاست ہے وہ مذہب کا نام لے کر ان کا استحصال کر رہے ہیں۔

۷۔ لیگ نے اُردو کو بڑا نقصان پہنچایا ہے ہندوستان تقسیم ہو گیا تو اُردو یتیم ہو گی عجب نہیں پاکستان بھی اسے کو صحیح مقام دینے سے قاصر رہے کیوں کہ نفرت پہلے قومی پھر علاقائی ہو جاتی ہے۔

افسوس کہ جناح کے بعد مسلمانوں کے پاس اتنا بڑا لیڈر نہیں ہے۔

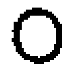
۸۔ برعظیم تقسیم ہو گیا تو اس کی صحیح شکل ہندوستان اور پاکستان کی فیصلہ کن لڑائی کے بعد اُبھرے گی۔

۹۔ سکندر حیات نے مجھے خط لکھا تھا اور وہ خط میرے پاس محفوظ ہے کہ پاکستان صرف قرارداد ہے۔ ہمارا مقصد ملک کی تقسیم نہیں لیکن اب تو ملک تقسیم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

۱۰۔ مَیں آوارہ گرد ہوں لوگ بھی آوارہ گرد ہوتے ہیں اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

۱۱۔ ہم نے آزادی کی لڑائی میں عمریں گنوادی ہیں لیکن نتائج ہمارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

۱۲۔ کانگرس میں عوام پر میرا اثر وسیع ہے لیکن کانگرس کی تنظیم میں میرا اثر محدود ہے۔ وہاں سردار پٹیل جوڑ توڑ کرتے ہیں۔



مولانا آزادؒ نے تین بجے دن کا وقت دیا۔ شاہ جی بہ اصرار ساڑھے تین بجے قیام گاہ سے چلے۔ وہاں پہنچے تو چار بج رہے تھے۔ مولانا اپنی موٹر کی خرابی کے باعث پریشان تھے ہمیں دیکھتے ہی شیخ صاحب سے کہا۔

میرے بھائی! آپ کی موٹر لیے جاتا ہوں تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھیں۔

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کہا۔

حضرت میرے کاندھے حاضر ہیں۔

مولانا نے فرمایا۔

میرے بھائی وہ بوجھ تو آپ اُٹھائے ہوئے ہیں۔

مولانا پون گھنٹا بعد وائسریگل سے لوٹ آئے فرمایا۔

''گفتگو شملہ منتقل ہو گئی ہے''۔

شاہ جی نے عرض کیا۔

''غبارِ خاطر آ گئی ہے''۔

فرمایا۔

ہاں بھائی، دس نسخے آئے ہیں ایک کاپی جواہر لال کو بھجوا دی ہے۔ ملازم کو آواز دی دو نسخے منگوائے۔ ایک نسخہ شاہ جی کو دیا دوسرا راقم کو عطا فرمایا۔ پھر ایک اور نسخہ منگوایا، شیخ حسام الدین کو دیا پھر گلفشانی گفتار سے نوازنا شروع کیا۔ راقم کی ڈائری سے چند تلخیصات نذر قارئین ہیں۔

۱۔ میں نے ملک کے مسائل پر وزارتی مشن کو ایک حل تجویز کیا ہے۔ کرپس صاد کر چکے ہیں اور پیتھک لارنس بھی کہ رہا تھا کہ ملک کی دونوں پارٹیاں تسلیم کر لیں تو یہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلے کا بہترین حل ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ مسٹر جناح تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟[1]

ہم میں سے کسی نے پوچھا وہ سکیم آپ نے کانگرس کی طرف سے پیش کی ہے یا آپ کی طرف سے ہے۔ فرمایا اسکیم تو میری ہے لیکن کانگرس معترض نہ ہو گی۔ ہو سکتا ہے ایک ذہن مخالف ہو اس کے پیش نظر مدت سے تقسیم ملک پر اصرار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہمیشہ کے لیے ہندو مُسلم قضیہ ختم ہو جائے گا لیکن تقسیم صرف ہندوستان کی نہ ہو گی پاکستان بھی تقسیم ہو گا۔ اور اگر یہ دونوں ملک تقسیم ہو کر آزاد ہوئے تو ان میں شانہ بشانہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جنگ کی سی حالت رہے گی تا آنکہ کوئی اور شکل نمودار ہو۔

۲۔ انگریز فی الواقع ہندوستان چھوڑ رہا ہے اب نہ اس کے اقتدار کا ہندوستانی نقشہ بحال رہا ہے اور نہ بین الاقوامی حالات اس کے موافق ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو وہ ہندوستان میں ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں۔

۳۔ مسلمانوں نے میرے سیاسی موقف کو مسترد کر دیا مسٹر جناح نے مسلمانوں کی عصبیت

[1] مولانا کا اشارہ وزارتی مشن کی ابتدائی سکیم کی طرف تھا۔

کو اتنا مضبوط کیا ہے کہ اب وہ اس کے خلاف کوئی سی رائے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں مسلمان اپنی انفرادیت کو مشخص کر لیں اور جو کچھ بھی ہو وہ انگریزوں کی معرفت نہ ہو، ہندوؤں کو بہ دلیل راضی کر کے ہو، گاندھی و نہرو غیر مخلص نہیں اگر برعظیم کی آزادی نفرت کی موجودہ لہروں سے نکلی تو اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوں گے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ ہندوستان کا مسلمان اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ پھر پاکستان کی داخلی حالت انھیں کو بچا نہ سکے گی۔ مجھے تقسیم کی صورت میں دور تک کش مکش نظر آتی ہے۔ اندرونِ پاکستان بھی اور پاکستان سے باہر بھی۔

۴۔ راقم نے عرض کیا موجودہ ادب سے متعلق آپ کا ارشاد کیا ہے؟ فرمایا تحریک ادبی ہو یا سیاسی سفر میں اسی قسم کے موڑ آتے ہیں۔ جب ملک میں چاروں طرف افراتفری چھا گئی ہو تو ادب جو معاشرہ کا عکس ہوتا ہے اس سے مختلف نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ ادب دائمی نہیں اس ادب کا مزاج سیاسی ہے اس کے لہجہ میں جھنجھلاہٹ ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے جب یہ دور لد جائے گا تو ادب کی چمن بندی میں خار و خس نہیں رہیں گے۔

۵۔ شاہ جی کے سوال پر فرمایا ''ترجمان القرآن'' کی تیسری جلد ذہناً تیار کر چکا ہوں۔ بعض حصے قلم بند کیے ہیں۔ ان دنوں سیاسی اشغال ایسے ہیں کہ دین و ادب کا سفر کا پڑا ہے۔ اس جھنجھٹ سے نکلتے ہی سفر شروع ہو گا اور ترجمان القرآن کی تیسری جلد میں تاخیر نہ ہو گی۔

ایک روز مفتی کفایت اللہ کے ہاں چلے گئے اور دیر تک ماضی مرحوم کے واقعات دُہراتے رہے۔ مفتی صاحب نے کہا۔

''شاہ جی، تقسیم کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ہم لوگ کب تک نظریاتی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ ہندو نہ تو نیشلسٹ مسلمانوں کی مانتے ہیں اور نہ پاکستان تسلیم کرتے ہیں تو کیا وہ مسلمانوں سے خود سپردگی چاہتے ہیں؟

مولانا احمد سعید دہلوی سے ملے تو تحریک خلافت میں میاں والی جیل کے ایام اسیری کا ذکر آ گیا۔ دونوں کی زبان کترنی کی طرح چلتی رہی اور دامن گفتار میں اس قسم کے موتی ٹانکتے

رہے کہ بولی ٹھولی کا مزہ آ گیا۔

ہم نے کہا آیئے شاہ جی خواجہ حسن نظامی سے ملیں؟

فرمایا' بھئی وہ دُکان دار ہیں میں ان کی متاع کا خریدار نہیں۔

عرض کیا' اُردو کے منفرد ادیب ہیں' فرمایا میں انھیں ادیب نہیں مانتا وہ اُردو میں کنکوے لڑاتے ہیں اور بس۔

ہم خود ہی چلے گئے اس وقت سماع کی محفل لگی ہوئی تھی اور خواجہ صاحب سرور میں تھے' قوال گا رہے تھے۔

خسرو تو بس بلندی شدی در طریق عشق
یعنی بپائے بوس شگانش رسید؟

وزارتی مشن کی رخصتی سے لے کر ماؤنٹ بیٹن پلان تک کا سارا عرصہ شاہ جی نے اپنے عیال سمیت لاہور میں گزارا۔ ان محفلوں کا مجمل تذکرہ ابتدائی باب میں آ چکا ہے۔

ہم شاہ جی کی باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھتے لیکن ان کی تمام باتیں سچی ہوتی گئیں۔ فرمایا۔

۱۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے' ماں بیٹی' باپ بیٹا اور بہن بھائی کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ دریاؤں میں خون ہے' ہواؤں میں دھواں' دھرتی تو تا چشم ہوگئی ہے اور وہی ہو کے رہا۔

۲۔ سیاست دانوں نے جغرافیائی نقشہ اُٹھا کر اس پر ضرب و تقسیم کی ہے لیکن اس کی بدولت بڑی مدت کے لیے انسان مر گیا ہے۔

۳۔ بر عظیم میں تبلیغ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ ہم نے سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر دینی فرائض سے بغاوت کرادی ہے۔

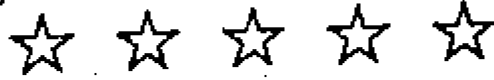
۴۔ پاکستان سیاسی یزیدوں کی آماج گاہ بن کے رہے گا۔

۵۔ احقر کے ایک اداریہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تم نے ٹھیک لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور پاکستان میں اسلام نہیں رہے گا' لیکن اسلام نہ رہا تو پاکستان کہاں ہوگا؟

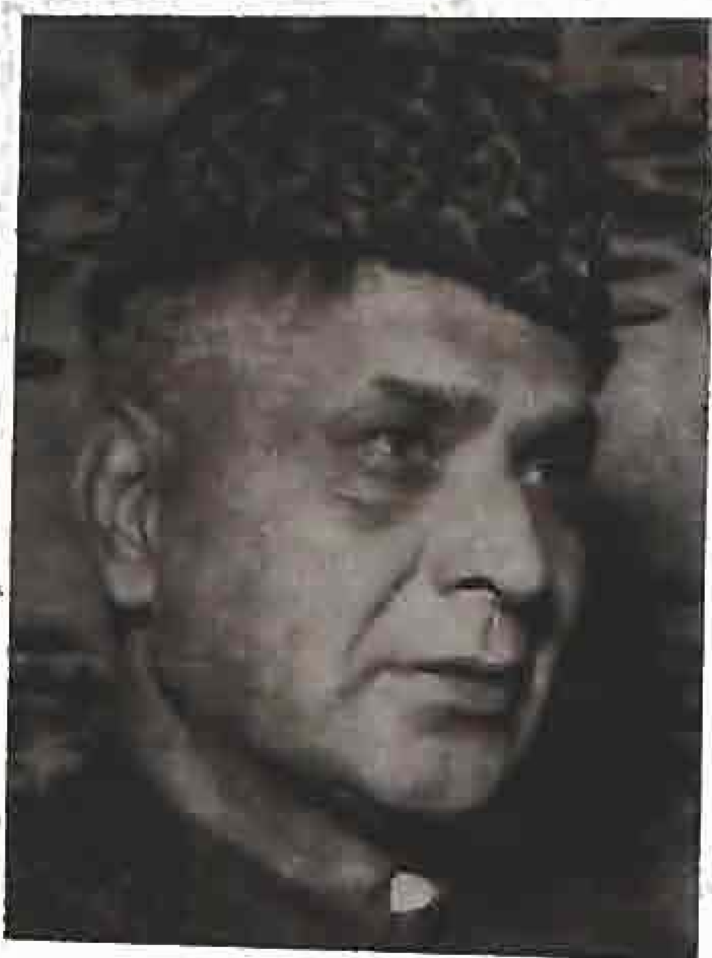
مسٹر پر بودھ چندر ۱۹۶۰ء میں دہلی سے لاہور آئے تو شاہ جی سے ملنے ملتان گئے۔ شاہ جی سے کہا۔

''پنڈت جی سلام کہتے تھے اور ہاں اندرا نے بھی سلام کہا ہے''۔ شاہ جی غوطہ کھا گئے۔ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر فرمایا۔

بھائی! پنڈت جی سے کہنا جس عطاء اللہ شاہ کو آپ جانتے تھے وہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو مر گیا تھا۔ البتہ اندرا کو سلام و دعا کہنا کہ وہ بیٹی ہے۔



قبر سا واعظ، تنہائی سا بے ضرر اور کتاب سا مخلص دوست کوئی نہیں



آغا شورش کاشمیریؒ
کی کتابیں
تاریخ کی آواز ہیں!

- شب جائے کہ من بودم
- بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
- پسِ دیوارِ زنداں
- فنِ خطابت
- تحریکِ ختمِ نبوت
- سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
- موت سے واپسی
- تمغۂ خدمت
- اُس بازار میں
- ابوالکلام آزادؒ

زیرِ طبع کتب

- اقبالی مجرم
- اقبال اور قادیانیت
- ظفر علی خان
- میاں افتخار الدین
- نورتن
- حمید نظامی
- فیضانِ اقبالؒ
- مجموعہ ہائے کلام (گفتنی ناگفتنی، چہ قلندرانہ گفتم، الجہاد والجہاد)

مکتبہ چٹان 88 میکلوڈ روڈ • لاہور

تقسیم کنندگان: **الفیصل** ناشران و تاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور